انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام
۱۔ کے۔ ۳۔ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱۔ کراچی ۱۸
۷۴۶۰۰

مفکر اسلام مولانا سیّد ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے و جانشین
دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم اور مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ انڈیا کے
صدر حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کی کتابوں کے سلسلے میں تازہ تحریر



المجمع الاسلامي العلمي

Academy of Islamic Research & Publications

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام

Nadwatul Ulama, P.O. Box 119, Lucknow-226007 U.P. (INDIA)
Ph. : 0522-2741539, Fax : 0522-2740806

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

Ref.........................

Date. 6-7-2009

جناب مولانا فضل ربی ندوی صاحب
بانی و مالک مجلس نشریات اسلام کراچی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ (Academy of Islamic Research & Publication) کے نمائندہ کے طور پر مجلس تحقیقات کی کتابوں کو مجلس کی اجازت سے پاکستان میں مجلس نشریات اسلام کراچی کے نام سے شائع کرتے رہے ہیں، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ کے ذمہ دار وہاں آپ کو اپنا نمائندہ سمجھتے ہیں اور مجلس کی کتابوں کی اشاعت کا حق صرف آپ کو ہے۔ پاکستان میں کوئی دوسرا ادارہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے ذمہ داروں کی اجازت کے بغیر مجلس کی کتابوں کو شائع کرتا ہے تو آپ کو پورا حق حاصل ہے کہ اس کو روکیں اور ضرورت پڑنے پر ہماری یہ تحریر اس کو دکھائیں۔

سکریٹری
مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ
(سید محمد واضح رشید حسنی ندوی)

صدر
مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ
(سید محمد رابع حسنی ندوی)



انسانی دنیا پر
مسلمانوں کے عروج و زوال
کا اثر

مفکر اسلام مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہ

مجلس نشریات اسلام
۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱۔ کراچی نمبر ۱۸

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

- ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ • رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
- صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ • رکن مجلس انتظامی ومجلس علمی دارالمصنفین اعظم گڑھ
- رکن عربی اکادمی دمشق • رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
- رکن مجلس تاسیس رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ • رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
- سابق وزیٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی ومدینہ یونیورسٹی

نام کتاب	انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر
تصنیف	مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
طباعت	احمد برادرز، ناظم آباد، کراچی
ضخامت	۴۰۰ صفحات

ٹیلیفون : 6601817

ناشر
فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی ۷۴۶۰۰

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے
عروج وزوال کا اثر

۱۔عربی	(کویت)	چودھواں ایڈیشن
۲۔انگریزی	(لکھنؤ)	چھٹا "
۳۔اردو	(لکھنؤ)	گیارہواں "
۴۔فارسی	(ایران)	دوسرا "
۵۔ترکی	(انقرہ)	دوسرا "

۶۔فرنچ اور جنوبی ایشیاء کی بعض دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔

فہرست مضامین

"انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر"

باب دوم ۲
بعثتِ محمدی کے بعد ۸۵ - ۱۳۱



دیباچہ طبع یازدہم

الحمدللہ کہ کتاب" انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" کے گیارہویں بار شائع ہونے کی نوبت آئی، علاوہ متعدد بار شائع ہونے کے اس کو اہلِ علم اور مصنفین کے حلقہ میں جو قبولیت اور وقعت حاصل ہوئی ناچیز مصنف کو اس کا پہلے سے کوئی اندازہ نہ تھا۔[1]

کتاب کا انگریزی ترجمہ (ISLAM & THE WORLD) (اسلام اینڈ دی ورلڈ) کے نام سے کئی سال پہلے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے، اس سلسلہ میں قارئین کو یہ معلوم کر کے دلچسپی اور خوشی ہوگی کہ جب اس کتاب کو اس ادارہ نے اپنے علمی مشیروں اور ماہرینِ فن کے سامنے اظہارِ رائے کے لئے پیش کیا تو ڈاکٹر بکھنگم (لندن یونیورسٹی میں ادارۂ مشرقِ وسطیٰ" (MIDDLE-EAST SECTION) کے چیرمین نے ان الفاظ میں اس پر تبصرہ کیا کہ کتاب کو

---

[1] اصل کتاب عربی میں لکھی گئی تھی، وہ عرب دنیا میں جتنی مقبول ہوئی، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے چودہ قانونی ایڈیشن نکل چکے ہیں، غیر قانونی ایڈیشن جو مصنف کی اجازت اور علم کے بغیر شائع ہوئے وہ بیس سے زیادہ ہوں گے، بعض (قانونی) ایڈیشن ایک لاکھ کی تعداد میں شائع ہوئے اور جلد نکل گئے۔

برطانیہ سے شائع ہونا چاہئے، کیونکہ اس صدی میں مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کی جو کوشش بہتر سے بہتر طریقہ پر ہوئی ہے اس کا یہ نمونہ اور تاریخی دستاویز ہے" ادارہ نے اس کو ایک دوسرے صاحبِ نظر اور ماہرِ اسلامیات نامور مستشرق پروفیسر مونٹگمری واٹ صدر شعبۂ اسلامیات ایڈنبرا یونیورسٹی کے حوالہ کیا کہ وہ اپنی فیصلہ کن رائے دیں، انھوں نے اس کتاب کو اشاعت کا مستحق قرار دیا اور اس کی طباعت کی تائید کی۔

ایران کے ایک سنجیدہ اور باوقار اسلامی ادارہ "جلسات علمی اسلام شناسی" (قم) نے اس کا فارسی ترجمہ "با ضعف مسلمین دنیا در خطر سقوط" کے نام سے شائع کیا ہے، معلوم ہوا ہے کہ وہ ایران میں شوق اور دلچسپی سے پڑھا جا رہا ہے، ترکی میں وہ کئی بار شائع ہوئی، اور ذوق و شوق سے پڑھی گئی، فرنچ میں بھی اس کے ترجمہ کی اجازت مانگی گئی اور مصنّف کی طرف سے اجازت دی گئی، جنوبی ایشیا کی بھی مختلف زبانوں میں کتاب کا ترجمہ ہوا۔

کتاب کی کمیابی کی وجہ سے کتاب کی جو طلب و خواہش پیدا ہو گئی تھی امید ہے کہ اس جدید اشاعت سے اس کی تکمیل ہوگی۔

ابوالحسن علی ندوی

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام

ندوۃ العلماء لکھنؤ

۷ محرم الحرام ۱۴۱۳ھ

۹ جولائی ۱۹۹۲ء

کچھ کتاب کے متعلق

الحمد للہ رب العالمین، وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین.

پیش نظر کتاب کا ابتدائی تخیل ایک مضمون سے زیادہ نہ تھا، ابتدا میں خیال تھا کہ اجمالی طور پر ان نقصانات کی نشان دہی کی جائے جو مسلمانوں کے تنزل وزوال اور دنیا کی قیادت ورہنمائی سے کنارہ کش ہو جانے سے انسانیت کو پہونچے اور دکھایا جائے کہ زندگی کے نقشہ میں ان کی جگہ اور قوموں کی صف میں ان کا مقام کیا ہے؟ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مسلمانوں کو اس مجرمانہ کوتاہی کا احساس ہو جو انھوں نے انسانیت کے حق میں کی اور اس کی تلافی اور اصلاحِ حال کا جذبہ ان کے اندر پیدا ہو، اسی کے ساتھ دنیا کو اپنی اس بدقسمتی کا بھی علم ہو جس سے اس کو مسلمانوں کی قیادت سے محروم ہو جانے کی بنا پر دوچار ہونا پڑا، اس کو محسوس ہو کہ حالات میں کوئی بڑی تبدیلی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ دنیا کی قیادت مادّہ پرست اور ناخداترس انسانوں کے ہاتھ سے نکل کر ان خداشناس اور خداترس انسانوں کے ہاتھ میں نہ پہونچ جائے جو پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں اور انھیں کی ہدایات اور تعلیمات سے روشنی اور رہنمائی حاصل کرتے ہیں، اور ان کے پاس آخری پیغمبر کی شریعت اور دین و دنیا کی رہنمائی کا مکمّل دستور موجود ہے۔

اس مقصد کے لئے عام انسانی تاریخ، نیز اسلامی تاریخ کا اجمالی جائزہ لیا گیا اور دکھایا گیا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کس جاہلی ماحول میں ہوئی، انسانیت کس پستی کو پہونچ چکی تھی، آپ کی دعوت اور تربیت نے کس طرح کی امت تیار کی اُس امت کے عقائد و اخلاق اور سیرت و تربیت کیا تھی، اس نے کس طرح دنیا کی زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لی اس اقتدار اور امامت کا دنیا کی تہذیب اور زندگی اور لوگوں کے رجحانات اور کردار پر کیا اثر پڑا، کس طرح دنیا کا رخ ہمہ گیر خدا فراموشی اور مجموعی جاہلیت سے ہمہ گیر خدا پرستی اور اسلام کی طرف تبدیل ہوا، پھر کس طرح اس امت میں انحطاط اور زوال کا آغاز ہوا اور اس کو دنیا کی امامت اور قیادت سے علیحدہ ہونا پڑا، اور کس طرح یہ قیادت کمزور و غافل خداشناسوں کے ہاتھ سے نکل کر طاقتور ناخداشناس اور مادہ پرست یورپ کی طرف منتقل ہوئی، خود یورپ میں اس مادہ پرستی اور مذہب بیزاری کا کس طرح ظہور اور ارتقا ہوا، مغربی تہذیب کا اصلی مزاج کیا ہے اور اس کا خمیر کن عناصر و اجزا سے تیار ہوا ہے، یورپ کے اقتدار اور اس کی قیادت نے دنیا پر کیا اثر ڈالا اور زندگی کو کس طرح متاثر کیا، دنیا کا رخ کیا ہے اور مسلمانوں کی کیا ذمہ داری ہے اور وہ اس ذمہ داری سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

تحریر کے دوران ہی میں مصنّف کو محسوس ہو گیا کہ یہ مضمون ایک مقالہ کا نہیں بلکہ مبسوط کتاب کا ہے، اور اس کتاب کی تالیف وقت کی ایک اہم ضرورت ہے، خود مسلمانوں کا ذہن اس بارہ میں صاف نہیں ہے، وہ اپنا زندگی سے کوئی تعلق اور ربط محسوس نہیں کرتے اور اس دنیا کی اپنے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں سمجھتے، بہت سے لوگ ایسے ہیں جو مسلمانوں کے زوال کو ایک قومی حادثہ اور مقامی واقعہ سمجھتے ہیں، اور ان کو مطلقاً اس کا احساس نہیں کہ یہ کتنا بڑا عالمگیر سانحہ اور انسانیت کی کیسی بڑی بدقسمتی تھی، واقعہ یہ ہے کہ اس حقیقت کو نظرانداز

کرکے ہم نہ اسلامی تاریخ کو سمجھ سکتے ہیں، نہ انسانی تاریخ کو، نہ اس دور کی صحیح تشخیص کرسکتے ہیں، جو ابھی دنیا میں قائم ہے، نہ اس عالمگیر انقلاب کے صحیح اسباب متعین کرسکتے ہیں جو دنیا کی تاریخ میں رونما ہوا، اور وہ اسلامی انقلاب کے بعد سب سے بڑا انقلاب ہے، فرق یہ ہے کہ پہلا انقلاب شر سے خیر کی طرف تھا، یہ خیر سے شر کی طرف ہے، پہلا انقلاب بعثتِ محمدی اور دعوتِ اسلامی کے عروج کا نتیجہ تھا، دوسرا انقلاب امتِ محمدی کے انحطاط اور دعوتِ اسلامی سے تغافل کا نتیجہ ہے مسلمانوں میں خود اعتمادی کی روح اسلام کی طرف بازگشت کا جذبہ اور جوشِ عمل پیدا کرنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ ان کو اپنا مقام یاد دلایا جائے اور بتلایا جائے کہ وہ دنیا کی تعمیر و تشکیل کے اہم اور مقدس کام میں ایک موثر و فعال عنصر (FACTOR) ہیں، کسی چلتی ہوئی مشین کا پرزہ اور کسی اسٹیج کے بازی گر اور نقال (ACTOR) نہیں ہیں۔

جس ملک و ماحول سے مصنف کا تعلق تھا، اور جہاں اس کتاب کی تصنیف کا خیال پیدا ہوا تھا، اس کا اقتضا تھا کہ یہ کتاب اس ملک کی زبان (اردو) میں تصنیف کی جائے لیکن ایک خاص خیال کے ماتحت اس کتاب کی تصنیف کے لئے اردو کے مقابلہ میں عربی کو ترجیح دی گئی۔

عربی زبان کی ترجیح و انتخاب کا محرک و باعث یہ احساس تھا کہ عرب ممالک اس احساس کمتری اور مرضِ خود فراموشی کا سب سے زیادہ شکار رہیں، دنیا نے اگرچہ انھیں سے نئی زندگی اور نیا ایمان پایا ہے، لیکن آج انھیں کی فضا سب سے زیادہ خاموش اور انھیں کا سمندر سب سے زیادہ پرسکون ہے، اقبال نے آج سے چند برس پہلے ان ملکوں کو دیکھ کر بیجا نہیں کہا تھا کہ ؎

سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے | دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب
وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی | اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

یورپ کے قرب مخصوص سیاسی حالات، اور ان دیوانوں کی کمی سے جو خوش قسمتی سے ہندوستان کی

سرزمین میں برابر پیدا ہوتے رہے اور عرب کی مقدس سرزمین عرصہ سے ان کے وجود سے محروم تھی عرب کو یورپ کی شیشہ گری اور فرزانگی کا آسانی سے شکار بن جانے دیا، شیخ حسن البنا مرحوم اور ان کی تحریک اور جماعت الاخوان المسلمون سے پہلے پورے مشرق اوسط میں کوئی طاقتور اسلامی تحریک اور جدوجہد نہیں تھی، اور کہیں بے چینی اور اولوالعزمی کے آثار نظر نہیں آتے تھے، لوگوں نے یا تو زمانہ سے صلح کرلی تھی یا مایوس ہو کر بیٹھ گئے تھے، یا بہاؤ پر اپنی کشتی ڈال دی تھی، ان ممالک کے حالات پر نظر رکھنے والا اور ان کے ماضی و حال کا موازنہ کرنے والا بڑے درد و حسرت سے کہہ رہا تھا ؎

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں — گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اس تکلیف دہ احساس نے قلم کا رُخ اردو سے عربی کی طرف موڑ دیا، عرب اپنی تاریخ اور اپنے جغرافیے کے اعتبار سے اس کے اہل ہیں کہ بین الاقوامی سیادت سنبھالیں اور پوری متمدن دنیا پر اثر ڈالیں ان کے ممالک بحر احمر اور بحر متوسط کے کنارے واقع ہیں، وہ مغرب اور مشرق بعید کے درمیان میں ہیں نئے عالمگیر انقلاب اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے عرب ممالک اور مشرق اوسط سے زیادہ موزوں سرزمین کوئی اور نہیں ہو سکتی، یہ اسباب و محرکات تھے جن کی بنا پر ہندی نژاد مصنف نے عربی زبان کو اس اہم موضوع کے لئے انتخاب کیا اور یہ کتاب سب سے پہلے عربی میں لکھی گئی جس کا نام "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" تھا۔

اسی عرصہ میں (۱۳۶۶ھ میں) حجاز کا پہلا سفر پیش آیا وہاں پہلی بار مصنف کتاب کو اس ملک اور اہل ملک کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جن کے لئے یہ کتاب تصنیف کی گئی تھی حجاز کے قیام اور عالم عربی کے لوگوں سے تعارف نے اس خیال کو اور تقویت پہونچائی اور اس کتاب کے جلد سے جلد شائع ہونے کی ضرورت کا احساس بشدت پیدا ہوا مکہ معظمہ کے دوران قیام میں مصنف کو محسوس ہوا کہ کتاب کا پہلا باب بہت تشنہ ہے ضرورت ہے کہ جاہلیت کے خد و خال کو پوری وضاحت سے پیش کیا جائے، اور پوری تفصیل سے دکھایا جائے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت

دنیا کی حالت کیا تھی، اور وہ کیا دینی و اخلاقی، اجتماعی، سیاسی و معاشی ماحول تھا جس میں اسلام کی دعوت نمودار ہوئی، اسلامی انقلاب کی عظمت اور اس کا محیر العقول کارنامہ اس وقت تک ذہن میں نہیں آسکتا جب تک کہ جاہلیت کا پورا ماحول اور اس کا نقشہ سامنے نہ ہو اس لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ جاہلیت کا پورا مرقع پیش کیا جائے اس موقع پر یہ معلوم ہے کہ جاہلیت کے متعلق بہت کم مواد یکجا ملتا ہے کچھ منتشر معلومات ہیں جو ہزاروں صفحات اور بیسیوں کتابوں میں متفرق ہیں، اس کو جمع کرنا اور ان منتشر و متفرق اجزاء سے جاہلیت کا پورا مرقع تیار کرنا جس سے اس دور کی پوری زندگی سامنے آجائے سیرت نبوی کی بہت بڑی خدمت ہے مکہ معظمہ میں مصنف کو قدیم و جدید عربی مطبوعات کا ایسا ذخیرہ ملا جس سے اس مرقع کی تیاری میں بڑی مدد ملی، ہندوستان میں بھی مطالعہ و تحقیق کا سلسلہ جاری رہا[1] اور یہ باب تکمیل کو پہونچ کر کتاب میں شامل ہوا اور اس سے کتاب میں معتدبہ اضافہ ہوا۔

اسی کے ساتھ اس کا بھی خیال پیدا ہوا کہ بعثت محمدی کے اثرات اور دعوت اسلام کے امتیازات و خصوصیات کو بھی تفصیل سے بیان کیا جائے اس دعوت کا مزاج اور اس کا طریق کار کیا ہے انبیاء علیہم السلام اپنے زمانہ کی بگڑی ہوئی دنیا کی کس طرح اصلاح کرتے ہیں، ان کی دعوت اور جدوجہد کا انداز دوسرے مصلحین و قائدین سے کس قدر مختلف ہے، ان کی دعوت کا رد عمل اور استقبال کس طرح ہوتا ہے، جاہلیت کس طرح ان کے مقابلے میں آتی ہے اور کیا حربے استعمال کرتی ہے، وہ کس طرح اپنے متبعین کی تربیت کرتے ہیں، پھر ان کی دعوت کس طرح فتح حاصل کرتی ہے اور کس طرح کے اثرات و نتائج ظہور میں آتے ہیں، یہ کتاب کا ایک ضروری باب ہے، جس کے بغیر یہ کتاب نامکمل رہتی۔

مصنف کو اس کا انتظار اور اہتمام تھا کہ یہ کتاب مصر میں کسی وقیع ادارہ کی طرف سے

---

[1] مکہ معظمہ میں حاجی عبدالوہاب صاحب دہلوی کا قیمتی کتب خانہ اور ہندوستان میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا منتخب ذخیرۂ کتب اس باب کی ترتیب میں مصنف کے لئے بہت مددگار ثابت ہوا۔

شائع ہو اور اس کا شایانِ شان تعارف ہو تاکہ اس سے وہ مقصد حاصل ہو جو مصنف کے پیش نظر تھا عرصہ کے انتظار کے بعد کتاب کی اشاعت کے لئے "لجنة التاليف والترجمة والنشر" کو انتخاب کیا گیا جو مصر کا ایک سنجیدہ اور باوقار تصنیفی ادارہ اور دار الاشاعت ہے، اور جو اپنی بلند پایہ علمی مطبوعات و تالیفات کی وجہ سے پورے مشرقِ اوسط میں شہرت اور وقعت حاصل کر چکا ہے کتاب پر مقدمہ لکھنے کے لئے اسی ادارہ کے صدر ڈاکٹر احمد امین (سابق پرنسپل کلیۃ الاداب جامعۂ مصریہ) کو زحمت دی گئی جو اپنی مشہور تالیفات "فجر الاسلام" "ضحی الاسلام" کی بنا پر عالمگیر شہرت حاصل کر چکے ہیں، مصنفِ کتاب پر ان کی سلامتِ فکر، دقّتِ نظر اور اصابتِ رائے کا اچھا اثر تھا، کتاب کا مسودہ ان کی خدمت میں بھیجا گیا اور ان سے مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی گئی، انھوں نے کمیٹی سے اس کتاب کی اشاعت کی پُر زور سفارش کی اور مصنف سے مقدمہ لکھنے کا وعدہ کیا، کتاب کی اشاعت کے بعد معلوم ہوا کہ مصنف نے "مقدمہ نگار" کے انتخاب میں غلطی کی، کسی کتاب پر مقدمہ لکھنے کے لئے مقدمہ نگار کا سلیم الفکر دقیق النظر اور وسیع المطالعہ ہونا کافی نہیں، اس کی بھی ضرورت ہے کہ مقدمہ نگار کو کتاب کے موضوع سے ہمدردی اور اس کے نتائجِ بحث سے اتفاق ہو اور وہ مصنف کے مقصد کا پُر جوش داعی اور وکیل ہو، اس پر پورا الیقین رکھتا ہو اور اس کی کامیابی کا دل سے متمنی ہو، مقدمہ نگار میں اس خصوصیت کی کمی تھی وہ محض مصنف و مفکر اور ایک کامیاب مؤرخ ہیں، اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور اس کی عالمی قیادت کی طرف سے وہ کچھ زیادہ پُر امید نہیں، وہ اس کو بھی ایک علمی اور تاریخی مسئلہ کی طرح سوچ سکتے ہیں مگر اس کے لئے اپنے دل میں کوئی خاص جذبہ اور ولولہ نہیں رکھتے اس طرح ان کو دراصل کتاب کی اصل روح سے کوئی خاص مناسبت نہیں تھی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا مقدمہ روح اور تاثیر سے خالی اور ایک ضابطہ کی خانہ پُری سے زیادہ نہ تھا، مصر و شام و فلسطین و حجاز میں ہر جگہ یہ محسوس کیا گیا کہ مقدمہ نے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کرنے کے بجائے اس کی روح کو نقصان پہونچایا ہے اور کتاب کو ہلکا کر دیا ہے لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا

اور مصنف کو اپنی غلطی کا احساس تھا، بایں ہمہ کتاب کا "لجنة التاليف والترجمة والنشر" کی طرف سے شائع ہو جانا کتاب کے لئے مفید ہوا، کتاب ان حلقوں میں بھی پہونچ گئی جہاں خالص دینی کتابیں اور اسلامی دعوت کے سلسلہ کی چیزیں آسانی سے بار نہیں پاتیں، ۱۹۵۱ء میں جب مصنفِ کتاب کو شرق اوسط کی سیاحت کا موقع ملا تو اس کو یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ کتاب بڑے شوق سے پڑھی گئی تھی، اور بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال ہوا تھا، کتاب کی اشاعت کے دو تین مہینے کے اندر اندر وہ تمام عرب ملکوں میں پہونچ گئی تھی، اسلامی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی تھی اور اسلامی فکر کے حلقوں نے بطورِ خود اس کی اشاعت اور تبلیغ کی تھی، مصر میں اخوان کے ذمہ داروں نے اس کو اپنی تعلیمی و تربیتی سلسلہ میں شامل کیا تھا، اور مطالعہ و تربیت کے حلقوں سے لے کر جبل خانوں تک اس کی اشاعت کی تھی، عدالت کی بحثوں اور پارلیمنٹ کی تقریروں تک میں اس سے استفادہ و اقتباس کیا گیا تھا، جدید و قدیم دونوں حلقوں نے اس کی پذیرائی کی، جہاں یہ بات مصنف کے لئے سرمایۂ سعادت اور موجبِ شکر ہے، وہاں یہ عربوں کی فراخدلی، عالی حوصلگی اور حق پرستی کا بیّن ثبوت ہے، کتاب کی جو پذیرائی اور اس کے گمنام اور بعید الوطن مصنف کی جو حوصلہ افزائی ان عرب ملکوں میں ہوئی اس کی توقع اپنے ملک میں بھی نہیں کی جا سکتی۔

مصر کے دوران قیام ہی میں کتاب کی دوسری اشاعت کی نوبت آگئی، اس موقع پر مصنف کے مخلص دوست اور کتاب کے خاص قدرداں ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ مرحوم (سابق استاذ جامع ازہر و پروفیسر اسلامی قانون قاہرہ یونیورسٹی) نے اپنی کمیٹی "جماعة الأزهر للنشر والتاليف" کی طرف سے طبعِ ثانی کی پیش کش کی، اور مصنف کے ایما سے ڈاکٹر احمد امین سے اس کی اجازت حاصل کر لی، اس موقع پر سابق غلطی کی تلافی کا امکان پیدا ہوا، اب اس کا موقع تھا کہ مقدمہ کے لئے ایسے موزوں شخص کا انتخاب کیا جائے جو کتاب کے مقصد اور روح پر پورا الیقین رکھتا ہو اور اس کا پُرجوش وکیل اور داعی ہو، اس مقصد کے لئے موزوں ترین شخصیت سید قطب کی ہو سکتی تھی، سید قطب مصر جدید میں اسلامی فکر اور اسلامی دعوت کے سب سے بڑے

علمبردار ہیں، ان کا قلم ادھر چند برسوں سے نوجوانوں میں اسلامی روح اور خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے وقف ہے ان کی ذات میں وسیع النظر عالموں کا مطالعہ جدید ادیبوں کا زورِ قلم اور اُسلوب، داعی کا جذبہ اور اخلاص اور نو مسلموں کا جوش جمع ہے، وہ اپنے حالات کے لحاظ سے مسلمان خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود نو مسلم ہی ہیں، تعلیم و تربیت اور ماحول نے ان کو اسلام سے بہت دور اور بیگانہ کر دیا تھا، قرآن مجید کے مطالعہ اور تفکر اور مغربی تہذیب کی ناکامی اور افلاس نے ان کو پھر اسلام کی طرف واپس کیا اور وہ نئے جوش و خروش اور اعتماد و یقین کے ساتھ اسلام کی طرف آئے، وہ دار العلوم مصر کے فاضل ہیں، ان کی ادبی زندگی تنقیدِ ادب سے شروع ہوئی جس میں انھوں نے بہت جلد اپنا مقام پیدا کر لیا "النقد الادبی" اور "التصویر الفنی فی القرآن" اور "مشاھد القیامۃ فی القرآن" اس زمانہ کی یادگار اور ادبی حلقوں کی مقبول اور کامیاب کتابیں ہیں، عرصہ تک محکمۂ تعلیم سے متعلق رہے، اسی سلسلہ میں بعض تعلیمی نظریات کے مطالعہ کے لئے ان کو امریکہ میں کچھ عرصہ قیام کرنا پڑا، وہاں مغربی زندگی کے تاریک پہلو کھلے طریقہ پر ان کی نظر کے سامنے آئے اور مغربی تہذیب اور فلسفۂ زندگی کی ناکامی کو انھوں نے بچشمِ خود دیکھ لیا، اس سے ان کے ایمان و یقین اور اسلام کے تعلق میں بڑا اضافہ ہوا اور اسلامی دعوت کا نیا جوش پیدا ہوا، امریکہ سے آنے کے بعد وہ اسلام کے ایک پُرجوش داعی اور مغربی تہذیب کے بصیر ناقد بن گئے اور ہمہ تن جدید اسلامی ادب کی ترتیب میں منہمک ہو گئے، ان کے فکر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اسلام کو ایک ابدی اور عالمگیر پیغام مانتے ہیں جس کے بغیر دنیا کی نجات اور سلامتی نہیں، ان کے اُسلوب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معذرت اور مدافعت کے قائل نہیں، وہ مغربی تہذیب کی بنیادوں پر تیشہ چلاتے ہیں اور اپنے حریف پر بڑھ کر حملہ کرتے ہیں، ان کو اسلام میں کوئی کمزوری اور کمی محسوس نہیں ہوتی اور وہ اس کو ایک مکمل اور جامع دستورِ حیات کی طرح پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ پیش کرتے ہیں، اس لئے ان کی تحریریں پڑھنے والوں میں اعتماد و یقین کی ایک نئی روح اور مغربی نظامِ فکر کی حقارت پیدا کر دیتی ہیں، اور نوجوان ان کی تصنیفات و مقالات سے

بہت متاثر ہوتے ہیں ان کی کتاب "العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام" (اگرچہ مصنف کو اس کے بعض مقامات سے اختلاف ہے) اس طرز فکر اور اس طرز تحریر کا کامیاب نمونہ ہے اور جدید اسلامی ادب میں خاص مقام رکھتی ہے۔

سید قطب نے کتاب کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق سے کیا تھا، اور ان کی ہفتہ وار مجلس مذاکرہ میں اس کتاب کی تلخیص اور اس پر بحث و مباحثہ بھی ہوا تھا، جس میں مصنف کو بھی حصہ لینے کا اتفاق ہوا تھا، مقدمہ کی فرمائش کو انھوں نے بہ مسرت قبول کیا اور ایسا مقدمہ لکھا جس میں کتاب کی پوری روح کھینچ لی، یہ مقدمہ جو اب کتاب کی زینت ہے کتاب میں ایک مستقل باب کا اضافہ کرتا ہے، اور اس کا ایک اچھا خلاصہ ہے، سید قطب کے فاضلانہ مقدمہ کے علاوہ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ مرحوم نے بھی از راہ کرم ایک مقدمہ یا پیش لفظ تحریر فرمایا جس میں کتاب کے متعلق اپنے قلبی تأثرات اور علمی خیالات کا اظہار کیا، علاوہ بریں مصنف کے بے تکلف دوست ڈاکٹر شیخ احمد الشرباصی (استاذ جامع ازہر) نے مصنف کی لاعلمی میں اپنے مخصوص انداز میں صاحب کتاب کا تعارف کرایا اور اس کے مختصر حالات زندگی لکھے، ان دونوں مقدموں کے ترجمہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

سنہ ۴۵ء میں یہ خیال کر کے کہ اصل عربی کتاب کی اشاعت میں معلوم نہیں کتنی تاخیر ہو خود مصنف نے اس کو اردو میں منتقل کر دیا تھا، یہ ترجمہ "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا" کے نام سے شائع بھی ہو گیا، اس کتاب کی کتابت و طباعت اور کاغذ موضوع کی اہمیت اور کتاب کی حیثیت کے شایان شان نہ تھا، اس میں ابتدائی دونوں باب "بعثت محمدی سے پہلے" اور "بعثت محمدی کے بعد" (جو سنہ ۴۷ء کے بعد اضافہ کئے گئے تھے) اور متعدد اہم اضافے جو عربی اصل کی اشاعت کے وقت تک ہوتے رہے موجود نہیں تھے اب جب کہ کتاب کے مصر میں دو ایڈیشن نکل چکے ہیں، اور تیسرے کی تیاری ہے اور کتاب اپنے مضامین اور اضافات کی بنا پر دو چند ہو چکی ہے، اردو میں اس کی از سر نو اشاعت کا خیال پیدا ہوا، ان نئے ابواب اور اضافوں کے ترجمے کی فرصت مصنف کتاب کو ملنی بہت مشکل تھی اس لئے یہ خدمت اس نے اپنے عزیز رفیقوں کے سپرد کی، خدا کا شکر ہے کہ انھوں نے بڑی خوبی سے یہ خدمت

انجام دی اس خدمت میں سب سے بڑا حصہ مولوی عبداللہ صاحب پھلواروی ندوی استاذ ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء[1] اور ان کے بعد مولوی محمد رابع ندوی استاذ ادب دارالعلوم کا ہے کچھ مضامین اور حصے برادرزادہ عزیز محمد حسنی سلمہ[2] کے قلم سے ہیں، مصنف ان تینوں عزیزوں کا شکر گذار اور دعاگو ہے کہ ان کی محنت سے یہ کتاب اشاعت کے قابل ہوئی اور اب اردو میں "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" کے نام سے شائع ہو رہی ہے۔

مصنف اس کتاب میں کسی انکشاف، خاص تحقیق اور اجتہاد کا مدعی نہیں، نہ اپنے بارہ میں کسی غلط فہمی میں مبتلا ہے، کتاب ایک دیانتدارانہ تاریخی جائزہ ہے، اور ایک قدرتی سوال کا معقول اور علمی جواب ہے، ممکن ہے یہ سوال بہت سے دماغوں میں آیا ہو، اور مختلف طریقوں پر اس کا جواب دیا گیا ہو، مصنف کا کام یہ ہے کہ اس نے اس سوال کو ابھار دیا ہے، اور اس کو ایک مستقل موضوع بنا کر اس پر تاریخی مواد جمع کر دیا ہے، اگر اس سے کسی ضمیر میں نیا شعور اور کسی دل میں نئی خلش پیدا ہو جاتی ہے تو مصنف اپنے مقصد میں کامیاب ہے، ہر صالح انقلاب اور نئی تعمیر کے لئے ضمیر کی بیداری اور ذہن کی تیاری ضروری ہے اس کے لئے تاریخ کی بامقصد ترتیب اور ایسی کتابوں اور مباحث کی ضرورت ہے جو ایک طرف علمی اطمینان اور قلبی انشراح پیدا کریں، دوسری طرف پڑھنے والوں میں نیا حوصلہ، نیا یقین اور جوشِ عمل پیدا کر دیں، مبالغہ اور تواضع دونوں سے الگ ہو کر یہ کہنے کی جرأت کی جاتی ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے اس سلسلہ کی ایک مفید اور اہم کڑی بن سکتی ہے، اور اس سے اسلامی فکر اور اسلامی دعوت کے تمام حلقے بلا اختلاف فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ "وما توفيقي إلا بالله عليه توكلت وإليه أنيب"۔

۱۵ ربیع الثانی ۱۳۷۳ھ — ابوالحسن علی

---

[1] حال ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی سابق پروفیسر جامعہ ام القریٰ، مکہ مکرمہ۔

[2] افسوس ہے کہ ۱۳ جون ۱۹۷۹ء کو عین جوانی میں ان کا انتقال ہو گیا رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

مقدمہ

مصر کے نامور اہل قلم سیّد قطب کے قلم سے

عصر حاضر کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کی جائے ان میں ماضی پر اعتماد مستقبل کے بارہ میں امید اور حوصلہ پیدا ہو اس دین پر ان کا ایمان و یقین تازہ اور زندہ ہو جائے جس کا نام تو وہ لیتے ہیں لیکن اس کی حقیقت سے نا آشنا ہیں، ان کا تعلق اس دین سے زیادہ تر نسلی اور موروثی ہے اور انھوں نے اس کو بہت کم سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

اس موضوع پر تمام قدیم و جدید لٹریچر میں چند بہترین کتابیں جو میری نظر سے گزری ہیں، ان میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی جدید تصنیف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" (مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا؟) خاص مقام رکھتی ہے۔

اسلام کی تعلیم سروری و جہانبانی کی تعلیم ہے اس کی ایک اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ دین اپنے ماننے والوں میں بغیر کسی شائبہ تکبّر کے خودداری بغیر کسی فریب نفس کے اعتماد و یقین، اور بغیر دوسرے پر اعتماد، در صنعت کے یقین و توکل کی روح پھونکتا ہے یہ عقیدہ انھیں متنبہ کرتا ہے کہ ان کے کاندھوں پر پوری انسانیت کی ذمہ داری ہے روئے زمین پر بسنے والی انسانی جماعت کی تولیت (TRUSTEESHIP) ان کے سپرد ہے اور ان کا فرض منصبی ہے کہ وہ بھٹکے ہوئے انسانی گلہ کی پاسبانی کریں اور انسانوں کو دین محکم اور صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کا فرض

انجام دیں، اور اس روشنی اور ہدایت کے ذریعہ جو ان کو خدا کی طرف سے عطا ہوئی ہے، تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں :۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	تم لوگ بہترین جماعت ہو جو لوگوں کے لئے
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ	پیدا کی گئی ہے تم بھلائی کا حکم دیتے ہو
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ط	اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان
(سورۂ آل عمران ـ ۱۱۰)	رکھتے ہو۔
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا	اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک معتدل امت
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ	بنا دیا ہے تاکہ تم گواہ رہو لوگوں پر اور
الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط (سورۂ بقرہ ۱۴۳)	رسول گواہ رہیں تم پر۔

پیش نظر کتاب اپنے ناظرین کے دل میں انھیں تمام احساسات کو ابھارتی ہے، اور ان تمام حقائق کو دل میں اتارتی چلی جاتی ہے لیکن کتاب کا اسلوب یہ نہیں ہے کہ صرف جذبات ابھار دے یا عصبیت کا جوش پیدا کر دے، اس میں اپنے دعوی کے ثبوت میں ٹھوس علمی حقائق سے کام لیا گیا ہے جو بیک وقت وجدان و شعور اور فکر و نظر دونوں کو اپیل کرتے ہیں، تاریخی واقعات اور اس عصر کے ماحول و متعلقات ایسے منصفانہ طریقہ پر پیش کئے گئے ہیں، جس میں مصنف کی روشن دماغی صاف جھلکتی ہے، پھر فیصلہ واقعیت و صداقت اور قلب و ضمیر کی بصیرت کے سپرد کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے کتاب کے مباحث کی تمام کڑیاں مربوط اور ایک دوسرے سے پیوست نظر آتی ہیں، اور کہیں بھی کسی مسئلہ میں مقدمات سے نتائج اخذ کرنے میں غیر واقفیت یا تکلف کا ثبوت نہیں ملتا، یہ اس کتاب کی اوّلین خصوصیت ہے۔

اسلام سے پہلے اس دنیا کا کیا حال تھا، مشرق و مغرب، شمال و جنوب کا کیا نقشہ تھا،

چین وعرب اور ہند سے لے کر روم و فارس تک معاصر دنیا کا عقلی وفکری مزاج کیا تھا، اس وقت کی سوسائٹی کا کیا رنگ تھا؟ جن مذاہب پر دینِ سماوی کا پرتو تھا مثلاً یہودیت و نصرانیت، یا جو بت پرست مذاہب تھے مثلاً ہندومت، آتش پرستی ان کا کیا حال تھا؟ ان تمام باتوں کی اِس کتاب میں مختصر لیکن بہت جامع اور واضح تصویر کشی کی گئی ہے، اور یہیں سے کتاب شروع ہوتی ہے۔

درحقیقت یہ بہت ہی جامع مرقع ہے جو خطۂ ارضی کے صحیح خدوخال نمایاں کرتا ہے، اس مرقع کی ترتیب میں مؤلف نے کسی خود رائی اور ضد کا مظاہرہ نہیں کیا ہے بلکہ وہ اپنے جلو میں غیر مسلم قدیم وجدید مصنفین کو بھی لئے ہوئے ہیں، جو قدرتاً اسلام کے معاند اور اس عہد کو بدنما کر کے پیش کرنے والے ہیں، جو اسلام کی طرف منسوب ہے، مؤلف اس دنیا کی تصویر پیش کرتے ہیں جس پر جاہلی روح مسلط تھی، اور اس وقت کا انسانی ضمیر گندہ اور روح متعفن ہو چکی تھی، معیار اور قدریں بگڑ چکی تھیں غلامی اور ظلم کا دور دورہ تھا، اور انسانیت کی جڑ ایک طرف مجرمانہ عشرت پسندی اور دوسری طرف نامرادی و محرومی کے ہاتھوں کھوکھلی ہو رہی تھی، مزید برآں کفر و جہالت اور ظلمت و ضلالت کے بادل سر پر منڈلا رہے تھے، مذاہب لاچار و بے بس تھے ادیانِ سماوی پہلے ہی سے تحریف کا شکار ہو چکے تھے، اور ان کو گھن لگ چکا تھا، دلوں سے ان کی عظمت نکل چکی تھی، یہ مذاہب (خصوصاً نصرانیت) مذہب کے ڈھانچے رہ گئے تھے، جن میں نہ کوئی روح تھی، نہ کوئی زندگی صرف چند بے جان، بے روح مراسم کا نام مذہب رہ گیا تھا۔

زمانۂ جاہلیت کے اس نقشہ کو پیش کرنے کے بعد مؤلف نے دکھایا ہے کہ تعمیرِ انسانیت کے سلسلہ میں اسلام نے کیا کارنامہ انجام دیا اور جب اس کو کچھ کرنے کا موقع ملا تو کس طرح انسانی روح کو اوہام و خرافات سے نجات دلائی، ذلّت و غلامی سے کس طرح انسانیت کی گلو خلاصی کرائی، مرض و فساد ناپاکیوں اور گندگیوں، کمزوریوں اور ناتوانیوں سے کس طرح انسان کو نکالا، اور اپنے وقت میں اسلام نے کس طرح انسانی معاشرے کو ظلم و سرکشی اور انسانی تہذیب کو انتشار اور تباہی سے بچایا،

سماجی طبقہ واریت سے سلاطین کے جور وستم سے اور مذہبی طبقہ (PRIEST HOOD) اور مہنتوں کی غلامی سے آزاد کیا، اسلام نے نئی بنیادوں پر دنیا کی تعمیر کی عقیدۂ اخلاق وضمیر کو طہارت و پاکیزگی عطا کی، تعمیر و ایجاد کی بلند قدریں بخشیں، حریت پسندی اور اختراعی صلاحیتیں پیدا کیں، یقین و معرفت وثوق واعتماد، عدل وانصاف اور خودداری عطا کی، اور دنیا کے صحیح نشوونما اور متوازن ارتقا کے لئے عمل پیہم اور سعی مسلسل پر آمادہ کیا کہ زندگی کی پوشیدہ طاقتیں بروئے کار آئیں اور پھولیں پھلیں، صحیح مردم شناسی سے کام لے کر دنیا کی تعمیر و ترقی کے کام میں ہر ایک کو اس کے صحیح مقام پر رکھا اور اس سے وہ کام لیا جس کے لئے وہ بنایا گیا تھا۔

یہ سب اس وقت کی بات ہے، جب کہ عالم کی زمام کار اسلام کے ہاتھوں میں تھی، اس کو اپنی مرضی کے مطابق اور اپنے ڈھنگ سے کام کرنے کا موقع حاصل تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے جوہر اسی وقت کھلتے ہیں جب اس کے ہاتھ میں قیادت ہو، اس لئے کہ اسلام کا عقیدہ سروری وجہانبانی کا عقیدہ ہے، وہ قیادت کا ایک نظام ہے، وہ انسانی قافلے کی سربراہی کر سکتا ہے کسی کا دریوزہ گر نہیں بن سکتا۔

اس کے بعد وہ وقفہ آتا ہے، جب زمام قیادت اسلام کے ہاتھوں سے نکل گئی جس کا سبب یہ تھا کہ خود مسلمانوں میں زوال آگیا اور وہ اس عالمی قیادت سے دستبردار ہو گئے جس کی ذمہ داری ان پر اسلام کی طرف سے عائد ہوتی تھی، اور انسانیت کی تولیت (TRUSTEESHIP) اور ان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے جو زندگی کے ہر موڑ پر ان کی ذات سے وابستہ تھیں۔

اس جگہ مؤلف نے اس روحانی و مادی زوال کے اسباب بیان کئے ہیں، اور ان نقصانات کو واضح کیا ہے، جو خود مسلمانوں کو اٹھانے پڑے جب کہ وہ اپنے دین کے اصول سے منحرف ہو گئے اور اس کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہونے لگے، پھر اس مبارک قیادت سے

محروم ہونے اور پہلی جاہلیت کی زندگی اختیار کر لینے کے بعد دنیا پر کیا گزری؟ یہاں مؤلف نے اس ہولناک پستی کی نشاندہی کی ہے جس کے مہیب غار میں انسانیت اپنے سر کے بل گری۔ بدقسمتی سے اس پستی کا زمانہ وہی زمانہ ہے، جس میں علم و فن کی راہیں کھلیں اور انسانیت نے مادّی میدان میں بڑی ترقی حاصل کی، مؤلف محترم نے اس پستی کی نشاندہی کرنے میں آتش بیانی یا سنسنی پیدا کرنے والا طرز نہیں اختیار کیا ہے بلکہ بحث و نظر سے کام لیا ہے، اور واقعات کو پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں جن حقائق کو پیش کیا ہے، وہ خود ہر طرح کی مبالغہ آرائی اور رنگ آمیزی سے بے نیاز ہیں۔

اس تاریخی جائزہ کے وقت کتاب کا پڑھنے والا بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے کہ موجودہ قیادت بدلنے کی سخت ضرورت ہے، اور اس بات کی ضرورت ہے کہ انسانیت کو پھر اسی سرچشمۂ ہدایت پر لا کر کھڑا کر دیا جائے، جس ہدایت کا مقصد ہی یہ تھا کہ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف اور جاہلیت سے نجات دلا کر علم و معرفت کی طرف لائے، اس کتاب کے پڑھنے والے کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس قیادت کی کیا عالمگیر اہمیت ہے، اور اسے کھو کر انسانیت کو کتنا بڑا خسارہ برداشت کرنا پڑا ہے، اور اس خسارہ میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا شریک ہے، یہ اتنا وسیع خسارہ ہے، جو ماضی و حال اور مستقبل قریب و بعید سب پر حاوی ہے، اس کے ساتھ ہی مسلمان کے دل میں ندامت و شرمندگی کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس نے کیسی مجرمانہ کوتاہی اور غفلت کا ارتکاب کیا، دوسری طرف اس کے اندر یہ احساس بھی ابھرتا ہے کہ اسے کیسی عظیم الشان صلاحیتیں بخشی گئی ہیں، پھر اس عالمی قیادت کو دوبارہ حاصل کرنے کی تڑپ بھی پیدا ہوتی ہے، جو اس نے اپنی غفلت و ناقدری سے کھو دی ہے۔

اس کتاب کی ایک قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ مؤلف جہاں کہیں انسانیت کی پستی کا

ذکر کرتے ہیں (وہ پستی جو تمام انسانوں پر محض اس وجہ سے آئی کہ مسلمان ان کی قیادت سے قاصر ہیں) وہاں مؤلف اس پستی کو جاہلیت سے تعبیر کرتے ہیں، یہ اسلوب بیان بہت خوبی کے ساتھ مؤلفِ محترم کے اندازِ فکر کو واضح کرتا ہے کہ ان کے نزدیک اسلامی روح اور اس مادہ پرستی کی روح (جو اسلام سے قبل دنیا پر چھائی ہوئی تھی، اور اسلام کی قیادت سے دستبرداری کے بعد آج بھی چھائی ہوئی ہے) کے درمیان کیا فرق ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ جاہلیت اپنے مزاج اور روح کے اعتبار سے ایک ہی ہے، جاہلیت کسی محدود زمانہ کے کسی خاص وقفہ کا نام نہیں ہے بلکہ عقل و فکر کی ایک خاص اور متعین ساخت کا نام ہے، وہ فکری ساخت اس وقت اُبھرتی ہے جب کہ انسانی زندگی کے وہ حدود اور وہ معیار باقی نہیں رہتے جو خدا نے مقرر کئے ہیں، اور ان کی جگہ بنائے ہوئے وہ مصنوعی معیار آجاتے ہیں، جن کی بنیاد وقتی خواہشات پر ہوتی ہے جس کو آج دنیا اپنے ارتقائی دور میں بھی اسی طرح جھیل رہی ہے جس طرح اپنے بربریت اور جہالت کے ابتدائی زمانہ میں جھیل رہی تھی، فاضل مؤلف کتاب کے آخری باب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"عالمِ اسلامی کا پیغام اللہ، رسول اور اس کی قیادت پر ایمان لانے کی دعوت دینا ہے اس کا صلہ یہ ملے گا کہ تاریکیوں سے نکل کر روشنی کی طرف، انسان کی عبادت سے نجات پاکر اللہ کی عبادت کی طرف، دنیا کی تنگنائی سے نکل کر عالم کی وسعت کی طرف، مذاہب کے جور و ستم سے بچ کر عدلِ اسلامی کی طرف آنا نصیب ہوگا، اس پیغام کی اہمیت سامنے آچکی ہے، اور اس زمانہ میں اس کا سمجھنا دوسرے زمانہ کی بہ نسبت زیادہ آسان اور سہل ہے آج جاہلیت سربازار رسوا ہو چکی ہے، اس کے چھپے ڈھکے عیب نگاہوں کے سامنے آگئے ہیں، دنیا اس سے عاجز آچکی ہے لہذا جاہلی قیادت کو چھوڑ کر اسلامی قیادت کی طرف منتقل ہونے کا یہ خاص وقت ہے،

بشرطیکہ عالمِ اسلامی اس کے لئے کھڑا ہو اور اس پیغام کو پورے عزم و اخلاص اور جرأت و ہمت کے ساتھ اپنا لے اور اس پیغام کو دنیا کا نجات دہندہ باور کرے اور یقین کرے کہ پستی و تباہی سے دنیا کو صرف یہی پیغام نجات دلا سکتا ہے"۔

اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اسلام کے اصول و کلیات کو ان کے وسیع دائرہ کے اندر رہ کر اور اسلام کی صحیح روح کے مطابق سمجھا ہے، اس بنا پر نہ صرف یہ کتاب دینی و اجتماعی تحقیقِ علمی کا نمونہ ہے، بلکہ اس کا بھی نمونہ ہے کہ اسلامی زاویۂ نگاہ سے تاریخ کو کس طرح مرتب کرنا چاہیئے۔

علمائے مغرب نے دنیا کی تاریخ مغربی نقطۂ نظر سے لکھی ہے، اور وہ قدرتاً اپنی مادی تربیت، مادی فلسفے اور پھر مذہبی و قومی تعصب کے اثرات سے خالی نہیں تھے، چنانچہ دانستہ یا نادانستہ ان کی تاریخ میں اغلاط اور جا بجا بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں، کیونکہ انھوں نے انسانی زندگی کی بہت سی اہم قدروں کو فراموش کر دیا ہے، حالانکہ انسانی زندگی کی تاریخ ان کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتی، اور نہ ان قدروں کے جانے بغیر واقعات کی صحیح توجیہ ممکن ہے، اور نہ نتائج اخذ کرنا درست ہو سکتا ہے نیز یورپین مورخین عموماً اپنے قومی و مذہبی تعصب کی بنا پر دنیا کا مرکز یورپ ہی کو سمجھ لیتے ہیں، اور زندگی کے دوسرے اہم مؤثرات اور محرکات کو صرف اس لئے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یورپ ان کا ماخذ نہیں ہے یا کم از کم بہت گھٹا کر اور ان کی اہمیت کو کم کر کے پیش کرتے ہیں۔

بد قسمتی سے ہم لوگ عرصہ سے اس کے عادی چلے آرہے ہیں کہ جس طرح دوسری اشیاء یورپ سے منگاتے ہیں اسی طرح تاریخ بھی یورپ ہی کے ہاتھوں حاصل کریں اور ان تمام کمزوریوں کے ساتھ اس کو جوں کا توں لے لیں، حالانکہ ان کا طریقۂ تصنیف اور طریقِ فکر ہی سرے سے ناقص اور پُراز اغلاط ہے، کیونکہ انھوں نے انسانی زندگی کو ایک محدود زاویہ سے دیکھا ہے اور اس غلط اور محدود زاویۂ نگاہ سے وہ غلط

نتائج کا شکار ہوئے ہیں اور یہ ظاہر ہے جب مقدمات ہی درست نہ ہوں گے تو نتیجہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔

پیش نظر کتاب تاریخ کا ایک ایسا نمونہ ہے جس میں ان تمام امور پر نگاہ رکھی گئی ہے اور تمام محرکات اور مختلف قدروں کا لحاظ رکھا گیا ہے کتاب کے پڑھنے والے غالباً اس کے متوقع نہ ہوں گے کہ ایک صاحبِ بیان مؤلف جو اسلام کی روحانی طاقت پر یقین کامل رکھتے ہیں اور عالمی قیادت کو اسلام کے سپرد کرنے کا پُر جوش جذبہ ان کے دل میں موجزن ہے جہاں قیادت کی صلاحیتوں پر گفتگو کریں گے وہاں روحانی قوت کے ساتھ ساتھ صنعتی و حربی صلاحیت کا بھی تذکرہ کریں گے اور جدید تعلیمی نظام اور اقتصادی و تجارتی خود کفالتی پر بھی سیر حاصل بحث کریں گے لیکن بڑی مسرت کی بات ہے کہ انھوں نے اس پہلو کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔

بلا شبہ اس کتاب میں انسانی زندگی پر اثر ڈالنے والے تمام عوامل کا ایک مربوط اور منظم تصور ہے اسی مربوط و منظم تصور کے ساتھ تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے اور امتِ اسلامیہ کو ایسا مشورہ دیا گیا ہے جس میں پورا اعتدال اور تناسب پایا جاتا ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر یہ کتاب تاریخ نویسی کا ایک کامیاب نمونہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو یورپ کے اسلوبِ نگارش سے بے نیاز ہو کر (جس میں ارتباط و توازن، مورخانہ انصاف اور علمی تحقیق کی بالعموم کمی ہوتی ہے) تاریخی مباحث پر کس طرح قلم اٹھانا چاہیئے اور کس انداز سے اس کو مرتب کرنا چاہیئے۔

میری خوش قسمتی ہے کہ پیش نظر کتاب کے بارہ میں اپنے ان تاثرات کے اظہار کا موقع ملا اور بڑی مسرت ہے کہ مجھے اس کتاب کا مطالعہ عربی زبان میں نصیب ہوا، اس لئے کہ فاضل مؤلف نے اسی زبان کو اپنی تصنیف کے لئے اختیار کیا ہے اور آج دوسری بار مصر میں اس کے شائع ہونے کی نوبت آرہی ہے

"اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ"

سید قطب (شہید)
حلوان (مصر)

باب اوّل

بعثتِ محمدیؐ سے پہلے

چھٹی صدی مسیحی کی دنیا

چھٹی صدی مسیحی بلا اختلاف تاریخِ انسانی کا تاریک ترین و پست ترین دور تھا، صدیوں سے انسانیت جس پستی و نشیب کی طرف جارہی تھی، اس کے آخری نقطہ کی طرف پہونچ گئی تھی، روئے زمین پر اس وقت کوئی ایسی طاقت نہ تھی، جو گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑ سکے، اور ہلاکت کے غار میں اس کو گرنے سے روک سکے، نشیب کی طرف جاتے ہوئے روز بروز اس کی رفتار میں تیزی پیدا ہو رہی تھی، انسان اس صدی میں خدا فراموش ہو کر کامل طور پر خود فراموش بن چکا تھا، وہ اپنے انجام سے بالکل بے فکر اور بے خبر اور بُرے بھلے کی تمیز سے قطعاً محروم ہو چکا تھا، پیغمبروں کی دعوت کی آواز عرصہ ہوا دب چکی تھی، جن چراغوں کو یہ حضرات روشن کر گئے تھے، وہ ہواؤں کے طوفان میں یا تو بجھ چکے تھے یا اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اس طرح ٹمٹما رہے تھے، جن سے صرف چند خدا شناس دل روشن تھے، جو شہروں کو چھوڑ کر چند پورے پورے گھروں میں بھی اُجالا نہیں کر سکتے تھے، دیندار اشخاص دین کی امانت کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئے زندگی کے میدان سے کنارہ کش ہو کر دیر و کلیسا اور صحراؤں کی تنہائیوں میں پناہ گزیں ہو گئے تھے، اور

زندگی کی کشمکش، اس کے مطالبات اور اس کی خشک و تلخ حقیقتوں سے دامن بچا کر دین و سیاست اور روحانیت و مادّیت کے معرکہ میں شکست کھا کر اپنے فرائضِ قیادت سے سبکدوش ہو گئے تھے، اور جو زندگی کے اس طوفان میں باقی رہ گئے تھے، انھوں نے بادشاہوں اور اہلِ دنیا سے سازباز کر لی تھی، اور ان کی ناجائز خواہشات اور ظالمانہ نظامِ سلطنت و معیشت میں ان کے دست راست اور باطل طریقہ پر لوگوں کا مال کھانے اور ان کی قوت و دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں ان کے شریک و سہیم بن گئے تھے۔

رومی اور ایرانی اس وقت مغرب و مشرق کی زعامت اور دنیا کی قیادت کے اجارہ دار بنے ہوئے تھے، وہ دنیا کے لئے کوئی اچھا نمونہ ہونے کے بجائے ہر قسم کی خرابی اور فساد کے علمبردار و ذمہ دار تھے، مختلف اجتماعی اور اخلاقی امراض کا عرصہ سے یہ قومیں آشیانہ بنی ہوئی تھیں، ان کے افراد تعیّش و تکلّفات کی زندگی اور مصنوعی تمدّن کے سمندر میں سرتاپا غرق تھے، بادشاہ اور حکام خواب غفلت میں مدہوش اور نشۂ سلطنت میں سرشار تھے، کام و دہن کی لذّت اور خواہشاتِ نفس کی تسکین کے سوا ان کو دنیا میں کوئی فکر اور زندگی میں کوئی اور مشغلہ نہ تھا، زندگی کی ہوس اور لذّت کی حرص اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کو کسی طرح سیری نہیں ہوتی تھی، متوسّط طبقہ کے لوگ (ہر زمانہ کے دستور کے مطابق) اس اعلیٰ طبقہ کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتے تھے، اور اس کی نقّالی کو سب سے بڑا فخر سمجھتے تھے، باقی رہے عوام تو وہ زندگی کے بوجھ اور حکومت کے مطالبات اور محصولات کے بار میں ایسے دبے ہوئے اور غلامی اور قانون کی زنجیروں اور بیڑیوں میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ ان کی زندگی جانوروں اور چوپایوں سے ذرا مختلف نہ تھی، دوسروں کی راحت کے لئے محنت کرنے اور دوسروں کے عیش و عشرت کے لئے بے زبان جانوروں کی طرح ہر وقت جتے رہنے اور جانوروں کی طرح

اپنا پیٹ بھر لینے کے سوا ان کا کوئی حصہ نہ تھا کبھی اگر وہ اس خشک و بے مزہ زندگی اور اس یکساں چکر سے اکتا جاتے تو نشہ آور چیزوں اور سستی تفریحات سے اپنا دل بہلا لیتے اور اگر کبھی زندگی کے اس عذاب سے ان کو سانس لینے کا موقع ملتا تو فاقہ زدہ اور ندیدہ انسان کی طرح مذہب واخلاق کی پابندیوں سے آزاد ہو کر حیوانی لذتوں پر آنکھیں بند کر کے گرتے۔

دنیا کے مختلف حصوں اور ملکوں میں ایسی دینی غفلت و خود فراموشی، اجتماعی بے نظمی وانتشار اور اخلاقی تنزّل و زوال رونما تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ممالک تنزل وانحطاط اور شر و فساد میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں، اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سا ملک دوسرے سے بڑھا ہوا ہے۔

اقوام و مذاہب پر ایک نظر

اس دور میں بڑے بڑے مذہب بازیچۂ اطفال اور منافقین کا تختۂ مشق بن گئے تھے، ان مذاہب کی صورت و حقیقت دونوں اس درجہ مسخ ہو گئی تھی کہ اگر یہ ممکن ہوتا کہ کسی طرح ان مذاہب کے پیشوا دنیا میں آکر اپنے دین کا حال دیکھ سکیں تو قطعاً وہ اپنے مذاہب نہ پہچان سکتے۔

تہذیب و تمدّن کے گہواروں میں خود سری، بے راہ روی اور اخلاقی پستی کا دور دورہ تھا، نظامِ حکومت میں حد درجہ ابتری تھی، حکام کی سخت گیری اور عوام کی اخلاقی گراوٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قومیں اپنے اندرونی مسائل ہی میں اُلجھ کر رہ گئی تھیں، دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے ان کے پاس نہ کوئی پیغام تھا، اور نہ انسانیت کے لئے کوئی دعوت تھی، درحقیقت یہ اقوام و مذاہب اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے، ان کی زندگی کا سوتا خشک ہو چکا تھا، ان کے پاس نہ دینی ہدایات تھیں اور نہ نظامِ حکومت کے لئے مُستحکم و معقول اصول۔

مسیحیت چھٹی صدی عیسوی میں

مسیحی مذہب میں کبھی بھی اس درجہ تفصیل و وضاحت نہ تھی کہ جس کی روشنی میں زندگی کے اہم مسائل سلجھائے جا سکیں یا اس کی بنیاد پر تمدن کی تعمیر ہو سکے، یا اس کے زیر ہدایت کوئی سلطنت چل سکے، جو کچھ تھا وہ صرف حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کا ایک ہلکا سا خاکہ تھا جس پر توحید کے سادہ عقیدہ کا کچھ پرتو تھا، مسیحیت کا یہ امتیاز بھی اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ یہ مذہب سینٹ پال کی دستبرد سے بچا رہا، اس نے تو آکر رہی سہی روشنی بھی گل کر دی کیونکہ جس بُت پرستانہ ماحول میں اس کی پرورش ہوئی تھی، اور جن جاہلی خرافات سے وہ نکل کر آیا تھا، اس نے مسیحیت میں ان تمام جہالتوں اور لغویات کی آمیزش کر دی، اس کے بعد قسطنطین کا زمانہ آیا جس نے اپنے دور حکومت میں رہی سہی اصلیت بھی کھو دی، غرض یہ کہ چوتھی صدی ہی میں مسیحیت ایک معجون مرکب بن کر رہ گئی تھی، جس میں یونانی خرافات، رومی بُت پرستی، مصری افلاطونیت (NEO-PLATONISM & MONASTICISM) اور رہبانیت کے اجزا شامل تھے حضرت مسیحؑ کی سادہ تعلیمات کا عنصر اس مجموعہ میں اس طرح گم ہو کر رہ گیا تھا جیسے کہ ایک قطرہ کا وجود سمندر میں گم ہو جاتا ہے، بالآخر مسیحیت چند بے جان مراسم اور بے کیف عقائد کا نام رہ گیا تھا، جو نہ روح میں گداز پیدا کر سکتے تھے، نہ عقل کی افزائش کا سبب بن سکتے تھے، نہ جذبات کو حرکت میں لا سکتے تھے، اور نہ ان میں اس کی صلاحیت تھی کہ زندگی کے اہم مسائل میں انسانی قافلہ کی رہبری کر سکیں، اس پر تحریف و تاویل کی مصیبت مستزاد تھی جس کا انجام یہ ہوا کہ بجائے اس کے کہ نصرانیت علم و فکر کے دروازے کھولتی، وہ خود علم و فکر کی راہ میں چٹان بن کر کھڑی ہو گئی اور صدیوں کے مسلسل انحطاط کے باعث محض ایک

بُت پرستی کا مذہب بن کر رہ گیا۔ سیل (SALE) جس نے انگریزی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا ہے، چھٹی صدی عیسوی کے عیسائیوں کے بارے میں کہتا ہے "مسیحیوں نے بزرگوں اور حضرت مسیح کے مجسّموں کی پرستش میں اس درجہ غلو کیا کہ اِس زمانہ کے رومن کیتھولک بھی اس حد کو نہیں پہونچے"۔[1]

رومی سلطنت میں مذہبی خانہ جنگی

پھر نفس مذہب سے متعلق کلامی مباحث اُبھر آئے اور بے نتیجہ اختلافات کی شورش نے قوم کو اُلجھا دیا جس میں ان کی ذہانتیں ضائع ہوئیں اور قوائے عملیہ شل ہو گئے، بیشتر ان خانہ جنگیوں نے بڑے پیمانہ پر خونی معرکہ کی شکل اختیار کرلی، مدارس، کلیسا اور لوگوں کے مکانات حریف کیمپ بن گئے تھے، اور پورے کا پورا ملک خانہ جنگی (CIVIL WAR) کا شکار تھا، بحث یہ تھی کہ حضرت مسیح کی فطرت کیا ہے، اور اس میں الٰہی اور بشری جُزو کس تناسب سے ہیں؟ روم و شام کے ملکانی MALKITE عیسائیوں کا مذہب یہ تھا کہ حضرت مسیح کی فطرت مرکّب ہے، اس میں ایک جُزو الٰہی ہے، اور ایک بشری لیکن مصر کے منوفیزٹ (MONOPHYSITES) عیسائیوں کا اصرار تھا کہ حضرت مسیح کی فطرت خالص الٰہی ہے، اس میں ان کی فطرتِ بشری اس طرح فنا ہوگئی ہے، جیسے سرکہ کا ایک قطرہ سمندر میں پڑکر اپنی ہستی کو گم کر دیتا ہے، پہلا مسلک گویا حکومت کا سرکاری مسلک تھا، بازنطینی سلاطین واہل حکومت نے اس کو عام کرنے اور پوری مملکت کا واحد مذہب بنانے میں پوری قوت صرف کی اور مخالفین مذہب (بُتدعین) کو سخت ترین سزائیں دیں جن کے تصوّر سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، مگر اختلاف اور مذہبی کشاکش بڑھتی ہی رہی، دونوں فریق ایک دوسرے کو ایسا ہی خارج از مذہب اور

---

[1] SALE'S TRANSLATION. P. 62 (1896)

بددین سمجھتے تھے، جیسے دو متضاد مذہب کے پیرو، قیرس (CYRUS) کی نیابت مصر کے دس سال (۶۳۱ء-۶۴۱ء) کی تاریخ وحشیانہ سزاؤں اور لرزہ خیز مظالم کی داستانوں سے لبریز ہے۔

اجتماعی بدنظمی اور معاشی بے چینی

روم کی مشرقی ریاست میں اجتماعی بدنظمی انتہا کو پہونچ گئی تھی، باوجود اس کے کہ عام رعایا بے شمار مصائب کا شکار تھی، ٹیکس اور محصول دوگنے چوگنے بڑھ گئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے باشندے حکومت سے نالاں تھے، اور اپنے ملکی حکمرانوں پر بدیسی حکومتوں کو ترجیح دیتے تھے، اجارہ داریاں (MONOPOLIES) اور ضبطیاں مصیبت بالائے مصیبت تھیں، ان اسباب کی بنا پر بڑے پیمانہ پر فسادات اور بغاوتیں رونما ہوئیں، چنانچہ ۵۳۲ء کے فساد میں تیس ہزار افراد دارالسلطنت میں ہلاک ہوئے[3] اور ہر چند کہ وقت اور مصلحت کا تقاضا تھا کہ اخراجات میں کفایت شعاری سے کام لیا جاتا، لیکن لوگ اسراف اور فضول خرچی سے باز نہیں آتے تھے، اور اخلاقی گراوٹ کی جو سب سے پست سطح ہو سکتی ہے اس حد تک پہونچ چکے تھے، اور صرف ایک ہی لگن سب کے دل سے لگی تھی کہ جس طرح ممکن ہو زیادہ سے زیادہ مال سمیٹنا چاہیئے، اور اس کو فیشن پرستی، عیش پسندی اور اپنی من مانی خواہشات کے پورا کرنے میں خرچ کیا جائے، انسانیت و شرافت کی بنیادیں اپنی جگہ سے ہل چکی تھیں، تہذیب و اخلاق کے ستون اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے، نوبت یہاں تک پہونچی کہ لوگ ازدواجی زندگی پر تجرد کی زندگی کو ترجیح دیتے تھے تاکہ آزادی سے انہیں کھیل کھیلنے کا

---

[1] ALFRED J. BUTLER ARAB'S CONQUEST OF EGYPT AND THE LAST THIRTY YEARS OF THE ROMAN DOMINION P. 29-30

[2] P. 183-189 [3] (ENCYCLO PAEDIA BRITANNICA CHAP, JUSTIN)

موقع لے[1]، انصاف کا حال یہ تھا کہ بقول سیل (SALE) جس طرح اشیاء کی خرید و فروخت ہوتی ہے' اور ان کے دام ٹھیرائے جاتے ہیں' اسی طرح انصاف بھی فروخت ہوتا، رشوت، و خیانت کی ہمت افزائی خود قوم کی طرف سے ہوتی تھی[2]، گبن کہتا ہے "چھٹی صدی عیسوی میں سلطنت کا زوال اور اس کی پستی انتہا پر تھی[3]، اس کی مثال اس بڑے تناور اور گھنے درخت کی تھی جس کے سائے میں دنیا کی قومیں کبھی پناہ لیتی تھیں' اور اب اس کا صرف تنا رہ گیا ہو' جو روز بروز سوکھتا جا رہا ہو[4]"

"تاریخ عالم برائے مؤرخین" کے مصنفین لکھتے ہیں :-

"بڑے بڑے شہر جن میں تیزی کے ساتھ بربادی آئی' اور پھر وہ سنبھل نہ سکے' اور نہ اس لائق ہو سکے کہ اپنی عظمتِ رفتہ کو پھر زندہ کر سکیں' وہ گواہ ہیں کہ بازنطینی حکومت اس زمانہ میں انتہائی انحطاط و تنزل کے عالم میں تھی' اور یہ تنزل ٹیکس اور محصول میں زیادتی، تجارت میں پستی، زراعت سے غفلت، شہروں کی آبادی میں روز افزوں کمی کا نتیجہ تھا[5]"

یورپ کی شمالی اور مغربی قومیں

وہ مغربی قومیں جو بالکل شمال و مغرب میں آباد تھیں' جہالت و ناخواندگی کا شکار اور خونی جنگوں سے زار و نزار تھیں' وہ جنگ و جہالت کی پیدا کی ہوئی تاریکی میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں' ان ممالک میں اب تک علم و تمدن کی صبح نمودار نہیں ہوئی تھی' اسلامی و عربی

---

[1] THE STORY OF THE DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE V. 3. P. 327

[2] SALES TRANSLATION P. 72 [3] GIBBON V. V. P. 31 [4] P. 31

[5] HISTORIAN'S HISTORY OF THE WORLD V. VII P. 175

اندلس (SPAIN) اس وقت تک منصۂ شہود پر نہیں آیا تھا کہ علم و تمدن سے روشناس کرائے، نیز مصائب و حوادث نے بھی ان کی آنکھیں نہیں کھولی تھیں، غرض ہر طرح یہ قومیں تمدن انسانی کے قافلہ کی شاہراہ سے الگ تھلگ تھیں، بہت حد تک یہ دنیا سے بے خبر تھیں، اور دنیا ان سے تقریباً ناآشنا تھی، مشرق و مغرب کے ممالک میں جو انقلاب انگیز واقعات و تغیرات پیش آ رہے تھے، ان سے قوموں کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا، عقائد کے لحاظ سے یہ قومیں نوخیز مسیحیت اور فرسودہ بُت پرستی کے درمیان میں تھیں، نہ دین سے متعلق ان کے پاس کوئی پیغام تھا، اور نہ سیاست کے میدان میں ان کا کوئی مقام تھا، ایچ، جی، ویلز (H. G. WELLS) کا بیان ہے "اس زمانہ میں مغربی یورپ کے اندر یکجہتی اور نظام کے کوئی آثار نہ تھے"۔[1]

رابرٹ بریفالٹ ROBERT BRIFFAULT لکھتا ہے:۔

"پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی، اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی جا رہی تھی، اس دور کی وحشت و بربریت زمانۂ قدیم کی وحشت و بربریت سے کئی درجہ زیادہ بڑھی چڑھی تھی، کیونکہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کی لاش کی تھی، جو سڑ گئی ہو، اس تمدن کے نشانات مٹ رہے تھے، اور اس پر زوال کی مہر لگ چکی تھی، وہ ممالک جہاں یہ تمدن برگ و بار لایا اور گزشتہ زمانہ میں اپنی انتہائی ترقی کو پہونچ گیا تھا، جیسے اٹلی و فرانس، وہاں تباہی، طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا"۔[2]

یہود

یورپ، ایشیا، افریقہ میں بسنے والی یہود نام کی قوم دنیا کی تمام قوموں میں

---

[1] A SHORT HISTORY OF THE WORLD P. 170

[2] THE MAKING OF HUMANITY V. P. 164

اس لحاظ سے ممتاز تھی کہ اس کے پاس دین کا بہت بڑا سرمایہ تھا، اور اس میں دینی تعبیرات واصطلاحات سمجھنے کی سب سے زیادہ صلاحیت تھی، لیکن یہ یہودی، مذہب و تمدن یا سیاست میں وہ مقام نہیں رکھتے تھے کہ دوسروں پر اثر ڈال سکیں، بلکہ اُن کے لئے مقدر ہو چکا تھا کہ ہمیشہ ان پر دوسرے لوگ حکومت کریں اور ہمیشہ ظلم و استبداد، سزا و جلاوطنی اور مصائب و مشقت کے ہدف بنے رہیں، عرصۂ دراز تک غلام رہنے اور انواع و اقسام کی سختیاں اور سزائیں جھیلنے کے سبب ان کا ایک خاص مزاج بن گیا تھا، قومی غرور، نسبی تکبر، حرص اور مال و دولت کی حد سے بڑھی ہوئی طمع، مسلسل سود کے لین دین سے ان میں مخصوص ذہنیت وسیرت اور قومی خصائل و عادات پیدا ہو گئے تھے، جن میں وہ ہمیشہ منفرد رہے، مگر دریا مغلوب ہونے کے وقت ذلت و خوشامد، اور غالب ہونے کی صورت میں انتہائی بے رحمی اور بدمعاملگی اور عام حالات میں دغابازی اور نفاق، سنگدلی و خودغرضی، مفت خوری و حرام خوری، راہِ حق سے لوگوں کو روکنا ان کا قومی کردار تھا، قرآن کریم نے ان کی اس صورت حال کا جو چھٹی اور ساتویں صدی میں تھی، بہت واضح اور مکمل نقشہ کھینچا ہے اور بتلایا ہے کہ اخلاقی انحطاط، انسانی پستی اور اجتماعی فساد میں وہ کس منزل میں تھے، اور کیا اسباب تھے جن کی بنا پر وہ ہمیشہ کے لئے عالم کی قیادت اور اقوام کی امامت سے معزول کر دیئے گئے۔

چھٹی صدی کے آخر میں یہودیوں اور عیسائیوں کی باہم رقابت و منافرت اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ ان میں سے کوئی دوسرے فریق کو ذلیل کرنے اور اس سے اپنی قوم کا انتقام لینے اور مفتوح کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا تھا، ۶۱۰ء میں یہودیوں نے انطاکیہ میں عیسائیوں کے خلاف بلوہ کیا، شہنشاہ فوقا (PHOCAS) نے ان کی سرکوبی کے لئے مشہور فوجی افسر بنوسوس (BONOSUS) کو بھیجا اس نے پوری یہودی آبادی کا اس طرح

خاتمہ کیا کہ ہزاروں کو تلوار سے، سیکڑوں کو دریا میں غرق کر کے، آگ میں جلا کر اور درندوں کے سامنے ڈال کر ہلاک کر دیا، ۶۱۵ء میں جب ایرانیوں نے شام کو فتح کیا تو یہودیوں کے مشورہ و ترغیب سے خسرو نے عیسائیوں پر وحشیانہ مظالم کئے اور بیشتر عیسائیوں کو تہ تیغ کیا، ایرانیوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد ہرقل (HERCULES) نے زخم خوردہ عیسائیوں کے مشورہ سے ۶۳۰ء میں یہودیوں سے سخت انتقام لیا اور ان کا اس طرح قتل عام کیا کہ رومی مملکت میں صرف وہ یہودی بچ سکے جو ملک چھوڑ کر چلے گئے یا کہیں چھپے رہے۔[1]

اس سفّاکی و بربریت اور اس خوں آشام ذہنیت کے ساتھ جس کا مظاہرہ ساتویں صدی کے ان دو عظیم ترین مذاہب نے کیا، اس کی کیا توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے دورِ حکومت میں انسانیت کے پاسبان ثابت ہوں گے اور حق و انصاف، امن و صلح کا پیغام دُنیا کو سنائیں گے۔

ایران اور وہاں کی تخریبی تحریکات

متمدن دنیا کی تولیت و انتظام میں ایرانؔ، رومؔ کا شریک تھا لیکن بدقسمتی سے وہ دشمنِ انسانیت افراد کی سرگرمیوں کا پرانا مرکز تھا، وہاں کی اخلاقی بنیادیں زمانۂ دراز سے متزلزل چلی آ رہی تھیں، جن رشتوں سے ازدواجی تعلقات دنیا کے متمدن و معتدل علاقوں کے باشندے ہمیشہ ناجائز اور غیر قانونی سمجھتے رہے ہیں، اور فطری طور پر اس سے نفرت کرتے ہیں ایرانیوں کو ان کی حُرمت و کراہت تسلیم نہیں تھی، یزدگرد دوم جس نے پانچویں صدی کے وسط میں حکومت کی ہے اس نے اپنی لڑکی کو زوجیت میں رکھا پھر قتل کر دیا،[2] بہرام چوبیں جو چھٹی صدی عیسوی

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "الخطط المقریزیہ"۔ ج ۴ ص ۳۹۲ اور
(THE ARAB'S CONQUEST OF EGYPT P. 133—134)

[2] HISTORIANS' HISTORY OF THE WORLD, VOL. VIII P. 24

میں حکمراں تھا، اس نے اپنی بہن سے اپنا ازدواجی تعلق رکھا۔[۱] پروفیسر آرتھر کرسٹن سین کے بیان کے مطابق اس قسم کا رشتہ ایران میں کوئی ناجائز فعل تصور نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ ایک عبادت اور کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔ مشہور چینی سیاح (ہیوئن سیانگ) کا بیان ہے کہ ایرانی قانون و معاشرت میں ازدواجی تعلقات کے لئے کسی رشتہ کا بھی استثناء نہ تھا۔[۲]

تیسری صدی عیسوی میں مانی دنیا کے سامنے آیا اس کی تحریک دراصل ملک کے بڑھتے ہوئے شدید شہوانی رجحان کا ایک غیر فطری اور سخت ردِ عمل اور نور و ظلمت کی مفروضہ کش مکش کا (جو ایران کا قدیمی فلسفہ ہے) نتیجہ تھا، چنانچہ اس نے تجرد کی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی تاکہ دنیا سے شر و فساد کے جراثیم ناپید ہو جائیں، اس نے اعلان کیا کہ نور و ظلمت کا امتزاج ہی شر کا باعث ہے، اس سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے، اس بنا پر اس نے نکاح کو حرام قرار دیا کہ انسان جلد سے جلد فنا ہو جائے اور نسلِ انسانی منقطع ہو کر نور کو ظلمت پر دائمی فتح حاصل ہو، بہرام نے ۲۷۶ء میں مانی کو یہ کہتے ہوئے قتل کر ڈالا کہ یہ شخص دنیا کی تباہی کی دعوت دیتا ہے، اس لئے قبل اس کے کہ دنیا ختم ہو اور اس کا مقصد پورا ہو اس کو خود ہلاک ہونا چاہئے، لیکن مانی مذہب کے قتل کے باوجود اس کی تعلیمات عرصہ تک زندہ رہیں، اور اسلامی فتح کے بعد تک ان کے اثرات باقی رہے۔

ایران کی اُفتادِ طبع نے پھر ایک مرتبہ مانی کی دشمنِ فطرت تعلیمات کے خلاف بغاوت کی، یہ بغاوت مزدک (پیدائش ۴۸۷ء) کی دعوت کی شکل میں سامنے آئی، اس نے اعلان کیا کہ تمام انسان یکساں طور پر پیدا ہوئے ہیں، ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے، لہٰذا ہر ایک کو دوسرے کی ملکیت میں مساوی حقوق حاصل ہیں، اور چونکہ مال اور عورت ہی دو ایسے عنصر ہیں جن کی حفاظت و نگرانی کا انسان اہتمام کرتا ہے، لہٰذا انھیں میں مساوات و اشتراک کی سب سے

۱؎ تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۳۸ ۲؎ ایران بعہد ساسانیاں ص ۴۳۰

زیادہ ضرورت ہے' شہرستانی کا بیان ہے" مزدک نے تمام عورتوں کو سب کے لئے حلال قرار دے دیا، اور مال وزن کو مثل آگ' پانی اور چارہ کے مشترک اور عام کردیا"[1] نوجوانوں اور عیش پسندوں کی مراد برآئی اور انھوں نے اس تحریک کا پُرجوش خیر مقدم کیا، طُرفہ تماشہ یہ ہوا کہ شاہِ ایران قباذ نے اس کی سرپرستی قبول کرلی اور اس کی اشاعت و تبلیغ میں بڑی سرگرمی دکھائی، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریک آگ کی طرح ملک میں پھیل گئی' پورے کا پورا ایران جنسی انارکی اور شہوانی بُحران میں ڈوب گیا، طبرانی کا بیان ہے کہ :-

"اوباش اور آوارہ مزاج لوگوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور مُزدک اور مُزدکیوں کے پُرجوش ساتھی اور دست و بازو بن گئے، عام شہری اس بلائے ناگہانی کا شکار تھے' اس تحریک کا اتنا زور ہوا کہ جو چاہتا جس کے گھر میں چاہتا گھس آتا اور مال وزن پر قبضہ کرلیتا اور صاحبِ مکان کچھ بھی نہ کرسکتا، ان مزدکیوں نے قباذ کو ابھارا اور اس کو معزولی کی دھمکی دے کر تیار کرلیا کہ وہ بھی اس دعوت کو اپنالے نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ عالم ہوگیا کہ نہ باپ اپنے لڑکوں کو پہچان سکتا تھا، اور نہ لڑکا اپنے باپ کو، کسی کو بھی اپنی کسی ملکیت پر اختیار اور قبضہ نہیں تھا"[2]

طبری کا بیان ہے کہ" اس تحریک سے پہلے قباذ ایران کے اچھے فرمانراؤں میں تھا لیکن مزدک کی پیروی کی وجہ سے حدودِ مملکت اور سرحدوں میں پراگندگی اور ابتری پھیل گئی"[3]

ایران کی شاہ پرستی

ایران کے سلاطین جن کا لقب کسریٰ (خسرو) ہوا کرتا تھا، اس بات کے مدعی تھے کہ

---

[1] الملل والنحل للشہرستانی ص۸۶ [2] تاریخ طبری ج ۲ ص۸۸ [3] ایضاً

ان کی رگوں میں خدائی خون ہے' اہلِ ایران بھی انھیں اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ گویا وہ خدا ہیں' ان کا اعتقاد تھا کہ ان سلاطین کی فطرت میں ایک مقدّس آسمانی چیز ہے' چنانچہ یہ لوگ ان کے آگے سربسجود ہوتے' ان کی اُلوہیت کے ترانے گاتے اور انھیں قانون سے' تنقید سے' بلکہ بشریت سے بالاتر تصور کرتے تھے' فرطِ ادب سے ان سلاطین کے نام بھی اپنی زبان پر نہ لاتے اور نہ کوئی شخص ان کی مجلس میں بیٹھنے کی ہمت کرسکتا تھا' اہل ایران کا عقیدہ تھا کہ ان سلاطین کا ہر انسان پر پیدائشی حق ہے' اور کسی انسان کا ان سلاطین پر حق نہیں' شاہ ایران اپنی دولت میں سے جو تھوڑا بہت کسی کو دے دے یا اپنے دسترخوان سے کوئی ٹکڑا اٹھا کر کسی کو عطا کردے وہ اس کا احسان وصدقہ ہے' کسی کا استحقاق نہیں' لوگوں کو سوائے احکام کی بجاآوری کے کسی امر میں دخل نہ دینا چاہئے' ملک وقوم پر حکومت کرنے کے لئے ایک خاص گھرانہ (کیانی خاندان) متعیّن تھا' اہلِ ایران سمجھتے تھے کہ صرف اسی گھرانے کے افراد تخت وتاج کے وارث اور ملک وسلطنت کے مالک ہوسکتے ہیں' اور یہ حق وراثتاً بیٹے کو باپ سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا رہے گا' اس حق میں کسی کو دست درازی کی مجال نہیں' چنانچہ یہ لوگ بادشاہِ وقت پر ایمان رکھتے تھے' اور حکومت کو شاہی خاندان کا موروثی حق سمجھتے تھے' کہ جس میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی' اگر اس خاندان میں کوئی سن رسیدہ نہ ملتا تو بچہ ہی کو اپنا شہنشاہ تسلیم کرلیتے اور اگر کوئی مرد باقی نہ رہتا تو عورت ہی کو تاج شہنشاہی پہناتے' چنانچہ شیرویہ کے بعد اس کے ہفت سالہ بچہ اردشیر کو شہنشاہ تسلیم کیا گیا اور خسرو پرویز کے بیٹے فرخ زاد خسرو کو طفلی کی حالت میں لوگوں نے بادشاہ بنایا اور کسریٰ کی لڑکی بوران بھی تخت نشین ہوئی اور دوسری بیٹی جس کا نام آزرمی دخت تھا' وہ بھی حکومت کرچکی ہے[1]' کسی کو اس کا تصوّر بھی نہیں آیا کہ کسی سپہ سالار

[1] تاریخ طبری۔ ج ۲۔ وتاریخ ایران از مکاریوس ایرانی۔

یا بڑے سردار یا کسی دوسرے لائق اور آزمودہ کار شخص کو (جیسے رستم و جابان تھے) انتظامِ سلطنت سپرد کر دیں چونکہ وہ شاہی گھرانے سے تعلق نہیں رکھتے تھے، اس لئے ان کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

مذہبی گھرانوں اور سرداروں کے بارہ میں ان کا عقیدہ یہی تھا کہ یہ لوگ عام انسانی سطح سے بلند ہیں، اور ان کی شخصیتیں اور ان کے دل و دماغ دوسرے انسانوں سے الگ ہیں، ان اشخاص کو اہل ایران نے غیر محدود اختیارات دے رکھے تھے، اونچ نیچ کا فرق طبقوں کا تفاوت اور پیشوں کی تقسیم ایرانی سوسائٹی اور نظامِ زندگی کا اٹل قانون تھا جس میں ردّوبدل ممکن نہ تھا، پروفیسر آرتھر کرسٹن سین کا بیان ہے:۔

"سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے درمیان ناقابلِ عبور فاصلہ تھا[۱] حکومت کی طرف سے عوام الناس کو ممانعت تھی کہ وہ طبقۂ امرا میں سے کسی کی جائداد کو خرید سکیں،[۲] سیاست ساسانی کا یہ محکم اصول تھا کہ ہرگز کوئی شخص اپنے اس رتبہ سے بلند تر رتبہ کا خواہاں نہ ہو جو اس کو پیدائشی طور پر یعنی از روئے نسب حاصل ہے،[۳] کوئی شخص مجاز نہ تھا کہ سوائے اس پیشہ کے جس کے لئے خدا نے اسے پیدا کیا ہے کوئی دوسرا پیشہ اختیار کر سکے[۴]، شاہانِ ایران حکومت کا کوئی کام کسی نیچ ذات کے آدمی کے سپرد نہیں کرتے تھے[۵] عوام الناس کی مختلف جماعتوں میں نہایت صریح امتیاز تھا، سوسائٹی میں ہر شخص کی ایک معین جگہ تھی"[۶]

ایران کی قوم پرستی

اہل ایران اپنی ایرانی قومیت کو عظمت و تقدیس کی نگاہ سے دیکھتے تھے، وہ

۱؎ ایران بعہد ساسانیاں صفحہ ۵۹ ۲؎ ایضاً صفحہ ۴۲۰ ۳؎ ایضاً صفحہ ۴۲۱ ۴؎ ایضاً صفحہ ۴۲۲ ۵؎ ایضاً صفحہ ۴۲۲
۶؎ ایضاً صفحہ ۴۲۱

اپنے تئیں یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر نسل پر اس قومیت و نسل کو فضیلت و برتری حاصل ہے، اور اللہ تعالیٰ نے انھیں وہ خصوصی صلاحیتیں اور فطری قابلیتیں بخشی ہیں جن میں ان کا کوئی شریک و ہمسر نہیں، یہ لوگ اپنے گرد و پیش کی قوموں کو بڑی حقارت و ذلت آمیز نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ان کے لئے ایسے نام تجویز کرتے تھے جن میں توہین و تمسخر پایا جاتا۔

آتش پرستی اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات

چونکہ آگ اپنے پجاریوں کو ہدایت دینے اور اپنا پیغام پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور نہ اس میں یہ قدرت ہے کہ اپنے پجاریوں کے مسائل زندگی کو حل کر سکے، ان میں دخل دے اور مجرموں، گنہگاروں اور مفسدوں کا ہاتھ پکڑ سکے اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مجوسیوں کا مذہب چند مراسم و روایات کا نام رہ گیا تھا جنھیں مخصوص اوقات اور خاص خاص مقامات پر ادا کر لیا کرتے تھے، رہا عبادت گاہوں سے باہر اپنے گھروں اور بازاروں، دائرۂ اثر اور سیاسی و اجتماعی امور میں تو اس میں یہ بالکل آزاد تھے، اپنی من مانی کرتے، ان کے خیالات جس رُخ پر چاہتے انھیں موڑتے رہتے یا پھر جو مصلحت اور وقت کا تقاضا ہوتا اس پر کاربند ہوتے، جیسا کہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں عام طور پر مشرکوں کا حال رہا ہے۔

غرض اہلِ ایران ایسے مکمل اور جامع دین سے یکسر محروم تھے، جو ان کے باطن کی اصلاح کرتا، ان کے اخلاق سنوارتا، نفسیاتی خواہشات کو دبانے اور نیک خواہشات کو ابھارنے کی اس میں طاقت ہوتی، وہ خاندان کا نظام زندگی ملک کا دستورِ حکومت ہوتا، جو سلاطین کی چیرہ دستیوں اور حکام کی زیادتیوں کی روک تھام کر سکتا، ظالم کا ہاتھ پکڑ سکتا اور مظلوم کے حق میں انصاف کرا سکتا، لیکن جیسا کہ اوپر گزر چکا آتش پرست ایرانیوں کو ایسا دین نصیب نہ تھا،

اور اس طرح ایران کے مجوسیوں اور دنیا کے دوسرے لا مذہب ولاقانون افراد میں اخلاق واعمال کے لحاظ سے کوئی فرق نہ تھا۔

بدھ مت اور اس کے تغیرات

بودھ مت اپنی سادگی اور اپنی انفرادیت عرصہ ہوا کھو چکا تھا، بودھ مذہب نے ہندوستان کے برہمنی مذہب کو اپنے میں شامل کر کے اور اس کے اوتاروں اور دیوتاؤں کو اختیار کر کے (جیسا کہ ڈاکٹر گستاولی بان مصنف "تمدنِ ہند" کا رجحان معلوم ہوتا ہے) اپنی ہستی کو گم کر دیا تھا، برہمنیت نے (جو عرصہ سے خار کھائے بیٹھی تھی) اس کو ہضم اور اپنے میں ضم کر لیا تھا، بہر حال یہ دونوں مذاہب جو عرصہ سے ایک دوسرے کے حریف چلے آ رہے تھے، باہم شیر وشکر ہو چکے تھے، اور بدھ مت اب عرصہ سے بُت پرستی کا ایک مذہب تھا، جن ممالک میں بھی اس مذہب کے پیرو گئے، بُت ان کے ساتھ رہے، یہ لوگ جہاں جاتے اور جس ملک میں پہنچتے گوتم کے مجسّمے نصب کرتے اور اس کی شبیہیں تیار کرتے، ان کی مذہبی ور تمدنی زندگی ان مجسّموں سے ڈھکی ہوئی نظر آتی ہے[1]، یہ مجسّمے زیادہ تر بودھ مت کے دورِ ترقی میں تیار ہوئے تھے، پروفیسر ایشوراٹوپا

---

[1] ٹکسلا (قدیم بدھ دار السلطنت) کے عجائب خانہ کی سیر کرنے والا ان مجسّموں اور مورتوں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے، جو بدھ مذہب کے مٹے ہوئے شہروں کی کھدائی کے بعد نکلے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب اور اس کا تمدن خالص بُت پرستانہ مذہب وتمدن بن گیا تھا، ڈاکٹر گستاولی بان نے بھی ہندوستان میں بدھ عمارتوں اور یادگاروں کو دیکھ کر یہی نتیجہ نکالا ہے، وہ "تمدنِ ہند" میں لکھتا ہے:-

> "اصلی بدھ مذہب کو سمجھنے اور جاننے کے لئے اس مذہب کی یادگاروں کا مطالعہ کرنا چاہئے نہ کہ کتابوں کا، جو سبق ہمیں ان یادگاروں سے ملتا ہے، وہ ان کتابی مسائل سے جن کی تعلیم یورپی مصنفین کرتے ہیں، بالکل علیحدہ ہے، یہ یادگاریں ثابت کرتی ہیں کہ جس مذہب کو یورپی علماء الحادی مذہب بتاتے ہیں، وہ فی الواقع بُت پرست اور کثیر الآلہہ مذاہب کا سرتاج ہے۔" (تمدنِ ہند ص۲۶۵)

اپنی کتاب "ہندوستانی تمدن" میں لکھتے ہیں "بدھ مت کے سایہ میں ایسی حکومت قائم ہوئی جس میں اوتاروں کی بھرمار اور مورت پرستی کا دور دورہ دکھلائی دینے لگا، سنگھوں کی فضا بدل رہی تھی، اس میں بدعتیں اور جدّتیں یکے بعد دیگرے نظر آرہی تھیں۔"[1]

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب تلاش ہند THE DISCOVERY OF INDIA میں بدھ مت کے بگاڑ اور تدریجی زوال کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"برہمنیت نے بودھ کو اوتار بنا دیا، بودھ مت نے بھی یہی کیا، سنگھ بہت دولت مند ہوگئے اور ایک خاص جماعت کے مفاد کے مرکز بن کر رہ گئے، اور ان میں ضبط و قاعدہ بالکل نہیں رہا، عبادت کے طریقوں میں سحر اور اوہام داخل ہوگئے، اور ہندوستان میں ایک ہزار سال تک باقاعدہ رائج رہنے کے بعد بودھ مت کا تنزل شروع ہوگیا' اس عہد میں اس کی جو مریضانہ کیفیت تھی مسز رائس ڈیوڈس (MRS. RHYS DAVIDS) نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

"ان مریضانہ تخیلات کے گہرے سائے میں آکر گوتم کی اخلاقی تعلیم نظر سے اوجھل ہوگئی، ایک نظریہ پیدا ہوا اور اس نے فروغ پایا، اس کی جگہ دوسرے نے لے لی، اور ہر ایک قدم پر ایک نیا نظریہ پیدا ہونے لگا، یہاں تک کہ ساری فضا میں ذہن کی ان پُرفریب تخلیقوں سے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا، اور بانیٔ مذہب کے سادہ اور بلند اخلاقی درس ان الہیاتی موشگافیوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئے"[2] مجموعی حیثیت سے بودھ مت اور برہمنیت دونوں ہی میں گراوٹ پیدا ہوگئی اور ان میں اکثر مبتذل رسوم داخل ہوگئیں، دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا، بودھ مت برہمنیت میں گھل مل گیا۔"[3]

---

[1] ہندوستانی تمدن (اردو) ایشور اٹوپا۔ [2] تلاش ہند ص ۲۰۱، ۲۰۳ [3] ایضاً

خلاصہ یہ کہ چین اور ان تمام ممالک کے پاس (جو بودھ مت کے پیرو تھے) دنیا کے لئے کوئی پیغام نہیں تھا جس کی روشنی میں دنیا اپنے مسائل کا حل تلاش کر سکتی، اور خدا کا سیدھا راستہ پاتی، اہلِ چین متمدن دنیا کے بالکل مشرقی کنارہ پر اپنی علمی اور مذہبی میراث کو سینہ سے لگائے بیٹھے تھے، جس میں نہ خود وہ کسی اضافہ کے خواہشمند تھے اور نہ دوسروں کے ذخیرہ میں اضافہ کرنے کے اہل تھے۔

وسط ایشیا کی قومیں

مشرق اور وسط ایشیا کی دوسری قومیں (مغل، ترک، جاپانی) وغیرہ بگڑے ہوئے بودھ مت اور وحشیانہ بُت پرستی کے درمیان تھیں، نہ کوئی علمی دولت اُن کے پاس تھی، اور نہ سیاست کا کوئی ترقی یافتہ نظام ان کے یہاں تھا، دراصل یہ قومیں اپنے عبوری دور میں تھیں، جاہلانہ بُت پرستی سے نکل کر تمدن کی طرف آ رہی تھیں، اور چند قومیں ایسی بھی تھیں، جو اس وقت تک شہریت اور زندگی کی ابتدائی منزل میں تھیں، اور عقلی و تمدنی حیثیت سے ان کا دورِ طفولیت تھا۔

ہندوستان، مذہبی، اجتماعی اور اخلاقی نقطہ نظر سے

ہندوستان کے مؤرخین کا اس نقطہ پر اتفاق ہے کہ چھٹی صدی عیسوی سے جو زمانہ شروع ہوتا ہے، وہ مذہبی، اجتماعی اور اخلاقی لحاظ سے اس ملک کی تاریخ کا (جو کسی زمانہ میں علم و تمدن اور اخلاقی تحریکات کا مرکز رہا ہے) پست ترین دور تھا، ہندوستان کے اردگرد دوسرے ممالک میں جو اجتماعی اور اخلاقی انحطاط رونما تھا، اس میں یہ ملک کسی سے پیچھے نہ تھا، اس کے علاوہ بھی کچھ خصوصیات تھیں، جن میں اس ملک کو شانِ یکتائی حاصل تھی، ان خصوصیات کو تین عنوانات

کے ذیل میں بیان کیا جا سکتا ہے (۱) معبودوں کی حد سے بڑھی ہوئی کثرت (۲) جنسی خواہشات کی بحرانی کیفیت (۳) طبقاتی تقسیم اور معاشرتی امتیازات۔

نت نئے دیوتا

چھٹی صدی عیسوی میں بت پرستی پورے عروج پر تھی، وید میں دیوتاؤں کی تعداد ۳۳ تھی، اس صدی میں ۳۳ تینتیس کروڑ ہو گئی، اس عہد میں ہر پسندیدہ شئے ہر کشش رکھنے والی اور زندگی کی کوئی ضرورت پوری کرنے والی چیز دیوتا بن گئی تھی جس کی پوجا کی جاتی تھی، اس طرح بتوں اور مجسموں، دیوتاؤں اور دیویوں کا کوئی شمار نہ تھا، ان دیوتاؤں اور قابلِ پرستش اشیاء میں معدنیات و جمادات، اشجار و نباتات، پہاڑ اور دریا، حیوانات، حتیٰ کہ آلات تناسل سب ہی شامل تھے، اس طرح یہ قدیم مذہب، افسانوی روایات اور عقائد و عبادات کا ایک دیومالا بن کر رہ گیا، ڈاکٹر گستاولی بان "تمدن ہند" میں لکھتا ہے:۔

> "دنیا کی تمام اقوام میں ہندو کے لئے پرستش میں ظاہری صورت کا ہونا لازمی ہے، اگرچہ مختلف ازمنہ میں مذہبی اصلاح کرنے والوں نے ہندو مذہب میں توحید کو ثابت کرنا چاہا ہے لیکن یہ کوشش بالکل بے فائدہ ہے، ہندو کے نزدیک کیا ویدی زمانہ میں اور کیا اس وقت ہر چیز خدا ہے جو کوئی چیز اس کی سمجھ میں نہ آئے یا جس سے وہ مقابلہ نہ کر سکے، اس کے نزدیک پرستش کے لائق ہے، برہمنوں اور فلسفیوں کی نہ صرف کل کوششیں جو انھوں نے توحید قائم کرنے کے لئے کیں بلکہ کل وہ کوششیں بھی جو وہ دیوتاؤں کی تعداد گھٹا کر تین پر لانے کے لئے عمل میں لائے محض بیکار اور رائیگاں گئیں، عوام الناس نے ان کی تعلیم کو سنا اور قبول کیا لیکن عملاً یہ تین خدا تعداد میں بڑھتے گئے اور ہر ایک چیز بیا

ہر ایک رنگ بو میں اُن کے اوتار نظر آنے لگے[1]

چھٹی ساتویں صدی میں بُت سازی کے فن نے بڑی ترقی کی، اس عہد میں فن اپنے کمال کو پہونچ گیا تھا، سارے ملک میں بُت پرستی کا دور دورہ تھا حتیٰ کہ بودھ مت اور جینی مذہب کو بھی مذاق عام کا ساتھ دینا پڑا اور اپنی زندگی اور مقبولیت کو قائم رکھنے کے لئے اسی روش کو اختیار کرنا پڑا۔ بت پرستی کے اس عروج اور مورتیوں اور مجسّموں کی کثرت کا اندازہ چینی سیاح ہوئن سیانگ (جس نے ۶۳۰ء اور ۶۴۴ء کے درمیان ہندوستان کی سیاحت کی ہے) کے اس بیان سے ہو سکتا ہے جس میں اس نے راجہ ہرش (۶۰۶-۶۴۷ کے) جشن کی کیفیت سنائی ہے، ہوئن سیانگ لکھتا ہے:-

"راجہ ہرش نے قنوج میں علمائے مذہب کا مجمع کرایا، کوئی پچاس ہاتھ اونچے مینار پر گوتم بدھ کی طلائی مورت نصب کی گئی تھی، اس کی دوسری چھوٹی مورت کا بڑی دھوم دھام سے جلوس نکالا گیا جس میں ہرش نے سکر دیوتا کے لباس میں چتر برداری کی اور اس کے حلیف راجہ دائی کامروپ نے مگس رانی کی"[2]

ہوئن سیانگ نے ہرش کے خاندان یا درباریوں کے متعلق لکھا ہے کہ کوئی تو شیو کا پرستار تھا، اور کوئی بودھ مت کا پیرو ہو گیا تھا بعض لوگ سورج کی پوجا کرتے تھے بعض وشنو کی ہر شخص آزاد تھا کہ جس دیوی دیوتا کو چاہے اپنی پرستش کے لئے مخصوص کرے اور چاہے تو سب کی پوجا کرے[3]۔

جنسی بحران

شہوانی جذبات اور جنسی (SEXUAL) میلان کو ابھارنے والے عناصر مذہبی صورت میں جس قدر ہندوستان کے قدیم مذہب و تمدن میں ہیں کسی دوسرے ملک میں نہیں پائے جاتے،

---

[1] تمدن ہند ص۲۴۰-۲۴۱ [2] ہوئن سیانگ کا سفرنامہ "فوکوئی کی" (مغربی سلطنت) [3] ایضاً

ملک کی مقدس کتابوں اور مذہبی حلقوں نے اہم واقعات، حوادث کے وقوع اور موجودات کے وجود کی توجیہ کے سلسلہ میں دیویوں اور دیوتاؤں کے باہم اختلاط اور بعض اونچے گھرانوں پر ان کی توجہات کے بعض ایسے واقعات اور روایتیں بیان کی ہیں، جن کو سن کر آنکھیں نیچی اور پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے، ان حکایتوں کا سادہ لوح اہلِ مذہب پر جو بڑے اخلاص اور جوشِ ایمانی کے ساتھ ان کہانیوں کو دہراتے ہیں، جو کچھ اثر پڑ سکتا ہے، اس کا قیاس کرنا کچھ مشکل نہیں، ظاہر ہے کہ ان کے اعصاب اور جذبات پر یہ روایتیں غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوں گی، اس کے علاوہ بڑے دیوتا (شیو) کے آلۂ تناسل (لنگم) کی پوجا ہوتی تھی، اور بچے، جوان، مرد عورت سب اس میں شریک ہوتے تھے، ڈاکٹر گستاولی بان اس کی اہمیت اور اس کے ساتھ اہلِ ہند کے شغف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

> "ہندوؤں کو مورتوں اور ظاہری علامات سے بے انتہا اُنس ہے، ان کا کوئی مذہب کیوں نہ ہو اس کے اعمال کو یہ نہایت اہتمام سے بجالاتے ہیں، ان کے مندر پرستش کی چیزوں سے بھرے ہوئے ہیں، جن میں سب سے مقدم لنگم اور یونی ہیں، جن سے مراد مادۂ خلقت کے دونوں جزو ہیں، اشوک کے ستونوں کو بھی عام ہندو لنگم خیال کرتے ہیں، اور اسطوانہ اور مخروطی شکلیں ان کے نزدیک واجب التعظیم ہیں"[1]

بعض مورخین کا بیان ہے کہ ایک مذہبی فرقہ کے مرد برہنہ عورتوں کی اور عورتیں برہنہ مردوں کی پرستش کرتے تھے[2]، مندروں کے محافظ و منتظم بداخلاقی کا سرچشمہ تھے، اور بہت سی عبادت گاہیں اخلاقی جرائم (CORRUPTION) کا مرکز تھیں، راجاؤں کے محل اور بادشاہوں کے درباروں میں بے تکلف شراب کا دور چلتا اور سرمستی میں اخلاقی حدود برقرار نہ رہتے۔

---

[1] تمدن ہند ص ۴۴۱ [2] ستیارتھ پرکاش (دیانند سرسوتی) ص ۳۴۴

اس تن پروری و نفس پرستی کے بالکل متوازی نفس کشی، ریاضت و مجاہدہ (جوگ اور تپسیا) کا سلسلہ بھی جاری تھا، جس میں حد درجہ غلو اور انتہا پسندی سے کام لیا جاتا تھا، ملک ان دونوں سروں کے درمیان اعتدال و توازن سے محروم تھا، چند افراد نفس کشی اور روحانی ترقی میں مصروف تھے، اور عام آبادی شہوانیت اور نفس پرستی کے دھارے میں بہی چلی جارہی تھی۔

طبقہ واریت

کسی قوم کی تاریخ میں اس قدر بین طبقہ واری امتیاز اور پیشوں اور زندگی کے مشغلوں کی ایسی نمٹ اور اٹل تقسیم کم دیکھنے میں آئی ہے، جیسی ہندوستان کے قدیم مذہبی و معاشرتی قانون میں ہے، ذات پات کی تفریق اور پیشہ کی جکڑ بندیوں کی ابتدا وید کے آخری زمانہ سے شروع ہو جاتی ہے، آریوں نے اپنی نسل اور اس کی خصوصیات کو محفوظ رکھنے اس ملک میں اپنی فاتحانہ حیثیت قائم رکھنے اور اپنا تفوق و برتری برقرار رکھنے کے لئے اس طبقہ واری تقسیم اور نسلی امتیاز کو ضروری سمجھا، ڈاکٹر گستاولی بان لکھتا ہے:۔

"ویدی زمانہ کے آخر میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مختلف پیشے کم و بیش آبائی ہوتے جارہے تھے، اور ذات کی تقسیم شروع ہو چکی تھی، اگرچہ تکمیل کو نہیں پہونچی تھی، ویدی آریوں کو یہ خیال پیدا ہو چکا تھا کہ وہ اپنی پرانی نسل کو اقوام مفتوحہ کے میل جول سے محفوظ رکھیں، اور جس وقت یہ قلیل التعداد فاتحین مشرق کی طرف بڑھے اور انھوں نے دیسی اقوام کے ایک بہت بڑے گروہ کو فتح کر لیا تو یہ ضرورت اور بھی زیادہ ہو گئی اور مقننوں کو اس کا لحاظ کرنا لازمی ہو گیا، نسل کے مسائل کو آریہ سمجھ چکے تھے انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ اگر کوئی قلیل التعداد فاتح قوم اپنی پوری حفاظت نہ کرے

تو وہ بہت جلد مفتوح اقوام میں کھپ جاتی ہے اور اس کا نام و نشان باقی نہیں رہتا۔[۱]

لیکن اس کو ایک مرتب و مفصل قانون کی شکل دینے کا سہرا منوجی کے سر ہے منوجی نے پیدائش مسیح سے تین سو برس پہلے (جب ہندوستان میں برہمنی تہذیب عروج پر تھی) ہندوستانی سماج کے لئے اس قانون کو مرتب کیا اور تمام اہلِ ملک نے اس کو بالاتفاق قبول کیا اور اس نے بہت جلد ملکی قانون اور ایک مذہبی دستاویز کی حیثیت اختیار کر لی، یہ وہی قانون ہے جس کو ہم آج "منو شاستر" کے نام سے جانتے ہیں۔

منو شاستر میں چار ذاتیں بیان کی گئی ہیں (۱) برہمن یعنی مذہبی پیشوا (۲) چھتری لڑنے والے (۳) ویش زراعت و تجارت پیشہ اور (۴) شودر جن کا کوئی خاص پیشہ نہ تھا، اور جو دوسری ذاتوں کے صرف خادم تھے، منو شاستر میں ہے:۔

"قادرِ مطلق نے دنیا کی بہبودی کے لئے اپنے منہ سے اور اپنے بازوؤں سے اور اپنی رانوں سے اور اپنے پیروں سے برہمن، چھتری، ویش اور شودر کو پیدا کیا۔"[۲]

"اس دنیا کی حفاظت کے لئے اس نے ان میں سے ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ فرائض قرار دیئے۔"[۳]

"برہمنوں کے لئے وید کی تعلیم اور خود اپنے لئے اور دوسروں کے لئے دیوتاؤں کے چڑھاوے دینا اور دان دینے لینے کا فرض قرار دیا۔"[۴]

"چھتری کو اس نے حکم دیا کہ خلقت کی حفاظت کرے، دان دے، چڑھاوے چڑھائے، وید پڑھے اور خواہشات نفسانی میں نہ پڑے۔"[۵]

"ویش کو اس نے یہ حکم دیا کہ مویشی کی سیوا کرے، دان دے، چڑھاوے چڑھائے،

---

[۱] تمدن ہند ص۲۱۱ [۲] منو شاستر باب اوّل ص۳۱ [۳] ایضاً ص۸۷ [۴] ایضاً ص۸۸ [۵] ایضاً ص۸۹

وید پڑھے، تجارت لین دین زراعت کرے[1]۔"

"شودر کے لئے قادر مطلق نے صرف ایک ہی فرض بنایا وہ ان تینوں کی خدمت کرنا ہے[2]۔"

اس قانون نے برہمنوں کو دوسری ذاتوں کے مقابلہ میں اتنا امتیاز اور تفوق و تقدس عطا کیا تھا کہ وہ دیوتاؤں کے ہمسر بن گئے۔ منوشاستر میں ہے:۔

"جب کوئی برہمن پیدا ہوتا ہے تو وہ دنیا میں سب سے اعلیٰ مخلوق ہے، وہ بادشاہ ہے کل مخلوقات کا اور اس کا کام ہے شاستر کی حفاظت[3]۔"

"جو کچھ اس دنیا میں ہے برہمن کا مال ہے چونکہ وہ خلقت میں سب سے بڑا ہے، کل چیزیں اسی کی ہیں[4]۔"

"برہمن کو ضرورت ہو تو وہ بلا کسی گناہ کے اپنے غلام شودر کا مال بہ جبر لے سکتا ہے، اس غصب سے اس پر کوئی جرم عائد نہیں ہوتا کیوں کہ غلام صاحب جائداد نہیں ہو سکتا، اس کی کل املاک مالک کا مال ہے[5]۔"

"جس برہمن کو رگ وید یاد ہے وہ بالکل گناہ سے پاک ہے، اگرچہ وہ تینوں عالم کو ناس کیوں نہ کردے یا کسی کا بھی کھانا کیوں نہ کھائے[6]۔"

"بادشاہ کو کیسی ہی سخت ضرورت ہو اور وہ مرتا بھی ہو تو بھی اسے برہمنوں سے محصول نہ لینا چاہئے اور نہ اپنے ملک کے کسی برہمن کو بھوک سے مرنے دینا چاہئے[7]۔"

"سزائے موت کے عوض میں برہمن کا صرف سر مونڈا جائے گا لیکن اور ذات کے لوگوں کو سزائے موت دی جائے گی[8]۔"

---

[1] منوشاستر، باب اوّل ص۹۰ [2] ایضاً ص۹۱ [3] ایضاً ص۹۹ [4] ایضاً ص۱۰۰

[5] ایضاً باب ہشتم ص۴۱۷ [6] ایضاً باب نہم ص۲۶۲ [7] ایضاً باب ہفتم ص۱۳۳ [8] ایضاً باب ہشتم ص۳۷۹

اس قانون میں چھتری اگرچہ ویش اور شودر کے مقابلہ میں بلند ہیں لیکن برہمنوں کے مقابلہ میں وہ بھی ہیچ ہیں، منو لکھتے ہیں:۔

"دس سال کی عمر کا برہمن اور سو سال کی عمر کا چھتری گویا آپس میں باپ بیٹے کا رشتہ رکھتے ہیں لیکن ان دونوں میں برہمن باپ ہے"[1]

بد قسمت شودر

باقی رہے اچھوت شودر تو وہ ہندوستانی سماج میں اس شہری و مذہبی قانون کی رو سے جانوروں سے پست درجے کے اور کتوں سے زیادہ ذلیل تھے، منو شاستر میں ہے:۔

"برہمن کی خدمت کرنا شودر کے لئے نہایت قابلِ تعریف بات ہے اور اس کے سوا کسی اور چیز سے اُسے اور کوئی اجر نہیں مل سکتا"[2]

"شودر کو اگر موقع ملے تو اسے نہیں چاہیئے کہ مال و دولت جمع کرے کیونکہ شودر دولت جمع کرکے برہمنوں کو دکھ دیتا ہے"[3]

"اگر شودر دوجوں پر ہاتھ یا لکڑی اُٹھائے تو اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے گا اور اگر وہ غصہ میں لات مارے تو اس کا پیر کاٹ ڈالا جائے گا"[4]

"اگر کوئی شودر کسی دوج کے ساتھ ایک ہی جگہ بیٹھنا چاہے تو بادشاہ کو چاہیئے کہ اس کے سُرین کو دغوا دے اور اسے ملک بدر کردے یا اس کے سُرین کو زخمی کرا دے"[5]

"اگر کوئی شودر کسی برہمن کو ہاتھ لگائے یا گالی دے تو اس کی زبان تالو سے کھینچ لی جائے اگر اس کا دعویٰ کرے کہ اس کو وہ تعلیم دے سکتا ہے تو کھولتا ہوا تیل اس کو پلایا جائے"[6]

---

[1] منو شاستر، باب دوم ص ۱۳۵ [2] ایضاً باب نہم ص ۱۲۹ [3] ایضاً [4] ایضاً باب ہشتم ص ۲۸۰ [5] ایضاً ص ۲۸۱ [6] ایضاً

"کتے، بلی، مینڈک، چھپکلی، کوے، اُلو اور شودر کے مارنے کا کفارہ برابر ہے"[1]

ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت

برہمنی زمانہ اور تہذیب میں عورت کا وہ درجہ نہیں رہا تھا، جو ویدی زمانہ میں تھا منو کے قانون میں (بقول ڈاکٹر لی بان) عورت ہمیشہ کمزور اور بے وفا سمجھی گئی ہے' اور اس کا ذکر ہمیشہ حقارت کے ساتھ آیا ہے[2]۔

شوہر مرجاتا تو عورت گویا جیتے جی مرجاتی اور زندہ درگور ہوجاتی' وہ کبھی دوسری شادی نہ کرسکتی، اس کی قسمت میں طعن و تشنیع اور ذلت و تحقیر کے سوا کچھ نہ ہوتا، بیوہ ہونے کے بعد اپنے متوفی شوہر کے گھر کی لونڈی اور دیوروں کی خادم بن کر رہنا پڑتا، اکثر بیوائیں اپنے شوہروں کے ساتھ ستی ہوجاتیں' ڈاکٹر لی بان لکھتا ہے "بیواؤں کو اپنے شوہروں کی لاش کے ساتھ جلانے کا ذکر منو شاستر میں نہیں ہے' لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم ہندوستان میں عام ہوچلی تھی، کیونکہ یونانی مؤرخین نے اس کا ذکر کیا ہے[3]"۔

غرض یہ سرسبز و شاداب ملک جو فطرت کے خزانوں سے مالا مال تھا، سچے آسمانی مذہب کی تعلیمات سے عرصہ سے محروم ہونے اور مذہب کے مستند ماخذوں کے گم ہوجانے کی وجہ سے قیاسات و تحریفات کا شکار اور رسوم و روایات کا پرستار بنا ہوا تھا، اور اس وقت کی دنیا میں جہالت و توہم پرستی، پست درجہ کی بت پرستی، نفسانی خواہشات اور طبقہ واری ناانصافی میں پیش پیش تھا، اور دنیا کی اخلاقی و روحانی رہبری کے بجائے خود اندرونی انتشار اور اخلاقی بدنظمی میں مبتلا تھا۔

---

[1] منو شاستر [2] تمدن ہند صفحہ ۲۳۶ [3] ایضاً صفحہ ۲۳۸

عرب

دورِ جاہلیت میں عرب اپنی بعض فطری صلاحیتوں اور بعض عادات و اخلاق میں تمام دنیا میں ممتاز تھے، فصاحت و بلاغت اور قادر الکلامی میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا، آزادی و خودداری ان کو جان سے زیادہ عزیز تھی، شہسواری و شجاعت میں وہ بے بدل تھے، عقیدہ کے پُرجوش، صاف گو اور جری، حافظہ کے قوی، مساوات، بے تکلفی اور جفاکشی کے عادی، ارادہ کے پکے، زبان کے سچے، وفاداری اور امانت داری میں ضرب المثل تھے۔

لیکن انبیاءؑ اور ان کی تعلیمات سے بُعد، ایک جزیرہ نما میں صدیوں سے مقید رہنے کی وجہ سے اور باپ دادا کے دین اور قومی روایات پر سختی سے قائم ہونے کے سبب وہ دینی و اخلاقی حیثیت سے بہت گر چکے تھے، چھٹی صدی میں وہ تنزّل و انحطاط کے آخری نقطہ پر تھے، کھلی ہوئی بُت پرستی میں مبتلا اور اس میں دنیا کے امام تھے، اخلاقی و اجتماعی امراض ان کی سوسائٹی کو گھن کی طرح کھا رہے تھے، غرض مذاہب کے اکثر محاسن سے وہ محروم اور جاہلی زندگی کی بدترین خصوصیتوں اور معائب میں مبتلا تھے۔

دَورِ جاہلیت کے بُت

جہالت و جاہلیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی پرستش کا عقیدہ مقبول و عام، اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و ربوبیت کا تصور کمزور اور خواص میں محدود ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ پوری قوم بُتوں، اور مورتیوں کی (جن کو کسی زمانہ میں شفیع اور واسطہ یا مرکزِ توجہ بنانے کے لئے اختیار کیا گیا تھا) صاف صاف پرستش میں مشغول ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ سے (جس کا

خالق کائنات اور رب الأرباب کی حیثیت سے اب بھی اقرار تھا[۱]) عملاً و قلباً تعلق منقطع ہو کر دوسرے معبودوں اور بتوں سے قائم ہو گیا تھا، اور عبودیت و بندگی کے اظہار کے طریقے اور اعمال (سجدہ، قربانی، حلف دعا و استعانت) انھیں کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گئے تھے، اور ملک میں کھلی بت پرستی، خدا سے بے تعلقی اور صریح شرک کا دور دورہ تھا۔[۲]

عرب میں ہر ہر قبیلہ، ہر ہر شہر اور ہر ہر علاقہ کا ایک خاص بُت تھا، بلکہ ہر گھر کا بُت جدا تھا، کلبی کا بیان ہے کہ مکہ مکرمہ کے ہر گھر کا ایک بُت تھا، جس کی گھر والے پرستش کرتے تھے، جب کوئی شخص سفر کا ارادہ کرتا تو روانگی کے وقت گھر پر اس کا آخری کام یہ ہوتا کہ اپنے بُت کو حصولِ برکت کے لئے چھوتا اور جب سفر سے واپس آتا تو گھر پہونچ کر پہلا کام یہ کرتا کہ اپنے بُت کو تبرکاً ہاتھ لگاتا[۳] بتوں کے بارے میں بڑا غلو اور انہماک تھا کسی نے تو ایک بُت خانہ بنا رکھا تھا کسی نے بُت تیار کر لیا تھا، جو بُت خانہ نہیں بنا سکتا تھا، یا بت نہیں تیار کر سکتا تھا، وہ حرم کے سامنے ایک پتھر گاڑ دیتا یا حرم کے علاوہ جہاں بہتر سمجھتا پتھر گاڑ کر اس کے ارد گرد اس شان سے طواف کرتا جس طرح بیت اللہ کے گرد طواف کیا جاتا ہے، ان پتھروں کو وہ انصاب کہا کرتے تھے،[۴] خود خانہ کعبہ کے اندر (وہ خانہ کعبہ جو صرف اللہ کی عبادت کے لئے بنایا گیا تھا) اور اس کے صحن میں ۳۶۰ بُت تھے[۵]، بتوں اور دیوتاؤں کی پوجا کرتے کرتے یہ لوگ اس حد تک بڑھ گئے کہ پتھر کی قسم سے جو کچھ مل جاتا اس کو پوجتے، بخاری میں ابورجاء العطاردی سے روایت ہے کہ ہم لوگ

---

[۱] وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ [۲] عرب جاہلیت کے عقائد کی حقیقت اور مشرکانہ عقیدہ کے تدریجی ارتقا کو معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو شامی فاضل محمد عزت دروزہ کی کتاب "بيئة النبي صلى الله عليه وسلم من القرآن" (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا وطن اور ماحول قرآن کی روشنی میں۔)

[۳] کتاب الاصنام ص۳۳ [۴] ایضاً [۵] صحیح بخاری کتاب المغازی باب فتح مکہ۔

پتھر کو پوجتے تھے اگر کوئی اس سے اچھے قسم کا پتھر مل جاتا تو اس کو پھینک کر اس نئے پتھر کو لے لیتے اور اگر پتھر نہ پاتے تو مٹی کا ایک ڈھیر بناتے اور اس پر بکری کو لا کر دوہتے پھر اسی کا طواف کرتے[۱] کلبی کا بیان ہے کہ کوئی شخص سفر میں کسی نئے مقام پر اترتا تو چار پتھر لے آتا جو پتھر اس کو اچھا معلوم ہوتا اس کو معبود قرار دیتا اور باقی تین پتھروں کو اپنی ہانڈی کا پتھر بناتا اور جب وہاں سے جاتا تو سب پتھروں کو چھوڑ جاتا۔[۲]

معبودوں کی کثرت

مشرکوں کا ہر زمانہ اور ہر ملک میں جو حال رہا ہے وہی حال عرب کا تھا، ان کے متعدد اور مختلف معبود تھے، جن میں فرشتے، جن، ستارے سب شامل تھے، فرشتوں کے بارہ میں ان کا عقیدہ تھا کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، اس لئے ان سے شفاعت کے طلبگار رہتے، ان کی پرستش کرتے اور ان کو وسیلہ بناتے جنوں کو اللہ کا شریک کار سمجھتے، ان کی قدرت اور اثر اندازی پر ایمان رکھتے اور ان کی پرستش کرتے۔[۳]

کلبی کا بیان ہے کہ قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ بنو ملیح تھی جو جنوں کو پوجتی تھی[۴]، صاعد کی روایت ہے کہ قبیلہ حمیر آفتاب کی پرستش کرتا، کنانہ کا قبیلہ چاند کا پرستار تھا، بنو تمیم دبران کی لخم و جذام مشتری کی قبیلہ طے سہیل کی، بنو قیس شعریٰ کی اور بنو اسد عطارد کی پرستش کرتا تھا۔[۵]

اخلاقی و اجتماعی امراض

اخلاقی اعتبار سے ان کے اندر بہت سی بیماریاں اور امراض گھر کئے ہوئے تھے، اور

---

[۱] صحیح بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ [۲] کتاب الاصنام [۳] ایضاً ص۳۳

[۴] ایضاً ص۳۴ [۵] طبقات الامم (صاعد اندلسی) ص۴۳

اس کے اسباب واضح ہیں، شراب عام طور سے پی جاتی تھی، اور ان کی گھٹی میں پڑی تھی، اس کا تذکرہ ان کی ادبیات اور شاعری کی بہت بڑی جگہ کو گھیرے ہوئے ہے، عربی زبان میں اس کے نام جس کثرت سے ہیں، اور ان ناموں میں جن باریک فرقوں اور پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا ہے، اس سے اس کی مقبولیت و عمومیت کا اندازہ ہو سکتا ہے[1]، شراب کی دوکانیں برسرِ راہ تھیں اور علامت کے طور پر ان پر پھریرا لہراتا[2]، جوا جاہلی زندگی میں بڑائی اور خوبی کی بات تھی، اور اس میں شرکت نہ کرنا پست ہمتی اور مُردہ دلی کی دلیل تھی[3]، تابعی عالم قتادہ کا بیان ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص اپنے گھر بار کو داؤں پر رکھ دیتا تھا، پھر لٹا ہوا حسرت سے اپنے مال کو دوسروں کے ہاتھ میں دیکھتا اس سے نفرت و عداوت کی آگ بھڑکتی اور جنگوں کی نوبت آتی[4]۔

حجاز کے عرب اور یہودی سودی لین دین اور سود در سود کا معاملہ کرتے، اس سلسلہ میں بڑی بے رحمی اور سخت دلی کے مظاہرے ہوتے[5]، زنا کو کچھ زیادہ معیوب بات نہ سمجھا جاتا اور اس کے واقعات عربوں کی زندگی میں کمیاب نہ تھے اس کے بہت سے اقسام اور طریقے رائج تھے، زنانِ بازاری اور پیشہ ور عورتوں کے اڈے بھی موجود تھے، اور شراب خانوں میں بھی اس کا انتظام تھا[6]۔

عورت کا درجہ

جاہلی معاشرہ میں عورت کے ساتھ ظلم و بدسلوکی عام طور سے روا سمجھی جاتی تھی، اس کے

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب المخصص (ابن سیدہ) الخمر ج ۱۱ ص ۷۲ تا ۸۲ [2] سبع معلقات معلقہ شعر قد بت سامرھا الخ

[3] دیوان الحماسہ قصیدہ جحر بن خالد شعر و اذا اھلکت فلا تریدی ملجزا. الخ [4] ملاحظہ ہو تفسیر طبری تفسیر آیت اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطَانُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ، [5] تفسیر طبری ج ۴ ص ۵۹-۶۹

[6] ملاحظہ ہو العقد الفرید کتاب اخبار زیاد (ابن عبد ربہ)

حقوق پامال کئے جاتے، اس کا مال مرد اپنا مال سمجھتے وہ ترکہ اور میراث میں کچھ حصہ نہ پاتی شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد اس کو اجازت نہیں تھی کہ اپنی پسند سے دوسرا نکاح کرسکے[1]، دوسرے سامان اور حیوانات کی طرح وہ بھی وراثت میں منتقل ہوتی رہتی تھی[2]، مرد تو اپنا پورا پورا حق وصول کرتا لیکن عورت اپنے حقوق سے مستفید نہیں ہوسکتی تھی، کھانے میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں، جو مردوں کے لئے خاص تھیں، اور عورتیں ان سے محروم تھیں[3]۔

لڑکیوں سے نفرت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ انھیں زندہ درگور کرنے کا بھی رواج تھا؛ ہیثم بن عدی نے ذکر کیا ہے کہ زندہ درگور کرنے کا اصول عرب کے تمام ہی قبائل میں رائج تھا، ایک اس پر عمل کرتا تھا، دس چھوڑتے تھے، یہ سلسلہ اس وقت تک رہا جب تک کہ اسلام نہیں آیا[4]، بعض ننگ وعار کی بنا پر بعض خرچ ومفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرتے، عرب کے بعض شرفاء ورؤساء ایسے موقعہ پر بچوں کو خرید لیتے اور ان کی جان بچاتے[5]، صعصعہ بن ناجیہ کا بیان ہے کہ اسلام کے ظہور کے وقت تک میں تین سو زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کو فدیہ دے کر بچا چکا تھا[6]، بعض اوقات کسی سفر یا مشغولیت کی وجہ سے لڑکی سیانی ہوجاتی اور دفن کرنے کی نوبت نہ آتی جاہلی باپ دھوکہ دے کر اس کو لیجاتا اور بڑی بے دردی سے اس کو زندہ درگور کر آتا، اسلام لانے کے بعد بعض عربوں نے اس سلسلہ کے بڑے اندوہناک اور رقت انگیز واقعات بیان کئے ہیں[7]۔

قبائلی وخاندانی عصبیت وامتیاز

قبیلے اور رشتہ داریوں کی بنیاد پر عصبیت اور جتھہ بندی عرب میں بڑی سخت تھی، اس عصبیت کی

---

[1] سورۃ البقرہ آیت ۲۳۲ [2] سورۃ النساء آیت ۱۹ [3] سورۃ الانعام آیت ۱۴۰ [4] میدانی [5] ملاحظہ ہو بلوغ الارب فی احوال العرب الوسی [6] کتاب الاغانی [7] ملاحظہ ہو سنن الدارمی ج ۱ باب ماکان علیہ الناس قبل مبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الجھل والضلالہ ص۳

بنیاد جاہلی مزاج تھا جس کی روح اس مشہور جملہ سے ظاہر ہوتی ہے " اُنصر اخاک ظالماً او مظلوماً"
یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، چنانچہ وہ اپنے حلیف اور بھائی کی ہر حال
میں مدد کرنا ضروری سمجھتے تھے، خواہ وہ برسرِ حق ہو یا برسرِ باطل۔

عربی معاشرہ مختلف طبقات اور الگ الگ حیثیت کے خاندانوں اور گھرانوں پر مشتمل تھا،
ایک خاندان دوسرے سے اپنے کو بلند و برتر سمجھتا تھا، بعض خاندان دوسرے خاندانوں یا عام
انسانوں کے ساتھ بہت سی رسوم و عادات میں شرکت پسند نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ حج کے
بعض مناسک میں قریش عام حجاج سے الگ تھلگ اور ممتاز رہتے تھے، وہ عرفات میں عام لوگوں کے
ساتھ ٹھہرنا عار کی بات سمجھتے تھے آنے جانے میں پیش قدمی کرتے تھے[1]، ایک طبقہ پیدائشی آقاؤں کا
تھا، ایک طبقہ کم حیثیت لوگوں کا جس سے بیگار لیا جاتا اور کام پر لگایا جاتا کچھ عوام اور بازاری لوگ تھے۔

جنگجو فطرت

عرب فطرۃً جنگجو واقع ہوئے تھے، اور ان کی صحرائی اور غیر متمدن زندگی کا تقاضا بھی یہی تھا،
جنگ ان کے لئے زندگی کی ایک ضرورت سے آگے بڑھ کر تفریح اور دل لگی کا سامان بن گئی تھی جس کے
بغیر ان کا جینا مشکل تھا، ایک شاعر فخریہ کہتا ہے کہ اگر ہم کو کوئی حریف قبیلہ نہیں ملتا تو اس خواہش
کی تسکین کے لئے ہم اپنے برادر و حلیف قبیلہ پر حملہ کر دیتے ہیں[2]، ایک عرب شاعر دعا کرتا ہے کہ میرا
گھوڑا سواری کے قابل ہو جائے تو اللہ قبائل میں جنگ کی آگ بھڑکا دے تاکہ مجھے اپنے گھوڑے
اور اپنی تلوار کے جوہر دکھانے کا موقع ملے[3]۔

---

[1] سورۃ البقرہ آیت ۱۹۹ [2] واحیانا علی بکر اخینا ۔ اذا ما لم نجد الا أخانا (حماسہ)

[3] اذا المهرة الشقراء ادرك ظهرها ۔ فشب الاله الحروب بين القبائل (حماسہ)

جنگ کرنا اور خون بہانا ان کے لئے معمولی کام تھا جنگ کو بھڑکانے کے لئے معمولی واقعات کافی تھے، وائل کی اولاد بکر و تغلب کے درمیان چالیس سال تک جنگ جاری رہی جس میں پانی کی طرح خون بہا، ایک عرب سردار مہلہل نے اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ "دونوں خاندان مٹ گئے، ماؤں نے اپنی اولاد کھوئی بچے یتیم ہوئے، آنسو خشک نہیں ہوتے، لاشیں دفن نہیں کی جاتیں"[۱] پورا جزیرۂ عرب گویا شکاری کا جال تھا، کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ کہاں لوٹ لیا جائے گا اور کب دھوکہ سے قتل کر دیا جائے گا، لوگ قافلوں میں اپنے ساتھیوں کے درمیان سے اُچک لئے جاتے تھے، یہاں تک کہ عظیم الشان سلطنتوں کو اپنے قافلوں اور سفارتوں کے لئے چوکی پہرہ اور مضبوط بدرقہ اور قبائل کے سرداروں کی ضمانت کی ضرورت پڑتی تھی[۲]

دنیا کا عمومی جائزہ

ایک انگریز سیرت نگار آر وی سی بوڈلے R. V. C. BODLEY اپنی کتاب "پیغامبر" (THE MESSENGER) میں زمانۂ بعثت کی دنیا کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے اس وقت کے قابل ذکر ممالک و اقوام کا تذکرہ کرتا ہے:۔

"قدیم روایات کے باوجود چھٹی صدی عیسوی کی اس دنیا میں عربوں کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی حقیقت میں تو کسی کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی، یہ ایک نزاع کا دور تھا، جب کہ مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا کی عظیم سلطنتیں اوّل ہی تباہ ہو چکی تھیں یا اپنے شاہی دور کے اختتام پر تھیں یہ ایک ایسی دنیا تھی جو اب بھی یونان کی فصاحت ایران کی عظمت اور روما کی شوکت و جلال سے متحیر تھی اور کوئی ایسی ایک شئے یا کوئی ایسا

---

[۱] ملاحظہ ہو کتاب "ایام العرب"   [۲] ملاحظہ ہو تاریخ طبری۔ ج ۲ ص ۱۳۳

ایک مذہب بھی نہ تھا جو ان میں سے کسی کی جگہ لیتا۔

یہودی تمام دنیا میں مارے مارے پھر رہے تھے، ان کو کوئی مرکزی رہنمائی حاصل نہ تھی، حالات کے مطابق یا تو ان کو محض برداشت کیا جاتا یا اذیتیں دی جاتیں، کوئی ملک اُن کا اپنا ذاتی نہ تھا، اور ان کا مستقبل اسی قدر غیر یقینی تھا جس طرح کہ آج ہے۔

پوپ گریگری اعظم GREGORY THE GREAT کے حلقۂ اثر سے باہر مسیحی اپنے سہل عقائد کے ترمیم کے پیچیدہ معانی ایجاد کر رہے تھے اور اس سلسلہ میں ایک دوسرے کا گلہ کاٹنے میں مصروف تھے۔

ایران میں تعمیر سلطنت کی صرف ایک کرن رہ گئی تھی خسرو ثانی اپنی سلطنت کی توسیع میں مصروف تھا، اس نے روما کو شکست دے کر کیپیدوشیا (CAPADOCIA) مصر و شام پر قبضہ کر لیا تھا، اس نے ۶۲۰ء میں (جب کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم بحیثیت رہنما ظاہر ہونے والے تھے) بیت المقدس کو تاراج کر کے مقدس صلیب کو چرا لیا تھا، اور دارئے اوّل کی زبردست عظمت و شوکت کو دوبارہ قائم کر دیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا مشرقِ وسطیٰ کی عظمت کو زندگی کی ایک نئی قسط مل گئی ہے، لیکن یہی نہ تھا، بازنطینی رومی اب بھی اپنی گزری ہوئی ہستی رکھتے تھے، جب خسرو اپنی فوج کو قسطنطنیہ کی فصیلوں پر لایا تو انھوں نے ایک آخری کوشش کر دکھائی۔

مشرقِ بعید میں حالات کوئی نمایاں اثرات نہیں چھوڑ رہے تھے، ہندوستان اب بھی چھوٹی چھوٹی غیر اہم ریاستوں پر مشتمل تھا، جو سیاسی اور حربی حیثیت سے ایک دوسرے پر فوقیت کے لئے جدّ و جہد میں مصروف تھیں۔

چینی ہمیشہ کی طرح آپس میں نبرد آزما تھے، خاندان سوئی آیا اور گیا اور اس کی

ہگ ڈینگ نے لی جو تین صدیوں تک حکمراں رہا۔

جاپان میں پہلی مرتبہ ایک عورت تخت نشین ہوئی، بدھ مت جڑ پکڑنے لگا تھا اور جاپانی تصورات اور مقاصد پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔

اسپین اور انگلستان غیر اہم چھوٹے چھوٹے ملک تھے، اسپین وسی گوتھوں (VISI GOTHS) کے زیر اثر تھا، جو کچھ عرصہ پہلے ہی فرانس سے جس پر انھوں نے لوائر (LOIRE) تک قبضہ کر رکھا تھا، نکالے گئے تھے، وہ ان یہودیوں پر مظالم ڈھا رہے تھے جن کو اس مسلم حملہ کے لئے جو ابھی سو برس بعد ہونے والا تھا، آسانیاں پیدا کرنی تھیں۔

جزائر برطانیہ آزاد ریاستوں میں تقسیم تھا، ڈیڑھ سو سال رومیوں کو روانہ ہوئے ہو چکے تھے، جن کی جگہ نارڈک لوگوں کی آمد نے لی تھی، خود انگلستان سات مختلف بادشاہتوں پر مشتمل تھا۔[1]



[1] ۱۸-۱۹ (باختصار) ترجمہ سید قاسم حسنی۔

زمانہ جاہلیت کا سیاسی و معاشی نظام

جاہلی دنیا کی دینی، روحانی، اخلاقی و اجتماعی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سیاسی و معاشی نقشہ پر خصوصی نظر ڈال لی جائے کہ دینی و اخلاقی اور اجتماعی ترقی و انحطاط میں سیاسی و معاشی حالات اور رائج الوقت سیاسی و معاشی تصورات اور قوانین کا بہت بڑا دخل ہے، اور وہ قومی زندگی کی تعمیر و تشکیل کا ایک اہم و فعال عنصر (FACTOR) ہے۔

مطلق العنان بادشاہت

زمانۂ جاہلیت میں خالص آمرانہ حکومت کا دور دورہ تھا، اس زمانہ کی سیاست مطلق العنان بادشاہت تھی، یہ بادشاہت اکثر مخصوص خاندانوں کی عظمت پر قائم ہوتی تھی جیسا کہ ایران میں تھا، وہاں آل ساسان کا یہ عقیدہ تھا کہ حکومت پر اُن کا موروثی حق ہے اور انھیں تائیدِ الٰہی حاصل ہے، عام رعایا کو بھی پوری کوشش کر کے اس کا یقین دلا دیا گیا تھا چنانچہ انھوں نے بھی اس اُصول کو تسلیم کر لیا تھا، اور حکومت کے بارہ میں اُن کا یہی عقیدہ ہو گیا تھا جو کبھی متزلزل نہیں ہوتا تھا۔

کبھی یہ بادشاہت محض سلاطین کی عظمت پر قائم ہوتی تھی، اہلِ چین اپنے بادشاہ کو "شہنشاہ فرزندِ آسمان" کہتے تھے، کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ آسمان "نر" ہے اور زمین "مادہ" اور کائنات کو انھیں دونوں نے جنم دیا ہے، اور شہنشاہ ختا اول زمین و آسمان کے

جوڑے کی سب سے پہلی اولاد ہے[1] اسی بنا پر شاہِ وقت کو قوم کا تنہا باپ تصور کیا جاتا تھا اس کو حق تھا کہ جو چاہے کرے، لوگ اس سے کہتے تھے کہ "آپ ہی قوم کے مائی باپ ہیں" شہنشاہ لی یان یا تائی تسنگ جب مرا ہے تو اہلِ چین نے سخت ماتم برپا کیا اور حد سے زیادہ غم کیا، کسی نے سوئیوں سے اپنا چہرہ خون آلود کیا، کسی نے اپنے بال کاٹے، کسی نے جنازہ سے اپنے کان مار مار کر زخمی کر لئے۔

کبھی بادشاہت کسی خاص گروہ یا کسی مخصوص وطن کا حق سمجھی جاتی تھی جیسا کہ مملکت روما میں اعتقاد تھا، وہاں رومی وطن اور رومی قومیت کی عظمت کرنا بنیادی قانون تھا، دوسری قومیں اور دوسرے ملک اس قومیت کے غلام تھے، ان کی حیثیت ان رگوں اور شرائین کی سی تھی جن سے خون جاری ہو کر اپنے مرکز کو پہونچتا ہے سلطنتِ روما ہر قانون اور ہر ایک کے حق کو نظر انداز کر سکتی، اور ہر ایک کی عزت و ناموس پامال کر سکتی تھی، وہ ہر ظلم و ستم کو جائز سمجھتی تھی، رومیوں کا ہم عقیدہ اور ہم مذہب ہو کر اور حکومت کے ساتھ خلوص اور وفاداری کا اظہار کر کے بھی کوئی قوم یا فرد رومیوں کے ظلم و ستم سے بچ نہیں سکتا تھا کسی قوم کو حکومت خود اختیاری یا اندرونی خود مختاری کا حق نہیں تھا، اور نہ اس کا موقع تھا کہ اپنے ملک میں اپنے واجبی حقوق سے مستفید ہو سکے، ان محکوم قوموں اور مفتوح ملکوں کی مثال اس اونٹنی کی سی تھی، جس پر بوقت ضرورت سواری کی جاتی اور اس کا دودھ دوہا جاتا اور صرف اسی قدر اس کو چارہ دیا جاتا جو اس کی پیٹھ کو مضبوط اور تھن کو دودھ سے بھرا رکھ سکے، رابرٹ بریفاٹ (ROBERT BRIFFAULT) رومی سلطنت کے بارہ میں لکھتا ہے:۔

"رومی سلطنت کی تباہی کا سبب وہاں کی بڑھی ہوئی خرابیاں (مثلاً رشوت وغیرہ)

---

[1] تاریخ چین۔ از جیمس کارکرن۔

نہ تھیں، بلکہ اصلی بُرائی اور بنیادی خرابی فساد و شر اور حقائق سے گریز کی عادت تھی جو اس سلطنت کے قیام اور نشو ونما میں پہلے ہی دن سے موجود تھی یہ خرابی سلطنت کے اندر جڑ پکڑ چکی تھی، کسی انسانی جماعت کی تعمیر جب کبھی اس طرح کی کمزور اور کج بنیاد پر کی جائے گی تو اس کے گرنے سے صرف ذہانتیں اور عملی سرگرمیاں نہیں بچا سکتیں، اور چونکہ خرابیوں ہی پر اس سلطنت کی بنیاد تھی، اس لئے اس کا خاتمہ اور زوال بھی ضروری تھا، کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ رومی سلطنت صرف ایک چھوٹے سے طبقہ کی عیش اور راحت رسانی کا ذریعہ تھی، اور جمہور عوام سے ناجائز منفعت اندوزی اور رعایا کا خون چوس کر شاہی قومیت کو غذا پہونچانا اس حکومت کا کام تھا، بلاشبہ روم میں تجارت، امانت داری اور انصاف کے ساتھ جاری تھی، اور یہ بات حکومت کی بنیادی خصوصیات میں سمجھی جاتی تھی، اور اس سے بھی انکار نہیں کہ حکومت اپنی طاقت و قابلیت میں نیز اپنے عدالتی نظام میں ممتاز تھی، لیکن یہ تمام خوبیاں حکومت کو تباہی سے نہیں بچا سکتی تھیں، اور نہ اساسی غلطیوں کے سخت انجام سے محفوظ رکھ سکتی تھیں"۔[1]

مصر و شام کی رومی حکومت

ڈاکٹر الفرڈ بٹلر ALFRED BUTLER رومی حکومت کے بارہ میں لکھتا ہے:۔

"مصر میں رومی حکومت صرف ایک ہی غرض و غایت اپنے سامنے رکھتی تھی اور وہ یہ تھی کہ جس طرح ممکن ہو رعایا سے مال لوٹ کھسوٹ کر حکام کو فائدہ پہونچایا جائے"

---

[1] ROBERT BRIFFAULT THE MAKING OF HUMANITY P. 159

رعایا کی بہبودی اور خوشحالی اور عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے کا خیال تک نہیں آتا تھا، رعایا کی تہذیب اور اخلاق کو درست کرنا اور ترقی دینا تو بڑی چیز ہے ملک کے مادی وسائل کو ترقی دینے کی بھی اس کو فکر نہ تھی، مصر پر ان کی حکومت ان پردیسیوں کی سی حکومت تھی، جو صرف اپنی طاقت پر بھروسہ کرتی ہے اور محکوم قوم کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے تک کی بھی ضرورت نہیں سمجھتی"[1]

ایک عرب شامی مؤرخ شام میں رومی حکومت کے بارہ میں کہتا ہے:۔

"ابتدا میں رومیوں کا شامیوں کے ساتھ اچھا اور منصفانہ برتاؤ تھا، اگرچہ ان کی سلطنت میں اندرونی طور پر خلفشار رہا، لیکن جب ان کی حکومت بوڑھی ہو گئی تو اس نے بدترین قسم کی غلامی کی شکل اختیار کر لی اور بدترین معاملہ جو غلام اور رعیت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے اس نے اپنی محکوم رعایا کے ساتھ کیا، روم نے براہ راست شام کا بھی الحاق نہیں کیا اور شام کے باشندوں کو کبھی بھی رومیوں کی طرح شہری حقوق نہیں حاصل ہوئے، نہ ان کے ملک کو رومی سلطنت اور سرزمین کا درجہ ملا، شامی ہمیشہ غریب الوطن افراد کی طرح رعایا بن کر رہے، اکثر سرکاری ٹیکس ادا کرنے کے لئے اپنی اولاد کو بیچ دینے پر مجبور ہوتے، مظالم کی زیادتی تھی غلام بنانے اور بیگار لینے کا عام رواج تھا، اسی بیگار سے رومی حکومت نے وہ ادارے اور کارخانے تعمیر کئے جو رومیوں کا کارنامہ سمجھے جاتے ہیں"[2]

"رومیوں نے شام پر سات سو سال تک حکومت کی، ان کے آتے ہی ملک میں اختلافات، خودسری اور تکبر کی بنیاد پڑ گئی تھی، اور قتل کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا،

[1] ARAB'S CONQUEST OF EGYPT AND THE LAST THIRTY YEARS OF THE ROMAN DOMINION P. 42

[2] خطط الشام (محمد کرد علی) ج ۱ ص ۱۰۱

یونانیوں نے شام پر ۳۶۹ سال حکومت کی، اس پورے عہد حکومت میں بڑی سخت جنگیں ہوئیں رعایا پر مظالم ہوئے اور یونانیوں کے حرص و ہوس کی پوری کیفیت کھل کر ظاہر ہوگئی، شامی قوم پران کی سلطنت بدترین نحوست اور سخت ترین عذاب تھی۔"[1]

خلاصہ یہ کہ بدیسی سامراج کے ہاتھوں روم و ایران کے ممالک انتہائی تکلیف و مصیبت میں تھے، اور سیاسی، مالی، اقتصادی ہر لحاظ سے ملک کے تمام مرکز اور دارالسلطنت حد درجہ ابتری کی حالت میں تھے۔

ایران میں خراج اور ٹیکس وصول کرنے کا نظام

ایران میں سیاسی و معاشی نظام نہ عادلانہ تھا نہ مستحکم، بلکہ اکثر حالات میں بہت ہی ناہموار اور ظالمانہ تھا خراج اور ٹیکس وصول کرنے والے عملہ کے اخلاق، ان کی خواہشات اور ملک کے جنگی اور سیاسی حالات کے مطابق یہ نظام بدلتا رہتا، "ایران بعہد ساسانیان" کا مؤلف لکھتا ہے:۔

"خراج اور ٹیکس کے لگانے اور وصول کرنے میں محصلین خیانت اور استحصال بالجبر کے مرتکب ہوتے تھے، چونکہ مالیات کی رقم سال بسال مختلف ہوتی رہتی تھی، یہ ممکن نہ تھا کہ سال کے شروع میں آمدنی اور خرچ کا تخمینہ ہوسکے علاوہ اس کے ان چیزوں کو ضبط میں رکھنا بھی بہت مشکل تھا، بسا اوقات نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ادھر تو جنگ چھڑ گئی ادھر روپیہ ندارد، ایسی حالت میں پھر غیر معمولی ٹیکسوں کا لگانا ضروری ہوجاتا تھا اور تقریباً ہمیشہ اس کی زد مغرب کے الدار صوبوں خصوصاً بابل پر پڑتی تھی۔"[2]

شاہی خزانے اور ذاتی دولت

پبلک کے فائدے کے لئے جتنا روپیہ شاہی خزانے سے خرچ ہوتا تھا، وہ کچھ زیادہ تھا،

---

[1] خطط الشام (محمد کرد علی) ج ۱ ص ۱۰۳
[2] ایران بعہد ساسانیان ص ۱۹۳

شاہانِ ایران کے یہاں ہمیشہ یہ دستور رہا کہ جہاں تک ممکن ہوتا اپنے خزانہ میں نقد روپیہ اور قیمتی اشیاء جمع کرتے[1] خسرو دوم نے ۶۰۷-۶۰۸ء میں طیقون (مدائن) میں اپنے خزانہ کو نئی عمارت میں منتقل کیا تو اس میں چھیالیس کروڑ اسی لاکھ (۴۶۸۰۰۰۰۰۰) مثقال سونا تھا یعنی تقریباً سینتیس[2] کروڑ پچاس لاکھ فرانک طلائی (چار ارب اڑسٹھ کروڑ روپئے) حکومت کے تیرھویں سال کے بعد اس کے خزانہ میں اسی کروڑ مثقال وزن کا سونا تھا[5] خسرو دوم کے تاج میں ۱۲۰ پونڈ (یعنی ڈیڑھ من) خالص سونا تھا[3]

طبقاتی تفاوت

ایران کی قومی زندگی میں دولت و خوشحالی مخصوص افراد کے اندر محدود تھی معدودے چند اشخاص نہایت دولت مند تھے، باقی نہایت تنگدست اور پریشان حال، ایرانی تاریخ میں نوشیروان کا زمانہ حُسنِ انتظام اور عدل گستری کے لئے ضرب المثل ہے "ایران بعہد ساسانیان" کا مصنف اس عہد کے متعلق لکھتا ہے:۔

"خسرو (نوشیرواں) کی مالی اصلاحات میں بیشک رعایا کی نسبت خزانے کے مفاد کو زیادہ ملحوظ رکھا گیا تھا عوام الناس اسی طرح جہالت و عُسرت میں زندگی بسر کر رہے تھے، جیسا کہ زمانۂ سابق میں، باز نطینی فلسفی جو شہنشاہ کے یہاں آکر پناہ گزیں ہوئے تھے،

---

[1] ایران بعہد ساسانیان ص۶۲۳ [2] ایضاً ص۶۳۲ [3] ایضاً ص۶۱۱ [5] تاج جو سونے اور چاندی کا بنا ہوا، اور زمرد، یاقوت اور موتیوں سے مرصّع تھا، بادشاہ کے سر کے اوپر چھت سے ایک سونے کی زنجیر کے ذریعہ سے لٹکا رہتا تھا جو اس قدر باریک تھی کہ جب تک تخت کے بالکل قریب آکر نہ دیکھا جاتا نظر نہیں آتی تھی اگر کوئی شخص دور سے دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ تاج بادشاہ کے سر پر رکھا ہوا ہے لیکن حقیقت میں اس قدر بھاری تھا کہ کوئی انسانی سر اس کو نہیں اٹھا سکتا تھا کیونکہ اس کا وزن ۹۱½ کیلو تھا (تقریباً ۲½ من ہوا) ایران بعہد ساسانیان ص۵۳۱

ایران سے جلد بدداشتہ خاطر ہوگئے' یہ سچ ہے کہ وہ اتنے بلند نظر فلسفی نہ تھے کہ ایک غیر قوم کی عادات و رسوم کو غیر جانبداری کی نظر سے دیکھ سکتے اور جن باتوں کو وہ ایک فلسفی بادشاہ کی سلطنت میں دیکھنے کے خواہاں تھے' وہ ان کو نظر نہ آئیں اور چونکہ علم الاقوام کے مطالعہ کا انھیں ذوق نہ تھا' اور ان کی ذہنیت ایسی نہ تھی جو اس علم کے جاننے والے کی ہوتی ہے لہذا ایرانیوں کی بعض رسموں مثلاً تزویج محرمات کی رسم یا لاشوں کو زخموں پر کھلا چھوڑ دینے کی مذہبی رسم نے ان کو برہم کیا لیکن محض یہ رسمیں نہ تھیں جن کی وجہ سے ان کو ایران میں رہنا ناگوار ہوا بلکہ ذات پات کی تمیز اور سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے درمیان ناقابل عبور فاصلہ اور خستہ حالی جس میں نچلے طبقہ کے لوگ زندگی بسر کر رہے تھے' یہ وہ چیزیں تھیں جن کو دیکھ کر وہ آزردہ خاطر ہوئے" طاقتور لوگ کمزوروں کو دباتے تھے' اور ان کے ساتھ بہت ظلم اور بے رحمی کا سلوک کرتے تھے[1]"

یہ حال صرف ایران ہی میں نہ تھا' اس کی معاصر و حریف بازنطینی سلطنت میں بھی سخت قسم کا طبقاتی نظام اور امتیازی سلوک رائج تھا' رابرٹ بریفالٹ (ROBERT BRI-FFAULT) لکھتا ہے:—

"یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی اجتماعی ادارہ زوال پذیر ہوتا ہے تو اس کے چلانے والے اس کی حرکت اور ارتقاء کو روک دینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں پاتے' اسی لئے رومی معاشرہ (اپنے انحطاط کے دور میں) سخت درجہ کی ظالمانہ طبقہ واریت کے شکنجہ میں کسا ہوا تھا' سوسائٹی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اپنا پیشہ بدل سکے' ہر لڑکے کے لئے ضروری تھا کہ اپنے باپ کا پیشہ اختیار کرے[2]"

[1] ایران بعہد ساسانیاں بحوالہ آگاتھیاس ۲۷-۳۰ [2] THE MAKING OF HUMANITY P. 160

دونوں سلطنتوں میں بڑے بڑے عہدے، بڑے خاندانوں اور گھرانوں کے لئے مخصوص تھے، جو جاہ و حشم رکھتے اور حکام میں ان کا رسوخ تھا۔

ایران کے کسان

نت نئے ٹیکسوں نے عوام کی کمر توڑ دی تھی، بہت سے کسانوں نے کھیتی باڑی چھوڑ دی تھی، ان ٹیکسوں سے بچنے اور اس حکومت کی فوجی خدمت کرنے سے نجات حاصل کرنے کے لئے جس سے ان کو دلی لگاؤ نہ تھا، انھوں نے عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں پناہ لی تھی، نہ ان کو اس مقصد سے کچھ دلچسپی تھی جس کے لئے بار بار جنگیں کی جاتی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ بیکاری اور جرائم کی گرم بازاری ہوئی اور ناجائز طریقوں سے روپیہ پیدا کرنے کا مرض عام ہوگیا "ایران بعہد ساسانیان" کا مصنف ایران کے کاشتکار طبقہ کے متعلق جو ملک کی خوراک اور آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا لکھتا ہے:-

"کسانوں کی حالت بہت بدتر تھی، وہ اپنی زمین کے ساتھ بندھے رہتے تھے، اور ان سے ہر طرح کی بیگار اور خدمت لی جاتی تھی، مؤرخ امیان مارسیلینوس لکھتا ہے کہ "ان بیچارے کسانوں کے بڑے بڑے گروہ فوج کے پیچھے پیچھے پیادہ کوچ کرتے تھے، گویا کہ ابدی غلامی اُن کی تقدیر میں لکھی ہے اور کسی قسم کی تنخواہ یا اُجرت سے اُن کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی تھی[1]...... کسانوں کا تعلق زمینداروں کے ساتھ تقریباً ویسا ہی تھا جیسا کہ غلاموں کا تعلق آقا کے ساتھ[2]"

---

[1] "ایران بعہد ساسانیان" ص ۴۲۴   [2] ایضاً

حکام کا رویّہ

حکومت کے اہل کار و عہدہ دار عام رعایا اور ملک کے باشندوں کے ساتھ ایسی سخت گیری اور بیدردی کا برتاؤ کرتے کہ اہلِ ملک ان سے عاجز تھے، ان حکّام اور عہدہ داروں کو نہ عوام کی جان و مال کی پرواہ تھی، نہ ان کی عزت و آبرو کا پاس، لوگ شکایتیں کرتے، لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور تھی ان کے کانوں پر جوں نہ رینگتی، یہاں تک کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ اندھیر نگری ان کے لئے مقدر ہو چکی ہے، اور اس سے نجات کی کوئی صورت نہیں، بعض اوقات وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے۔

مصنوعی معاشرت اور پُرعشرت زندگی

روم و ایران دونوں جگہ عام طور سے لوگوں پر عیش پرستی کا بھوت سوار تھا، مصنوعی تہذیب اور ایک پُرفریب زندگی کا سیلاب اُمنڈ آیا تھا جس میں وہ سر سے پاؤں تک غرق تھے، سلاطین روم اور شاہانِ ایران اور اُن کے امراء و رؤساء خوابِ غفلت میں پڑے تھے، لذت اندوزی کے سوا انھیں کسی بات کی فکر نہ تھی، عیاشی کی وہ انتہا تھی کہ قیاس کام نہیں کرتا، تکلفات زندگی، تعیشات اور سامانِ آرائش کی وہ بہتات تھی اور اس میں ان باریکیوں اور نکتہ سنجیوں سے کام لیا جاتا تھا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے[1]، پارسی مؤرخ شاہین مکاریوس کے بیان کے مطابق "کسریٰ پرویز کے پاس بارہ ہزار عورتیں تھیں، پچاس ہزار اصیل گھوڑے، اسقدر سامان تعیش، محلات نقد و جواہرات تھے کہ ان کا اندازہ مشکل ہے اس کا محل اپنی شان و شکوہ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "ایران بعہد ساسانیان" کا باب نہم "آخری شاندار عہد"۔

اور عظمت میں جواب نہیں رکھتا تھا[1]" مکاریوس لکھتا ہے کہ "تاریخ میں مثال نہیں ملتی کہ کسی بادشاہ نے ان شاہانِ ایران کی طرح دادِ عیش دی ہو جن کے پاس تحائف اور خراج کی رقمیں ان تمام شہروں سے آتی تھیں جو شرق اوسط اور مشرقِ اقصیٰ کے درمیان واقع تھے[2]" اسلامی فتوحات کے بعد جب ایرانی عراق سے بے دخل ہوئے تو انھوں نے وہ اندوختہ چھوڑا جس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ان چھوٹے ہوئے سامانوں میں بیش قیمت جوڑے طلائی ظروف سنگار کا سامان عطریات وغیرہ تھے" طبری کی روایت ہے کہ عربوں کو مدائن کی فتح میں ترکی خیمے ملے جو سربمہر ٹوکروں سے بھرے ہوئے تھے، عرب کہتے ہیں کہ ہم سمجھے کہ اس میں کچھ کھانے کا سامان ہوگا کھولنے سے معلوم ہوا کہ سونے چاندی کے برتن ہیں[3]۔ مورخین نے فرش بہار کی (جس پر بیٹھ کر امراء ایران موسم خزاں میں شراب پیتے تھے) تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"یہ ساٹھ گز مربع تھا، تقریباً ایک ایکڑ زمین کو گھیر لیتا، اس کی زمین سونے کی تھی، جس میں جا بجا جواہرات اور موتیوں کی گلکاری تھی، چمن تھے جن میں پھولدار اور پھل دار درخت قائم تھے، درختوں کی لکڑی سونے کی، پتے حریر کے، کلیاں سونے چاندی کی، اور پھل جواہرات کے بنائے گئے تھے، گرد ہیرے کی جدول تھی، دریا میں روشیں اور نہریں بنائی گئی تھیں، اور یہ سب جواہرات کی تھیں، موسم خزاں میں تاجدارانِ آل ساسان اس گلشن بے خزاں میں بیٹھ کر شراب پیا کرتے اور دولت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ نظر آتا جو زمانہ نے کبھی اور کہیں نہ دیکھا تھا[4]"

رومی حکومت کے عہد میں شام اور اس کے مرکزی شہروں کا بھی یہی حال تھا، دونوں

---

[1] تاریخ ایران (شاہین مکاریوس) طبع مصر ۱۸۹۸ء ص ۹۰ [2] ایضاً ص ۲۱۱ [3] تاریخ طبری
[4] تاریخ اسلام از مولوی عبدالحلیم شرر۔ ج ۱ ص ۳۵۴ ماخوذ از تاریخ طبری وغیرہ۔

حکومتیں عیش پسندی اور تمدن کی باریکیوں میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھیں، شہنشاہانِ روم ان کے شامی رؤساء و حکام نے کھل کر داد عیش دی، ان کے عالی شان محل اور دیوان خانے اور نائو نوش کی مجلسیں عیش کے ساز و سامان اور دولت و فراغت کے اسباب سے لبریز تھیں تاریخ و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عیش پسندی اور نفاست میں بہت آگے نکل چکے تھے، حضرت حسان بن ثابتؓ نے (جنھوں نے اسلام سے پہلے غسانی امراء شام کی مجلسوں میں شرکت کی تھی) جبلہ بن الایہم غسانی کی مجلس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:۔

"میں نے دس باندیاں دیکھیں جن میں پانچ روم کی تھیں جو بربط پر گارہی تھیں، اور پانچ وہ تھیں جو اہل حیرہ کے دھن میں گارہی تھیں جنھیں عرب سردار ایاس بن قبیصہ نے تحفۃً بھیجا تھا، اس کے علاوہ عرب کے علاقہ مکہ وغیرہ سے بھی گویّوں کی ٹولیاں جاتی تھیں، جبلہ جب شراب نوشی کے لئے بیٹھتا تو اس کے نیچے فرش پر قسم قسم کے پھول چمیلی، جوہی وغیرہ بچھا دیئے جاتے اور سونے چاندی کے ظروف میں مشک و عنبر لگائے جاتے، چاندی کی طشتریوں میں مشک خالص لایا جاتا اگر جاڑوں کا زمانہ ہوتا تو عود جلایا جاتا اگر گرمیوں کا موسم ہوتا تو برف بچھائی جاتی اور اس کے اور اس کے ہم نشینوں کے لئے گرمیوں کا لباس آتا جس کو وہ اپنے اوپر ڈال لیتا، جاڑوں میں سمور قیمتی کھالیں اور دوسرے گرم لباس حاضر کئے جاتے۔[1]"

والیانِ ریاست، شاہزادے امراء، اونچے گھرانوں کے افراد نیز متوسط طبقہ کے لوگ بادشاہوں کے نقش قدم پر چلنے اور کھانے پینے، پوشاک اور طرز رہائش میں ان کی نقل کرنے کی کوشش کرتے اور ان کی عادات و اطوار اختیار کرتے معیار زندگی بہت ہی زیادہ

---

[1] تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۷۱

بلند ہو گیا تھا، اور معاشرت بہت زیادہ پیچیدہ بن گئی تھی، ایک ایک شخص اپنی ذات پر اور اپنے لباس کے کسی ایک حصہ پر اس قدر خرچ کرتا تھا جس سے پوری ایک بستی کی پرورش ہو سکے یا جو پورے ایک گاؤں یا آبادی کی پوشاک اور ستر پوشی کے مصارف کے لئے کافی ہو، ایسا کرنا ہر ایک ممتاز اور شریف آدمی کے لئے ناگزیر تھا کیوں کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو سوسائٹی میں انگشت نمائی ہوتی، اور وہ اپنے ہم چشموں میں ذلیل ہوتا یہاں تک کہ یہ بھی زندگی کی ایک ضرورت اور سوسائٹی کا ایک قانون بن گیا جس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی شعبی کہتے ہیں کہ اہل ایران اپنے سروں پر جو کلاہ رکھتے تھے، وہ ان کی اس حیثیت کے مطابق ہوتی تھی جو انھیں اپنے قبیلہ میں حاصل تھی، چنانچہ جو اپنے قبیلہ میں شرافت و عزت کے لحاظ سے معیاری ہوتا تھا، اس کی کلاہ ایک لاکھ کی قیمت کی ہوتی تھی، ہرمز کا شمار انھیں افراد میں تھا، جن کی سیادت تسلیم شدہ تھی لہٰذا اس کی کلاہ ایک لاکھ کی تھی جس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے[1] شرافت و وجاہت کا معیار یہ تھا کہ وہ ایران کے سات اونچے گھرانوں میں سے کسی ایک خاندان کا فرد ہو، ازادبہ (زادویہ) شہر حیرہ کا کسریٰ کے عہد میں حاکم تھا وہ سیادت میں دوسرے نمبر کا سمجھا جاتا تھا، اس لئے اس کی ٹوپی کی قیمت پچاس ہزار تھی،[2] رستم کی کلاہ ستر ہزار میں فروخت ہوئی اور اس کی قیمت ایک لاکھ تھی[3]

لوگ اس انتہا پسندانہ معاشرت اور اس کے تباہ کن لوازم و ضروریات کے اس طرح عادی ہو گئے تھے، اور یہ تمدن ان کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر گیا تھا کہ یہ تکلفات ان کی طبیعت ثانیہ بن گئے تھے، اور ان سے علیحدہ ہونا ان کے لئے ناممکن سا ہو گیا تھا، نازک سے نازک وقت میں اور مجبوری کی حالت میں بھی سادہ زندگی اور نیچی سطح پر اُتر آنا ان کے لئے دشوار تھا۔

مدائن کی فتح کے وقت شہنشاہ ایران یزدگرد جس بے سروسامانی اور پریشانی میں

---

[1] تاریخ طبری۔ ج ۴ ص ۶ [2] ایضاً ص ۱۱ [3] ایضاً ص ۱۳۴

دارالسلطنت چھوڑ کر بھاگا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، مگر اس عجلت و پریشانی میں بھی وہ اپنے ساتھ جو سامان لے گیا ہے، اس سے اس ذہنیت اور معیار تمدن کا اندازہ ہوسکتا ہے، "ایران بعہد ساسانیان" کا مصنف لکھتا ہے :-

"یزدگرد اپنے ہمراہ ایک ہزار باورچی، ایک ہزار گویّے، ایک ہزار چیتوں کے محافظ، ایک ہزار بازدار، اور بہت سے دوسرے لوگ لیتا گیا اور یہ تعداد اس کے نزدیک ابھی کم تھی"[1]

ہرمزان شکست کھانے کے بعد جب پہلی بار مدینہ آیا اور حضرت عمرؓ کی مجلس میں حاضر ہوا تو اس نے پانی مانگا، پانی ایک موٹے سے پیالہ میں لایا گیا، اس نے کہا کہ چاہے میں پیاسا مرجاؤں مگر اس بھدے پیالہ میں پانی پینا میرے لئے ممکن نہیں، چنانچہ اس کے لئے تلاش کرکے دوسرے برتن میں پانی لایا گیا جس کو وہ پی سکا[2]۔

ان دو واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ایرانیوں کی عادتیں کس قدر بگڑ گئی تھیں اور وہ مصنوعی زندگی اور تکلفات کے کس قدر عادی اور سادہ اور فطری زندگی سے کس درجہ دور ہوچکے تھے۔

حکومت کی دولت ستانی

اس عیش پسند اور مسرفانہ زندگی کا لازمی نتیجہ تھا کہ ٹیکسوں (ا) اس قدر اضافے ہوجائیں جو رعایا کے لئے ناقابلِ برداشت ثابت ہوں، نئے نئے قوانین بنائے جائیں جن کی رو سے کسانوں، تاجروں، کاریگروں اور اہلِ حرفہ سے زیادہ سے زیادہ مال گھسیٹا جاسکے، نوبت یہاں تک پہونچی کہ آئے دن کے ان اضافوں اور بھاری بھاری ٹیکسوں نے رعایا کی کمر توڑ دی اور حکومت

[1] ایران بعہد ساسانیان" صفحہ ۶۸۱ [2] تاریخ طبری جلد ۴ صفحہ ۱۶۱

مطالبات سے ان کی پیٹھ بوجھل ہوگئی، "ایران بعہد ساسان" کا مؤلف لکھتا ہے :۔

"باقاعدہ ٹیکسوں کے علاوہ رعایا سے نذرانے لینے کا بھی دستور تھا جس کو آئین کہتے تھے، اسی آئین کے مطابق عید نوروز اور مہرگان کے موقعوں پر لوگوں سے جبراً تحائف وصول کئے جاتے تھے، خزانۂ شاہی کے ذرائع آمدنی میں سے ہمارا خیال ہے کہ سب سے اہم ذریعہ جاگیرہائے خالصہ کی آمدنی اور وہ ذرائع تھے، جو بادشاہ کے لئے حقوق خسروی کے طور پر مخصوص تھے مثلاً فارنگیوں (علاقہ آرمینیہ) کی سونے کی کانوں کی ساری آمدنی بادشاہ کی ذاتی آمدنی تھی۔"[1]

مؤرخِ شام رومی حکومت کے طرز عمل اور اس کی مدوں اور آمدنیوں کے متعلق لکھتا ہے :۔

"شامی رعایا پر لازم تھا کہ وہ حکومت کا ٹیکس ادا کرے اور اپنی تمام پیداوار اور آمدنی کا دسواں حصہ اور راس المال کا ٹیکس داخل کرے فی کس ایک رقم مقرر تھی جس کا ادا کرنا لازمی تھا اس کے علاوہ رومی قوم کے کچھ دوسرے اہم ذرائع آمدنی تھے، مثلاً چنگی، کانیں، محاصل، اس کے علاوہ جو قطعات گندم کی کاشت کے قابل ہوتے اور چراگاہیں ٹھیکہ پر اٹھا دی جاتیں ان ٹھیکیداروں کو "عشارین" کہتے تھے، یہ لوگ حکومت سے تحصیل وصول کے اختیارات خرید لیتے اور رعایا سے مطالبات وصول کرتے، ہر صوبہ میں ان ٹھیکہ داروں کی متعدد کمپنیاں قائم تھیں، ہر کمپنی کے پاس کچھ منشی اور محصل ملازم تھے، جو اپنے کو افسروں اور مالکوں کے انداز میں پیش کرتے اور جس قدر ان کو لینے کا حق تھا اس سے زیادہ وصول کرتے، وہ لوگوں کو فراغت وراحت کے وسائل سے محروم کرتے اور اکثر ان کو

---

[1] "ایران بعہد ساسانیان" ص ۱۶۱

غلاموں کی طرح فروخت بھی کر دیتے [۱]

رومیوں کے سیاسی طرز کا اور ان کی پالیسی کا کسی نے خلاصہ یہ بیان کیا ہے کہ:۔

"اچھا گلہ بان وہ ہے، جو اپنی بھیڑوں کا اُون کاٹ لیتا ہے نوچتا نہیں" واقعہ یہ ہے کہ دو صدیاں گزر گئیں اور شہنشاہانِ روم اپنی مملکت کے باشندوں کا اُون کاٹتے رہے (نوچنے کی کوشش نہیں کی) وہ ان سے بہت بڑی دولت وصول کرتے رہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ بیرونی دشمن سے ان کی حفاظت کرتے رہے [۲]"

عوام کی خستہ حالی

روم و ایران دونوں ملکتوں میں اہلِ ملک دو علیحدہ طبقوں میں تقسیم ہو گئے تھے، ان دونوں طبقوں کے درمیان واضح اور بیّن فرق تھا، ایک طبقہ بادشاہوں، شاہزادوں، اہلِ دربار، ان کے خاندانوں، عزیزوں اور ان کے متعلقین و وابستگان اور جاگیرداروں اور دولتمندوں کا تھا، یہ لوگ سدا بہار پھولوں کی سیج پر زندگی گزارتے، ان کے گھر کے لوگ اور بچے سونے چاندی سے کھیلتے اور دودھ اور گلاب میں نہاتے، یہ اپنے گھوڑوں کی نعلیں بھی جواہرات سے جڑتے اور در و دیوار کو بھی ریشم و کمخواب سے سجاتے تھے۔

دوسرا طبقہ، کاشتکاروں، کاریگروں، اہلِ حرفہ اور چھوٹے تاجروں کا تھا جن کی زندگی سراپا کلفت و مصیبت تھی، یہ زندگی کے بوجھ ٹیکسوں اور نذرانوں کے بار سے کچلے جا رہے تھے، ان کا جوڑ جوڑ اور بند بند مطالبات کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا، وہ اس جال کو توڑنے کی جس قدر کوشش کرتے اور جس قدر ہاتھ پاؤں مارتے وہ جال اور کس جاتا اس کٹھن اور

[۱] خطط الشام (محمد کرد علی) ج ۵ ص ۴۷ [۲] ایضاً

پُرمصیبت زندگی پر دوسری مصیبت یہ تھی کہ وہ اونچے طبقہ کی بہت سی باتوں میں نقل اتارنے کی کوشش بھی کرتے جس سے اور زیادہ پریشان ہوتے، ضروریاتِ زندگی کی فراہمی میں ان کو وہ دقت اور پریشانی لاحق نہ ہوتی جو اس نقالی اور اونچے طبقہ کی ریس کرنے میں ان کو پیش آتی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی زندگی تلخ اور سراپا کوفت تھی، ان کا دماغ ہر وقت پریشان و پراگندہ رہتا اور ان کو حقیقی سکون اور اطمینانِ قلب کبھی میسر نہ آتا۔

سرکش دولتمند اور خود فراموش مفلس

سرمایہ داری کی سرکشی و خدا فراموشی اور افلاس کی بے بسی اور خود فراموشی کے دُو انتہائی سروں کے درمیان انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تعلیم کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی، اخلاقِ عالیہ اور زندگی کے بلند اصول پوری متمدّن دنیا میں متروک و ناقابلِ عمل سمجھ لئے گئے تھے، دولتمندوں کو اپنے تفریحی مشاغل اور تعیّشات سے اس کی فرصت نہ تھی کہ وہ دین یا آخرت کے بارہ میں کچھ سوچیں، کاشتکاروں اور محنت کش طبقہ کو اس کے افکار و آلام اور زندگی کے بڑھے ہوئے مطالبات اس کی مہلت نہیں دیتے تھے کہ وہ روزی خوراک اور ضروریات کے علاوہ کسی اور طرف توجہ کرے، غرض یہ کہ زندگی اور زندگی کے مطالبات نے امیر و غریب سب کو اُلجھا رکھا تھا، اور اسی میں ہر ایک سرگرداں تھا، زندگی کی چکی اپنی پوری قوت کے ساتھ گردش کر رہی تھی جس کی وجہ سے انھیں مطلق مہلت نہ تھی کہ وہ دین کی طرف توجہ کریں اور روح و قلب کے بارہ میں اور انسانیت کی بلند قدروں کے متعلق غور کر سکیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۷۶ھ) نے اپنی جلیل القدر تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" میں ماقبل اسلام کی اس صورتِ حال کی پوری تصویر کھینچی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"صدیوں سے آزادانہ حکومت کرتے کرتے اور دنیا کی لذتوں میں منہمک رہنے،
آخرت کو یکسر بھول جانے اور شیطان کے پورے اثر میں آجانے کی وجہ سے ایرانیوں
اور رومیوں نے زندگی کی آسانیوں اور سامان میں بڑی موشگافی اور نازک خیالی
پیدا کر لی تھی، اور اس میں ہر قسم کی ترقی اور نفاست میں ایک دوسرے سے سبقت
لے جانے اور فخر کرنے کی کوشش کرتے تھے، دنیا کے مختلف گوشوں سے ان مرکزوں
میں بڑے بڑے اہلِ ہنر اور اہلِ کمال جمع ہو گئے تھے، جو اس سامان آرائش وراحت
میں نزاکتیں پیدا کرتے تھے، اور نئی نئی تراش خراش نکالتے تھے، ان پر عمل فوراً
شروع ہو جاتا تھا، اور اس میں برابر اضافے اور جدتیں ہوتی رہتی تھیں، اور ان باتوں
پر فخر کیا جاتا تھا، زندگی کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ امراء میں سے کسی کا ایک لاکھ
درہم سے کم کا پٹکا باندھنا اور تاج پہننا سخت معیوب تھا، اگر کسی کے پاس
عالی شان محل، فوارہ، حمام، باغات، خوش خوراک اور تیار جانور، خوش رو جوان
اور غلام نہ ہوتے، کھانے میں تکلفات اور لباس و پوشاک میں تجمّل نہ ہوتا تو ہم چشموں
میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی، اس کی تفصیل بہت طویل ہے، اپنے ملک کے بادشاہوں
کا جو حال دیکھتے اور جانتے ہو اس سے قیاس کر سکتے ہو[1]، یہ تمام تکلفات اُن کی زندگی
اور معاشرت کا جُزو بن گئے تھے، اور ان کے دلوں میں اس طرح رچ گئے تھے کہ کسی
طرح نکل نہیں سکتے تھے، اس کی وجہ سے ایک ایسا لاعلاج مرض پیدا ہو گیا تھا، جو
ان کی پوری شہری زندگی اور اُن کے پورے نظامِ تمدن میں سرایت کر گیا تھا، یہ ایک
مصیبتِ عظمیٰ تھی جس سے عام و خاص اور امیر و غریب میں سے کوئی محفوظ نہیں رہا تھا،

---

[1] شاہانِ دہلی اور مغل بادشاہوں کی طرف اشارہ ہے۔

ہر شہری پر یہ پُرتکلف اور امیرانہ زندگی ایسی مسلّط ہوگئی تھی جس نے اس کو زندگی سے عاجز کردیا تھا اور اس کے سر پر غم و افکار کا ایک پہاڑ ہر وقت رکھا رہتا تھا، بات یہ تھی کہ یہ تکلفات بیش قرار رقمیں صرف کئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتے تھے، اور یہ رقمیں اور بے پایاں دولت کاشتکاروں، تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں پر محصول اور ٹیکس بڑھانے اور ان پر تنگی کئے بغیر دستیاب نہیں ہوسکتی تھیں، اگر وہ ان مطالبات کے ادا کرنے سے انکار کرتے تو اُن سے جنگ کی جاتی اور ان کو سزائیں دی جاتیں، اور اگر وہ تعمیل کرتے تو اُن کو گدھے اور بیلوں کی طرح بنالیتے جن سے آبپاشی اور کاشت کاری میں کام لیا جاتا اور صرف خدمت کرنے کے لئے ان کو پالا جاتا ہے، اور محنت و مشقت سے ان کو کسی وقت چھٹی نہیں ملتی، اس پُرمشقت اور حیوانی زندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو کسی وقت سر اٹھانے اور سعادتِ اُخروی کا خیال بھی کرنے کا موقع اور مُہلت نہیں ملتی تھی، بسا اوقات پورے پورے ملک میں ایک فردِ بشر بھی ایسا نہ ملتا جس کو اپنے دین کی فکر اور اہمیت ہوتی۔[1]

عالمگیر تاریکی

خلاصہ یہ کہ اس ساتویں صدی مسیحی میں روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی تھی جو مزاج کے اعتبار سے صالح کہی جاسکے، اور نہ ایسی کوئی سوسائٹی تھی، جو شرافت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کی حامل ہو، نہ ایسی کوئی حکومت تھی جس کی بنیاد عدل و انصاف اور رحم پر ہو، اور نہ ایسی قیادت تھی، جو علم و حکمت اپنے ساتھ رکھتی ہو، اور نہ کوئی ایسا صحیح دین تھا،

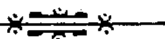
---

[1] حجۃ اللہ البالغہ باب اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم۔

جو انبیاءِ کرام کی طرف صحیح نسبت رکھتا ہو اور ان کی تعلیمات و خصوصیات کا حامل ہو، اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کہیں کہیں عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں اگر کبھی کبھی کچھ روشنی نظر آجاتی تھی، تو اس کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے برسات کی اندھیری رات میں جگنو چمکتا ہے، صحیح علم اور صحیح عمل اتنا نایاب تھا، اور خدا کا سیدھا راستہ بتلانے والے اس قدر خال خال پائے جاتے تھے کہ ایران کے بلند ہمت اور بے چین طبیعت نوجوان سلمان فارسی کو جو اپنے قومی و نسلی مذہب (مجوسیت) سے غیر مطمئن و مایوس ہو چکا تھا، اور حق و صداقت کا جویا تھا، ایران سے لے کر شام کے آخری حدود تک اپنے طول و طویل سفر میں صرف چار آدمی ایسے مل سکے جن سے اس کی روح کو سکون اور قلب کو اطمینان حاصل ہوا اور جو پیغمبروں کے بتلائے ہوئے راستہ پر قائم تھے[1]۔

اس عالمگیر تاریکی اور فساد کا نقشہ قرآن مجید نے جس طرح کھینچا ہے اس سے بہتر ممکن نہیں:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ	خرابی پھیل گئی ہے خشکی اور تری میں لوگوں
أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ	کے اعمال کے نتیجہ میں تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے
الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔	بعض اعمال کا مزہ چکھا دے اور وہ
(الروم۔۴۱)	باز آجائیں۔



[1] حضرت سلمان فارسیؓ کی سرگزشت (جو اپنی مسلسل سند اور راویوں کی ثقاہت و عدالت کی وجہ سے ایک مستند و بیش قیمت تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے) مسند امام احمد اور مستدرک حاکم میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

باب دوم

بعثتِ محمدیؐ کے بعد

بعثتِ محمدیؐ

ایسے وقت میں کہ انسانیت پر نزع کا عالم طاری تھا، دنیا اپنے تمام سازوسامان کے ساتھ ہلاکت کے مُہیب وعمیق غار میں گرنے والی تھی، عین وقت پر اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کو وحی ورسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا کہ اس جاں بلب انسانیت کو نئی زندگی بخشیں اور لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں :-

الۤرٰ قف کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔ (ابراہیم-۱)	الرا، یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تم پر اتاری ہے تاکہ تم تمام لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاؤ اس خدا کے راستہ کی طرف جو غالب اور ستودہ صفات ہے۔

آپ نے انسانیت کو صرف ایک بندگی کی دعوت دی، اور دنیا کی ساری بندگیوں وغلامیوں سے نجات دی، زندگی کی حقیقی نعمتیں (جن سے انسانوں نے اپنے کو محروم کر دیا تھا) دوبارہ ان کو عطا کیں اور وہ طوق وسلاسل اُن سے جُدا کئے جو انھوں نے بلا ضرورت اپنے اوپر ڈال لئے تھے جس

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ	محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کو نیکی کا
وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ	حکم دیتے ہیں برائی سے روکتے ہیں پسندیدہ
الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ	چیزیں حلال کرتے ہیں گندی چیزیں حرام
وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ	ٹھہراتے ہیں اس بوجھ سے نجات دلاتے ہیں
(الاعراف ـ ۷ ۱۵)	جس کے تلے وہ دبے ہوئے تھے ان پھندوں سے
	نکالتے ہیں جو ان پر پڑے ہوئے تھے ۔

آپ کی بعثت نے انسانیت کو نئی زندگی، نئی روشنی، نئی طاقت، نئی حرارت، نیا ایمان، نیا یقین، نئی نسل، نیا تمدن، نیا معاشرہ عطا کیا، آپ کی آمد سے دنیا کی نئی تاریخ اور انسانیت کے کام کی عمر شروع ہوتی ہے کہ خود فراموشی و خودکشی میں جو زمانہ گزرا، وہ اعتبار کے قابل نہیں، اور بینا و نابینا اور زندہ و مردہ ایک پلڑے میں رکھے نہیں جا سکتے ۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيرُ وَلَا	اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں اور
الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا	تاریکی اور روشنی اور نہ چھاؤں اور دھوپ
الْحَرُورُ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَآءُ وَلَا الْأَمْوٰتُ (الفاطر ۱۹ تا ۲۲)	اور زندہ آدمی اور مردہ برابر نہیں ہو سکتے ۔

جاہلیت و اسلام کے درمیان جو فاصلہ تھا اس سے بڑا کوئی فاصلہ نہیں لیکن یہ فاصلہ جس سرعت کے ساتھ طے ہوا دنیا میں اس کی بھی نظیر نہیں، دنیا نے آپ کی رہنمائی میں یہ طویل سفر کس طرح طے کیا؟ اور جاہلیت سے اسلام کی طرف کس طرح پہونچی؟ آئندہ صفحات اسی سوال کے جواب اور اسی اجمال کی تفصیل کے لئے ہیں ۔

جاہلیت پر ایک اجمالی نگاہ

گزشتہ صفحات سے اندازہ ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت

دنیا کی کیفیت بعینہ ایک ایسے مکان کی سی تھی جس کی بنیادیں ایک سخت زلزلے نے ہلادی تھیں اس کی ہر چیز بے محل اور بے قرینہ تھی، اس عمارت کا ساز و سامان زیر و زبر ہو گیا تھا جو ٹوٹنے پھوٹنے سے بچ رہا تھا، اس کی شکل بگڑ گئی تھی، کہیں کی چیز کہیں پڑی تھی، کہیں سامان کا انبار لگ گیا تھا، اور کہیں بالکل جھاڑو پھر گئی تھی، دیکھنے والے کو وہاں ایسا انسان نظر آتا تھا، جس کی نظر میں اپنی ہستی خود حقیر تھی، وہ درخت، پتھر اور پانی کی پرستش کرنے لگا تھا بلکہ وہ ہر بے بس چیز کو معبود بنا چکا تھا، وہ اتنا مسخ ہو چکا تھا کہ روزمرہ کی کھلی ہوئی حقیقتوں کے ادراک سے بھی قاصر تھا، اس کا فکری نظام مختل ہو چکا تھا، اس کے احساسات غلط کام کر رہے تھے، اس کے لئے علم نظری بدیہی اور بدیہی نظری بن گیا تھا، یقینی اور قطعی چیزوں میں اس کو شک ہونے لگا تھا، اور مشکوک و مشتبہ چیزیں قطعیات یقینیات بن گئی تھیں، اس کا ذوق فاسد ہو گیا تھا، بدذائقہ چیزیں اس کو خوش ذائقہ اور خوش ذائقہ بدذائقہ معلوم ہونے لگیں تھیں، اس کا احساس باطل ہو چکا تھا، دوست اور خیر خواہ کے ساتھ اس کی دشمنی اور دشمن اور بدخواہ کے ساتھ اس کی دوستی تھی۔

معاشرے پر نظر ڈالئے تو دنیا ہی کا مرقع نظر آتا ہے، ہر چیز غلط شکل یا غلط جگہ پر نظر آئے گی، اس معاشرے میں بھیڑیے کو گلہ کی نگہبانی اور ظالم فریق کو فصل خصومات کا کام سپرد کر دیا گیا تھا، اس سوسائٹی میں مجرم خوش قسمت اور آسودہ تھے، اور نیک سیرت زحمت و کلفت میں مبتلا تھے، اس معاشرے میں اخلاق کی پاکیزگی اور نیک چلنی سے بڑھ کر کوئی جرم اور حماقت، اور بداخلاقی اور بد اطواری سے بڑھ کر کوئی ہنر اور قابلیت کی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔

اس معاشرے کے عادات اور اطوار ہلاکت آفرین تھے، جو دنیا کو ہلاکت کے غار میں ڈھکیل رہے تھے، شراب نوشی، مستی، بداخلاقی، جنون، سود خواری، لوٹ کھسوٹ اور مال کی محبت، بوالہوسی اور جوع البقر تک پہونچ گئی تھی، سنگدلی اور بے رحمی اس حد تک پہونچ چکی تھی

کر لڑکیاں زندہ دفن کر دی جاتی تھیں اور لڑکے بچپن میں قتل کر دیئے جاتے تھے، بادشاہ اللہ کے مال کو ہاتھ کا میل اور اللہ کے بندوں کو خانہ زاد سمجھتے تھے، عالم و درویش خدا بن بیٹھے تھے، لوگوں کا مال کھاتے اُڑاتے اور خدا کے راستے سے خدا کے بندوں کو روکنے کے سوا ان کا کچھ مشغلہ نہ تھا۔

جو قابلیتیں انسان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کی گئی تھیں وہ بڑی بیدردی سے ضائع کی جا رہی تھیں، یا بے محل خرچ ہو رہی تھیں، نہ ان سے فائدہ اٹھایا گیا تھا، اور نہ ان کو صحیح رُخ پر لگایا گیا تھا، شجاعت اور بہادری نے ظلم و زبردستی، فیاضی و دریا دلی نے اسراف اور فضول خرچی، خودداری اور غیرت نے جاہلی حمیت، ذہانت و ذکاوت نے دھوکہ بازی اور حیلہ سازی کی شکل اختیار کر لی تھی، عقل کا کام صرف اتنا رہ گیا تھا کہ جرائم کے نئے نئے طریقے ایجاد کرے اور خواہشات کی تسکین کے لئے نئے نئے راستے پیدا کرے۔

افراد اور قیمتی انسانی ذخیرے مدّت سے ضائع ہو رہے تھے، وہ ایک ایسا خام مال تھا جس کو کوئی تجربہ کار کاریگر نصیب نہیں ہوا تھا، جو اس سے تمدن کا صحیح ڈھانچہ تیار کرتا، یہ لکڑی کے تختے تھے، جو پڑے پڑے گل رہے تھے، کوئی ایسا نہ تھا جو ان کو جوڑ کر زندگی کا جہاز تیار کر لیتا۔

منظّم قوموں کی جگہ بھیڑوں کے چند گلے نظر آتے تھے جن کا کوئی چرواہا نہ تھا، سیاست شُترِ بے مہار تھی، اور قوت ایک تلوار جو ایک بدمست کے ہاتھ پڑ گئی تھی، جس سے وہ خود اپنے کو اور دوسروں کو زخمی کر رہا تھا۔

جُزئی اصلاح کی ناکامی

اس خراب اور ابتر زندگی کا ہر شعبہ مُصلح کی پوری زندگی کا طالب تھا، فساد کا ہر گوشہ اس کا مستحق تھا کہ وہ اس کی ساری توجّہات کا مرکز بن جائے اور اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی فرصت

نہ دے اگر کوئی عام انسان ہوتا جو وحی و نبوت کی ہدایت کے بجائے اپنی عقل یا خواہشات سے کام کرتا تو اس زندگی کے ایک ہی حصہ پر اپنی ساری کوششیں لگا دیتا، اور پوری عمر کو سوسائٹی کے صرف ایک مرض کے ازالہ پر قربان کر دیتا لیکن اس سے کوئی بڑا فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے کہ انسان کی نفسیات کا معاملہ بہت پیچیدہ اور نازک ہے اس میں بہت سے چور دروازے ہیں اور عجیب عجیب روزن ہیں اس کی اصلی کمزوری اور مرکزی سرے کو پکڑ لینا آسان نہیں، جب انسان کا مزاج بگڑ جاتا ہے یا اس میں کجی پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے صرف ایک عیب کو دور کرنا اور ایک ہی کمزوری کے پیچھے پڑ جانا کارآمد نہیں اور نہ کسی ایک ہی عادت کو سنوارنا سود مند ہے، جب تک اس کا رخ شر سے پھیر کر خیر کی سمت اور خرابی سے ہٹا کر درستی کی جانب نہ کر دیا جائے اور زندگی میں بگاڑ کی جو جھاڑی اُگ آئی ہے اُس کو نہ اکھاڑ پھینکا جائے اور اس کی زمین کو گھاس اور خود رو پودوں سے صاف نہ کر دیا جائے تاکہ نیکی اور خیر کی محبت اور اللہ عزوجل کے خوف کا پودا اس میں بٹھایا جا سکے۔

انسانی معاشرے کی ہر کمزوری اور ہر عیب پوری پوری زندگی کا مطالبہ کرتا ہے بعض اوقات پوری پوری جماعت کی زندگیاں اس کے مقابلہ میں مصروف کار ہو جاتی ہیں اور اصلاح نہیں ہوتی، اگر کسی ملک میں شراب کی لت پڑ گئی ہے اور زندگی کا فلسفہ ہی اس نے ناؤ نوش سمجھ لیا ہے تو اس سے منہ لگی شراب چھڑانی آسان نہیں ہے، مے نوشی کس بات کا نتیجہ ہے؟ ایک ایسی ذہنیت اور مزاج کا جو مزہ کا عاشق ہے چاہے وہ لذت زہریلی ہو ئی ہو بے خودی اور خود فراموشی کا طالب ہے چاہے ہزار گناہ سے خریدی جا سکتی ہو، اس افتادِ طبیعت اور اس ذہن کو تقریر و تحریر، شراب کے طبی نقصانات کی تفصیل اور سخت سے سخت قوانین اور جرمانوں سے روکا نہیں جا سکتا، اس کو صرف عمیق نفسیاتی تبدیلی سے روکا جا سکتا ہے اس کے سوا اگر کوئی اور طریقہ اختیار کیا گیا تو

جرائم دوسرے رنگ میں ظاہر ہوں گے، اور اپنے لئے دوسرے راستے پیدا کریں گے۔

پیغمبر اور سیاسی قائد کا فرق

عرب کے ملک میں کام کا بہت وسیع میدان تھا اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کوئی قومی رہنما یا مُحبِّ وطن قائد ہوتے اور آپ کا طریقہ سیاسی اور ملکی رہنماؤں جیسا ہوتا تو آپ کے سامنے بہتر صورت یہ تھی کہ آپ عرب کو ایک وطن قرار دے کر عربی قبائل کا ایک اتحاد قائم کرتے اور عرب کی مضبوط طاقتوں سے ایک پختہ اور جنگجو بلاک بنا لیتے اور ایک عربی ریاست یا جمہوریہ کی بنیاد رکھتے، جس کے آپ نہایت آسانی کے ساتھ صدر ہو سکتے تھے ایسی صورت میں ابوجہل عتبہ وغیرہ آپ کے ساتھ پورا اشتراکِ عمل کرتے اور آپ کو عرب کی قیادت سونپ دیتے کیونکہ ان کو آپ کی صداقت و امانت کا مشاہدہ تھا، انھوں نے آپ کو مکہ کے سب سے بڑے اختلافی مسئلہ میں حَکَم بنایا تھا، عتبہ نے قریش کا نمائندہ بن کر آپ کے سامنے عرب کی سرداری کی پیشکش کی تھی، اور کہا تھا کہ اگر آپ قیادت چاہتے ہیں تو ہم کو ذرا اختلاف نہیں آپ زندگی بھر ہمارے قائد رہیں گے پھر اگر آپ کو یہ سیاسی مقام حاصل ہو جاتا تو آپ کے لئے ایرانی یا رومی سلطنت پر فوج کشی آسان تھی، آپ عرب کے شہسواروں کے ذریعہ ایران و روم کی سلطنت پر حملہ کر سکتے تھے، اور عجمیوں کو مغلوب کر کے روم و فارس پر عرب کی فتح کا پھریرا اڑا سکتے تھے یہ کتنا دلکش خواب تھا، اور عربی جذبۂ نخوت کی اس میں کیسی تسکین تھی، اور اگر آپ ان دونوں شہنشاہیوں سے بیک وقت برسرپیکار ہونا سیاسی دانش کے منافی سمجھتے تو یمن و حبشہ پر حملہ کر کے ان کو اپنی نوزائیدہ حکومت میں ملحق کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔

خود عرب میں اتنے اجتماعی، معاشی مسائل موجود تھے، جو اعلیٰ سیاسی بصیرت، قومی تنظیم، انتظامی قابلیت، اعلیٰ عزیمت کے برسوں سے منتظر تھے، ایک بلند پایہ قوی الارادہ رہنما عرب کی

مقامی اصلاح وتنظیم کرکے اس کو دنیا کی بہت بڑی طاقت اور ایک باعظمت ملک بنا سکتا تھا۔

لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس لئے مبعوث نہیں ہوئے تھے کہ ایک بگاڑ کو تبدیل کرکے دوسرا بگاڑ اس کی جگہ پر لائیں اور ایک ناانصافی کو مٹا کر دوسری ناانصافی پیدا کریں، ایک چیز کو ایک جگہ ناجائز قرار دیں اور دوسری جگہ اس کو جائز قرار دیں ایک قوم کی خودغرضی کی مخالفت کریں اور دوسری قوم کی خودغرضی کی ہمت افزائی کریں آپ ایک وطن پرست لیڈر اور ایک سیاسی قائد بن کر نہیں آئے تھے کہ ایک قوم کو اجاڑ کر دوسری قوم آباد کرتے، دوسری قوم کے زروجواہر سے اپنی قوم کا دامن بھرتے اور لوگوں کو روم وفارس کی غلامی سے نکال کر آل عدنان اور اولاد قحطان کی غلامی میں داخل کرتے۔

آپ کا مقصدِ بعثت دنیا کو جنت کی بشارت اور عذابِ آخرت کی وعید پہونچانا تھا، آپ داعی الی اللہ اور سراجِ منیر بن کر آئے تھے کہ ساری دنیا کو روشن کریں آپ مبعوث فرمائے گئے تھے کہ دنیا کو بندوں کی بندگی سے نکال کر صرف خدا کی بندگی میں داخل کریں تمام لوگوں کو مادی زندگی کی کال کوٹھری سے نکال کر دنیا وآخرت کی وسعتوں میں پہونچا دیں، مذاہب وادیان کی ناانصافیوں اور زیادتیوں سے نجات دے کر اسلام کے انصاف سے متمتع ہونے کا موقع دیں آپ کا کام نیکی کی ترغیب دینا، بدی سے منع کرنا صاف وپاک چیزوں کو حلال، گندی وناپاک چیزوں کو حرام قرار دینا اور ان بندشوں اور بیڑیوں کو توڑنا تھا، جو انسانوں نے اپنی نادانی سے یا مذاہب اور حکومتوں نے اپنی زبردستی سے لوگوں کے پاؤں میں ڈال رکھی تھیں۔

اسی لئے آپ کے مخاطب صرف ایک قوم یا ایک ملک کے باشندے نہ تھے آپ کا خطاب تمام انسانوں اور پورے انسانی ضمیر سے تھا، عرب قوم اپنی حد سے بڑھی ہوئی پسماندگی اور اخلاقی پستی کی وجہ سے ضرور اس کی مستحق تھی کہ آپ کی مہم وہیں سے شروع ہو اور کارِ نبوت کا

افتتاح بھی اسی قوم میں ہو، اُمُّ القریٰ (مرکزِ عالم، مکہ) اور جزیرہ نمائے عرب اپنے جغرافیائی جائے وقوع، سیاسی آزادی کی وجہ سے آپ کی جدّوجہد کے لئے بہتر مرکز تھے اور عربی قوم اپنی نفسیاتی خصوصیات اور اخلاقی امتیازات کی وجہ سے آپ کے پیغام کی بہترین سفیر اور آپ کی دعوت کی موزوں ترین قاصد بن سکتی تھی۔

آپ ان مُصلحین میں نہ تھے، جو اپنی قوم یا اپنے زمانے کی چند اجتماعی کمزوریوں یا اخلاقی خرابیوں کے مٹانے کے درپے ہوتے ہیں، اور وقتی طور پر ان عیوب کے ازالے میں کامیاب ہوتے ہیں، یا اس دنیا سے ناکام سدھار جاتے ہیں[1]۔

انسانیت کی صحیح گرہ کشائی

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالےٰ کی رہنمائی سے دعوت و اصلاح کا کام اس کے

---

[1] گاندھی جی نے اپنی سیاسی اور روحانی زندگی کی ابتدا سے دو زبردست اصولوں کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا اور ان دونوں پر اپنی وہ تمام طاقتیں ذہنی و علمی صلاحیتیں اور وہ تمام وسائل صرف کردیئے جو اس زمانے میں کم لوگوں کو حاصل ہوں گے، پہلا اصول عدمِ تشدّد تھا جس کی طرف انھوں نے ایک مستقل مذہب و فلسفہ کی حیثیت سے دعوت دی اور اس کے لئے اپنی زندگی وقف کردی، مگر چونکہ یہ طریقہ نفسیاتی تبدیلی اور دین کی بنیادی دعوت کے طریقہ سے جُدا تھا اس لئے ان کی دعوت نے وہ گہری تبدیلی اور تاثر پیدا نہیں کیا جو انبیاءؑ اپنی قوموں میں پیدا کرجاتے ہیں، انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے ہندوستان کا وہ ہولناک فرقہ وارانہ فساد دیکھا جس میں ان کے اصول عدمِ تشدّد کو بُری طرح پامال کیا گیا اور بربریت و تشدّد کا بدترین مظاہرہ ہوا، یہ واقعات گاندھی جی کے لئے سخت دل شکن اور سوہانِ روح بنے یا آخر ان کو خود تشدّد کا شکار ہونا پڑا جس کے خلاف ساری عمر انھوں نے تلقین کی تھی، دوسرا اصول چھوت چھات کا ترک تھا، اس مہم میں بھی کوئی خاص کامیابی نہ ہوسکی، یہ حقائق اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ انبیاء کرامؑ کا طریقہ ہی صحیح اور نتیجہ خیز طریقہ ہے اور وہی کامیابی کا راستہ ہے۔

صحیح راستہ سے شروع کیا، آپؐ نے طبیعتِ انسانی کے قفل میں ٹھیک چابی لگائی یہ وہ قفل تھا، جس کے کھولنے میں اپنے وقت کے تمام مصلحین ناکام رہے تھے، آپ نے لوگوں کو سب سے پہلے اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دی اور معبودانِ باطل کے انکار کی تلقین فرمائی اور طاغوت (خدا کے سوا ہر ہستی جس کی عبادت واطاعت مطلق کی جائے) کی نافرمانی کی ہدایت فرمائی، لوگوں میں کھڑے ہو کر آپ نے بآواز بلند فرمایا: "یاایھا النّاس قولوا لا الٰہ الا اللّٰہ تفلحوا" لوگو کہو کہ اللہ کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں کامیاب ہو گے۔

جاہلیت اسلام کے مقابلہ پر

جاہلی معاشرے نے اس دعوت اور اس کے مقاصد کے سمجھنے میں غلطی نہیں کی اور اس میں اس کو کچھ پیچیدگی محسوس نہیں ہوئی جیسے ہی آپ کی آواز سے سننے والوں کے کان آشنا ہوئے، وہ اچھی طرح سمجھ گئے کہ یہ دعوت ایسا تیر ہے، جو جاہلیت کے نشانہ پر بیٹھ جائے گا اور جگر کے پار ہو جائے گا خطرہ کے اس احساس سے جاہلیت کے کڑھاؤ میں اُبال پیدا ہوا، جاہلیت کے سورما جاہلیت کے آخری معرکہ کے لئے میدان میں کیل کانٹے سے لیس ہو کر اتر آئے۔

وَانْطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا	اور ان کے ذمہ دار لوگ نکل پڑے کہ چلو
وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ اِنَّ هٰذَا	اور اپنے معبودوں پر جمے رہو یہ تو یقیناً
لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۝ (ص - ٦)	کوئی سوچی سمجھی چیز معلوم ہوتی ہے۔

اس زندگی کے ہر رکن نے صاف محسوس کیا کہ جاہلی تہذیب کی عمارت متزلزل ہے اور پورا نظامِ زندگی خطرے میں ہے، اس موقع پر سختی، دباؤ، ظلم و زیادتی کے وہ لرزہ خیز واقعات پیش آئے جو تاریخ اسلام میں محفوظ ہیں، یہ اس بات کی علامت تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

نے جاہلیت پر زد لگانے کے لئے بالکل صحیح جگہ کا انتخاب کیا اور آپ کا تیر نشانہ پر صحیح بیٹھا
آپ نے جاہلیت کی شہ رگ پر وار کیا جس سے جاہلیت تلملا اٹھی اور سارا عرب جو جاہلیت کا
شاید سب سے بڑا قلعہ تھا، لڑنے کے لئے آگیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت پر پہاڑ کی طرح
جمے رہے، مخالفت کے طوفان اٹھے، فتنہ کی آندھیاں آئیں اور نکل گئیں، مگر آپ نے اپنی جگہ
سے ذرا جنبش نہ کی، آپ نے اپنے چچا سے صاف کہہ دیا "میرے چچا اگر میرے ایک ہاتھ میں
سورج اور دوسرے پر چاند بھی رکھ دیا جائے تو بھی میں اس کام کو چھوڑ نہیں سکتا یہاں تک کہ
یا اللہ تعالیٰ اس کو کامیاب کرے یا میں کام آجاؤں[1]"۔

آپ مکہ میں تیرہ[۱۳] سال تک مقیم رہے مسلسل توحید، رسالت، آخرت پر یقین کی دعوت پوری صراحت کے ساتھ دیتے رہے، آپ نے اس کے لئے ذرا بھی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہیں کیا، نہ مخالفوں کی ادنیٰ رعایت کی، نہ وقت کی مصلحت کے لئے اپنی دعوت میں لوچ اور لچک گوارا کی، اسی دعوت کو ہر مرض کی دوا، اور ہر بند قفل کی کنجی سمجھا، اور ایک لمحہ کے لئے بھی آپ کو اس کے بارہ میں ادنیٰ تذبذب بھی نہیں ہوا۔

اوّلین مسلمان

قریش نے اس دعوت کے مقابلہ میں گھٹنے ٹیک دیئے اور جاہلیت کے جھنڈے کے نیچے آپ کے مقابلہ پر آگئے اور انھوں نے تمام ملک میں آپ کے خلاف آگ لگادی اور اسلام کا راستہ روک کر کھڑے ہوگئے، اب آپ پر ایمان لانا اسی شیر دل مرد کا کام تھا جو موت سے نہ ڈرتا ہو، جو اپنے عقیدہ اور یقین کے لئے آگ میں کودنے اور انگاروں پر لوٹنے کے لئے تیار ہو،

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۳ ص۴۳

جو دنیا کی تمام ترغیبات سے منہ موڑ چکا ہو اور ساری دنیا سے رشتہ توڑ چکا ہو، قریش کے چند جواں مرد آگے بڑھے، یہ عجلت کا فیصلہ اور نوجوانی کا اقدام نہ تھا، وہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال رہے ہیں، اور زندگی کے دروازے اپنے لئے بند کر رہے ہیں، کوئی دنیاوی ترغیب یا لالچ اس کی محرک نہ تھی کہ اس فیصلہ سے صرف خطرات کا دروازہ کھلتا تھا، اور ہر طرح کے دنیاوی فوائد اور راحت کے دروازے بند ہوتے تھے، یہاں صرف یقین کی ایک طاقت تھی، اور آخرت کی لالچ تھی، انھوں نے ایمان کی طرف بلانے والے کو پکارتے سن پایا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ، یہ پکار سنتے ہی زمین ان پر تنگ ہوگئی، طبیعتیں بھینچنے لگیں، راتوں کی نیند اڑ گئی، نرم بستر کانٹوں کی طرح چبھنے لگے، انھوں نے دیکھا اللہ و رسول پر ایمان لانا اور اپنے یقین کا ساتھ دینا ان کے لئے ضروری ہوگیا ہے، وہ دل و دماغ کے فیصلہ اور اپنے یقین کی مخالفت کر کے خوش نہیں رہ سکتے تھے، حقیقت ان پر ظاہر ہو چکی تھی، وہ اس حقیقت کو ٹال نہیں سکتے تھے، حیوانی زندگی سے ان کا دل اُچاٹ ہوگیا تھا، وہ اس کو اس میں دوبارہ پھنسا نہیں سکتے تھے، ایک کانٹا تھا جو ان کے دل میں چبھ رہا تھا، وہ اس کانٹے کو پال نہیں سکتے تھے، آخر انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک پہونچنے اور اسلام لانے کا فیصلہ کر لیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے شہر کے محلہ میں تھے، چند گز کا فاصلہ! مگر قریش نے آپ کو اتنا دور کر دیا تھا، اور راستہ اتنا پُرخطر بنا دیا تھا کہ آپ تک پہونچنا ایک دُور دراز اور نہایت خطرناک سفر تھا، شام و یمن کو تجارتی قافلے لے جانا اور عرب کے رہزنوں سے بچ کر نکل جانا اتنا مشکل نہ تھا، جتنا مکہ کے اندر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک پہونچنا اور آپ سے ملنا مشکل تھا، لیکن وہ آپ تک پہونچے، آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور اپنی زندگی آپ کے حوالے کر دی ان کو زندگی کا

خطرہ تھا، اور آزمائشوں و مشکلات کا یقین تھا، مگر انھوں نے قرآن کی یہ آیت سنی تھی :۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا	کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یہ کہہ کر
اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ○ وَلَقَدْ فَتَنَّا	چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کی
الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ	آزمائش نہ ہو گی ہم نے تو ان سے پہلے
الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ ○	لوگوں کو خوب آزمایا ہے اللہ تعالےٰ ان
(العنکبوت۔ ۲ و ۳)	لوگوں کو ضرور جان لے گا جو سچے ہیں اور
	وہ جھوٹوں کو ضرور معلوم کرے گا۔

اور انھوں نے اللہ تعالےٰ کا یہ فرمان بھی سنا تھا کہ :۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ	کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ جنت میں یوں ہی
وَلَمَّا یَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ	داخل ہو جاؤ گے اور تم پر وہ حالات
قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ	نہیں گزریں گے جو پہلے گزر چکے ان کو
وَزُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ	مصیبت اور نقصانات سے سابقہ پڑا اور
وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ	وہ ہلا کر رکھ دیئے گئے حتیٰ کہ رسول اور
اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ ○	ان کے ساتھ کے ایمان لانے والے کہنے لگے
(البقرہ۔ ۲۱۴)	کب مدد آئے گی معلوم ہو کہ مدد بس قریب ہے۔

آخر وہی پیش آیا جس کی قریش سے توقع تھی، قریش نے اپنا ترکش ان بے بسوں پر خالی کر دیا اور سب تیر آزمائے مگر ان کی پختگی اور یقین بڑھتا ہی گیا: "اور کہنے لگے اسی کا تو ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا، اور اس نے ان کے ایمان اور سپردگی میں اضافہ ہی کیا" ان آزمائشوں اور ابتلاؤں سے ان کے

عقیدہ میں مزید پختگی، ان کے یقین میں استحکام، ان کے دینی احساس میں ترقی اور ان کے ایمان میں لذت وحلاوت پیدا ہوئی ان کی طبیعتوں میں نکھار پیدا ہوا اور وہ اس بھٹی سے کھرا سونا بن کر نکلے

صحابہ کرامؓ کی ایمانی تربیت

اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُن کو قرآن کی روحانی غذا پہونچا رہے تھے اور ایمان کے ذریعہ اُن کی تربیت فرما رہے تھے، اور آپ ان کو طہارتِ بدنی وخشوعِ قلبی خضوعِ جسمانی اور حاضر دماغی کے ساتھ دن میں پانچ بار ربّ العالمین کے حضور میں جھکاتے اُن میں روز بروز روحانیت کی بلندی قلب کی صفائی، اخلاقی ستھراپن، مادی گرفت سے آزادی اور خواہشات کی اتباع سے چھٹکارا حاصل ہو رہا تھا اور مالکِ ارض وسما کا عشق اور شوق بڑھ رہا تھا، آپ ان کو تکلیف میں صبر اور درگزر اور ضبط نفس کی تلقین فرماتے تھے لڑائی ان کے خمیر میں داخل تھی، تلوار سے ان کا ازلی رشتہ تھا، وہ لوگ اس قوم سے تھے، جس کی تاریخ بسوس وداحس وغیرہ کی خونیں داستانوں سے پُر ہے، یوم الفجار کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے، لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان جنگی سرشت انسانوں کو تھامے ہوئے تھے اور ان کی عربی نخوت کو ایمان کی طاقت سے دبائے ہوئے تھے آپ ان سے کہتے (اپنے ہاتھوں کو روکے رہو اور نماز قائم کرو) وہ آپ کے حکم سے موم ہو گئے تھے بغیر ادنیٰ تردلی کے انھوں نے اپنے ہاتھوں کو روک لیا وہ سب برداشت کر رہے تھے، جو دنیا کی کسی قوم نے برداشت نہیں کیا، تاریخ نے ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جس میں کسی مسلمان نے اپنے نفس کی طرف سے مدافعت کی ہو اور جوابی یا انتقامی کارروائی کی ہو، ضبط وتحمل کی یہ انتہائی مثال ہے جو ہمیں کسی جماعت کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔

مدینۃ الرسول میں

قریش جب حد سے بڑھ گئے اور پانی سر سے اونچا ہو گیا، تو اللہ نے اپنے رسول کو اور آپ کے اصحاب کو ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی یہ لوگ یثرب کو ہجرت کر گئے، اسلام ان سے بھی پہلے یثرب پہونچ چکا تھا۔

(وہاں مکہ یثرب والوں سے خوب گھل مل گئے، حالاں کہ ان کے درمیان کی کڑی صرف یہ نیا مذہب تھا، تاریخ نے دین کی طاقت واثر کا یہ انوکھا منظر پیش کیا، اوس وخزرج نے جنگ بعاث سے ابھی دامن بھی نہ جھاڑا تھا، اور اُن کی خون آشام تلواروں سے ابھی تک خون ٹپک رہا تھا، ایسے حالات میں اسلام نے دلوں میں اُلفت ومحبت پیدا کی، اس مصالحت کے لئے اگر کوئی شخص پوری دُنیا کا خزانہ خرچ کر دیتا تو بھی اس کی طاقت سے باہر تھی، نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) نے انصار ومہاجرین کے درمیان بھائی چارہ کرایا، ایسا بھائی چارہ جس کے سامنے سگے بھائیوں کی محبت گرد اور دنیا کی ساری دوستیاں بے حقیقت تھیں، تاریخ میں ایسی محبت وخلوص کی مثال نہیں ملتی۔

یہ نوزائیدہ جماعت جو مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ پر مشتمل تھی ایک عظیم الشان اسلامی امّت کی اساس اور اسلام کا سرمایہ تھی، اس جماعت کا ظہور ایسی کٹھن گھڑی میں ہوا جب کہ دنیا موت وزندگی کی کش مکش میں مبتلا تھی، اس جماعت نے آکر اس کی زندگی کا پلڑا جھکا دیا اور ان تمام خطرات کو دور کر دیا جو اس کو درپیش تھے، اس جماعت کا ظہور پھر اس کا استحکام انسانیت کی بقا کے لئے ضروری تھا، اسی لئے جب اللہ تعالےٰ نے انصار ومہاجرین کی اخوت ومحبت پر زور دیا تو فرمایا (اگر ایسا نہ کروگے تو زمین میں بڑا فتنہ وفساد برپا ہوگا۔)

صحابۂ کرامؓ کی ایمانی تکمیل

ادھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں صحابۂ کرام کی ایمانی تربیت وتکمیل کا سلسلہ جاری رہا، قرآن برابر ان کے قلوب کو طاقت اور گرمی بخشتا رہا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مجالس سے ان کو استحکام، خواہشاتِ نفس پر قابو، رضائے الٰہی کی سچی طلب اور اس کی راہ میں اپنے کو مٹانے کی عادت، جنت سے عشق، علم کی حرص، دین کی سمجھ اور احتسابِ نفس کی دولت حاصل ہوئی، وہ لوگ چستی و سستی میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے جس حال میں ہوتے خدا کی راہ میں اُٹھ کھڑے ہوتے، یہ لوگ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی معیت میں دس سال کے اندر ستائیس ۲۷ بار جہاد کے لئے نکلے اور آپ کے حکم سے سو۱۰۰ مرتبہ سے زائد کمربستہ ہوکر میدانِ جنگ کی طرف گئے، ان کے لئے دنیا سے بے تعلقی آسان بن گئی تھی، اہل وعیال کے مصائب برداشت کرنے کے عادی بن گئے تھے، قرآن کی آیات وہ بے شمار احکام لائیں جوان کے لئے پہلے سے مانوس نہ تھے نفس ومال، اولاد وخاندان کے بارے میں احکام نازل ہوئے جن کی تعمیل کچھ ہنسی کھیل نہ تھی، لیکن خدا اور رسول کی ہر بات ماننے کی عادت پڑ گئی تھی، شرک وکفر کی گتھی جب سُلجھ گئی تو ساری گتھیاں ہاتھ لگاتے ہی سلجھ گئیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ان کے ایمان کے لئے کوشش فرمائی، پھر ہر امر ونہی اور ہر نئے حکم کے لئے مستقل کوشش اور جدّوجہد کی ضرورت نہ رہی، اسلام وجاہلیت کے پہلے معرکہ میں اسلام نے جاہلیت پر فتح حاصل کرلی، پھر تو ہر موقع کے لئے ہر مرتبہ نئے معرکہ کی ضرورت باقی نہ رہی، وہ لوگ مع اپنے قلوب کے مع اپنے ہاتھ پاؤں کے مع اپنی روحوں کے اسلام کے دامن میں آگئے، ان پر جب حق واضح ہوگیا تو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) سے کوئی کشاکش باقی نہ رہی، آپ کے فیصلہ پر ان کو کبھی ذہنی

یا قلبی کش مکش پیش نہ آتی جس بات کا آپ فیصلہ فرما دیتے ذرا اختلاف کی گنجائش باقی نہ رہتی، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے روبرو اپنے چھپے قصوروں کا اقرار کیا اور اگر کسی گناہ میں مبتلا ہوگئے تو اپنے جسموں کو حدود اور سزاؤں کے لئے پیش کر دیا، شراب کی حرمت کا نزول ہوا ہے تو چھلکتے ہوئے جام ہتھیلیوں پر تھے' اللہ کا حکم ان کے بھڑکتے ہوئے جگر، آلودہ لبوں اور شراب کے پیالوں کے درمیان حائل ہوگیا، پھر کیا تھا ہاتھ کو ہمت نہ تھی کہ اوپر کو اٹھ سکے، لبوں کی تمنائیں وہیں خشک ہوگئیں، شراب کے برتن توڑ دیئے گئے اور شراب مدینہ کی گلیوں اور نالیوں میں بہہ رہی تھی۔

جب شیطان کے اثرات ان کے نفوس سے ڈھل گئے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جب ان کے نفوس کے اثرات ان کے نفوس سے زائل ہو گئے، نفسانیت کا خاتمہ ہوگیا اور وہ لوگ اپنے نفسوں سے ویسا ہی برتاؤ کرنے لگے جیسا کہ وہ دوسرے سے کرتے تھے' دنیا میں رہتے ہوئے مردانِ آخرت' اور نقد سودے کے بازار میں آخرت کے قرض کو دنیا کے نقد پر ترجیح دینے والے بن گئے، نہ کسی مصیبت سے گھبراتے نہ کسی نعمت پر اتراتے، فقر ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکتا' دولت سرکشی پیدا نہ کر سکتی، تجارت غافل نہ کرتی، کسی طاقت سے نہ دبتے' اللہ کی زمین پر اکڑنے کا خیال بھی نہ آتا، بگاڑ اور تخریب کا وہم بھی نہ ہو سکتا، لوگوں کے لئے وہ میزانِ عدل تھے، وہ انصاف کے علمبردار تھے' اللہ تعالےٰ کے گواہ تھے' خواہ ان کو اپنے نفس کے خلاف گواہی دینی پڑے خواہ والدین اور اعزہ کے مخالف جانا پڑے تو اللہ تعالےٰ نے اپنی زمین کو اُن کے قدموں میں ڈال دیا، اور دنیا کو ان کے لئے مسخر کر دیا، وہ اس وقت عالم کے محافظ اور اللہ کے دین کے داعی بن گئے' رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ان کو اپنا جانشین بنایا، اور آپ خود ٹھنڈی آنکھوں کے ساتھ رسالت اور امت کی طرف سے اطمینان لے کر رفیقِ اعلیٰ کی طرف سفر کر گئے۔

تاریخ کا عظیم ترین انقلاب اور اس کے اسباب

مسلمانوں کی طبیعتوں کا یہ زبردست انقلاب جو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے دست مبارک پر انجام پایا اور مسلمانوں کے ذریعہ سے انسانی معاشرہ میں پیش آیا، انسانی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ تھا، اس انقلاب کی ہر چیز نرالی اور انوکھی تھی، اس کی سرعت اس کا عمق اس کی وسعت و ہمہ گیری اس کی وضاحت اور فہم انسانی سے قرب یہ سب اس محیر العقول واقعہ کے نرالے پہلو تھے، یہ انقلاب دوسرے خارق عادات واقعات کی طرح کوئی پیچیدہ مسئلہ یا ناقابل فہم معمہ نہ تھا علمی طریقے سے اس انقلاب کی تحقیقات کیجیے تاریخ انسانی اور معاشرۂ انسانی میں اُس کے اثرات کا مطالعہ کیجیے۔

ایمان اور اس کے اثرات

تمام لوگ خواہ عرب ہوں یا عجمی نہایت مسخ شدہ زندگی گذار رہے تھے، ہر وہ ہستی جو ان کے لئے وجود میں لائی گئی تھی، اور جو اُن کے تصرفات کے تابع تھی، امر و نہی، سزا و جزا کی طاقت سے محروم تھی اس کی وہ پرستش کرنے لگے تھے، وہ بالکل ایک سطحی اور اُتھلی مذہبیت رکھتے تھے، جس کا زندگی میں کوئی اثر اور ان کے طبائع اور ارواح اور قلوب پر کوئی اقتدار نہ تھا۔

اخلاق و معاشرت اس مذہبیت سے ذرا متأثر نہ تھے، اللہ تعالیٰ کی ہستی ان کی نگاہوں میں ایسی تھی جیسا کہ ایک کاریگر اپنا کام پورا کر کے کنارہ کش اور گوشہ نشین ہو گیا ہو، ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مملکت ان لوگوں کے حوالے کر دی تھی جن کو اس نے خلعتِ ربوبیت سے سرفراز کیا تھا، اب وہ حکومت پر قابض اور سیاہ و سفید کے مالک تھے،

غذا کی تقسیم، ملک کا نظم ونسق اُن کے اختیار میں تھا، غرض ایک منظم حکومت کے جتنے شعبے اور محکمے ہوتے ہیں وہ سب ان کے انتظام میں ہیں۔

اللہ تعالےٰ پر اُن کا ایمان ایک تاریخی واقفیت سے زیادہ نہ تھا، اللہ کو پروردگار سمجھنا اس کو زمین وآسمان کا خالق ماننا ایسا ہی تھا جیسے تاریخ کے کسی طالب علم سے پوچھا جائے کہ یہ قدیم عمارت کس کی تعمیر ہے؟ وہ جواب دے کہ فلاں بادشاہ کی! اس بادشاہ کے نام سے اس کے قلب پر خوف وہراس کی کوئی لہر نہ دوڑے نہ اس کے دماغ پر کوئی اثر پڑے، ان لوگوں کا دل اللہ تعالےٰ کے خوف اور تضرع ودعا سے خالی تھا، اللہ کی صفات سے وہ بالکل بے خبر تھے، اس لئے ان کے دل میں اس کی محبت کا کوئی جذبہ اور اس کی عظمت وکبریائی کا کوئی نقش نہ تھا، اللہ تعالےٰ کے متعلق ان کو بہت مبہم مجمل اور عامیانہ سا علم تھا جس میں کوئی گہرائی اور قوت نہ تھی۔

یونانی فلسفہ نے خدائے تعالےٰ کی ذات کے تعارف کے سلسلہ میں زیادہ ترنفی سے کام لیا، اس نے صفات کی نفی کی اور نفی کا ایک طویل سلسلہ قائم کیا جس میں اللہ تعالےٰ کی کوئی مثبت تعریف اور کوئی ایجابی صفت نہیں ہے، نہ اس کی قدرت کا ذکر آتا ہے، نہ اس کی ربوبیت، اس کی بے پایاں بخشش، اس کی محبت ورحمت کا تذکرہ ہے، اس فلسفہ نے خلق اوّل کو تو ثابت کیا تھا لیکن علم واختیار وارادہ اور صفات کی نفی کی اور اپنی طرف سے ایسے کلّیات واصول وضع کئے جو اس ذات عالی کی تنقیص اور مخلوقات پر قیاس تھا، اور ظاہر ہے کہ اگر سیکڑوں نفی ہو جائیں تو ایک ایجاب کا بھی فائدہ نہیں دے سکتے۔

ہمارے علم میں آج تک ایسا کوئی نظام، ایسا کوئی تمدن اور ایسی کوئی سوسائٹی وجود میں نہیں آئی جو محض نفی پر قائم ہو یونانی فلسفہ کے حلقۂ اثر میں دین ومذہب خشوع وتضرع،

حوادث میں رب العالمین کی طرف توجہ قلبی محبت والفت کی روح سے یکسر خالی تھا، اسی طرح اس دور کی مذہبیت روح کھو بیٹھی اور صرف چند بے روح رسمیں اور ایمان کی بے جان نقلیں دنیا میں رہ گئیں۔

مسلمان امت اور عرب قوم اس بیمار، غیر واضح اور بے جان معرفت سے نکل کر ایک ایسے واضح اور عمیق عقیدہ تک پہونچ گئی جو قلب و نفس و جوارح پر قابو یافتہ تھا، معاشرت کو متأثر کرنے والا زندگی اور متعلقات زندگی پر حاوی تھا، وہ لوگ اس خدائے قدوس پر ایمان لائے جس کے بہترین نام ہیں جس کی شان سب سے اونچی ہے، وہ لوگ ایسے ربّ العالمین پر ایمان لائے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے، قیامت کے دن کا تنہا مالک و مختار شہنشاہ پاک ہے:-

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ	وہ ایسا معبود ہے کہ اس کے سوا کوئی اور
عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ	معبود نہیں، وہ جاننے والا ہے پوشیدہ
هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ	چیزوں کا اور ظاہر چیزوں کا وہی بڑا
الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ	مہربان رحم والا ہے وہ ایسا معبود ہے کہ
السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ	اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں وہ بادشاہ
الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا	ہے پاک ہے سالم ہے امن دینے والا ہے،
يُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ	نگہبانی کرنے والا ہے زبردست ہے، خرابی کا
الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ	درست کر دینے والا ہے، بڑی عظمت والا
الْحُسْنٰى ۚ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ	ہے، اللہ تعالیٰ لوگوں کے شرک سے پاک ہے
وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝	وہ معبود ہے، پیدا کرنے والا ہے، ٹھیک
(الحشر۔ ۲۲ تا ۲۴)	ٹھیک بنانے والا ہے، صورت بنانے والا ہے،

اس کے اچھے اچھے نام ہیں سب چیزیں
اسی کی تسبیح کرتی ہیں جو آسمانوں میں
اور زمین میں ہیں اور وہی زبردست
حکمت والا ہے۔

جو اس کارخانۂ عالم کا پیدا کرنے والا بھی ہے اور چلانے والا بھی جس کے قبضۂ قدرت میں تمام عالم کی باگ ڈور ہے جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا، جنت اس کا انعام ہے اور دوزخ اس کی سزا، جس کے لئے چاہتا ہے رزق میں کشائش کرتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے آسمان و زمین کی تمام پوشیدہ اشیاء سے واقف ہے آنکھوں کی چوریوں اور دلوں کے اسرار خوب جانتا ہے جو سراپا جمال، سراپا جلال، سراپا کمال اور محبت و رحمت ہے۔

اس گہرے وسیع اور واضح ایمان سے ان لوگوں کی نفسیات عجیب طرح تبدیل ہو گئیں، جب بھی کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا اور "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کی گواہی دیتا اس کی زندگی میں عظیم الشان انقلاب رونما ہوتا، ایمان اس میں پیوست ہو جاتا یقین رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتا اور اس کے جسم میں خون و روح کی طرح دوڑ جاتا جاہلیت کے جراثیم کو ختم کر دیتا اور اس کی جڑوں کو اکھاڑ کے پھینک دیتا، دل و دماغ اس کے فیضان سے معمور ہو جاتے اور وہ شخص پہلا آدمی باقی نہ رہتا، اس شخص سے صبر و شجاعت ایمان و یقین کے ایسے حیرت انگیز واقعات رونما ہوتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فلسفہ و تاریخ اخلاق انگشت بدنداں ہیں، قوتِ ایمان کے سوا کسی اور چیز سے اس کی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

احتساب نفس اور ملامتِ ضمیر

یہ ایمان ایک کامیاب اخلاقی مدرسہ اور نفسیاتی تربیت تھی جو طالب علم کو اعلیٰ درجہ کی قوتِ ارادی محاسبۂ نفس اور خود اپنے ساتھ انصاف کی قوت عطا کرتی، تاریخ میں کسی دوسری طاقت کا سُراغ نہیں ملتا جو نفس کے ترغیبات اور اخلاقی لغزشوں پر اس کامیابی کے ساتھ فتح حاصل کر لیتی۔

اگر کسی وقت صفتِ بہیمی زور کرتی اور انسان سے غلطی سرزد ہو جاتی اور یہ ایسا موقع ہوتا جب کوئی آنکھ دیکھنے والی نہ ہوتی اور وہ شخص قانون کی دسترس سے باہر ہوتا تو یہی ایمان نفس لوّامہ بن جاتا، دل کی پھانس چین نہ لینے دیتی، پریشان کُن خیالات کا سیلاب اُمنڈنے لگتا، اس گناہ کی یاد میں چین حرام ہو جاتا، حتیٰ کہ وہ شخص خود قانون کے سامنے اقرارِ جُرم کرتا اور سخت سے سخت سزا کے لئے اپنے کو پیش کر دیتا اور پھر اس سزا کو برضا و رغبت جھیلتا تاکہ اللہ تعالےٰ کی ناراضگی سے بچ سکے اور آخرت کی جگہ دنیا کی سزا لے لے۔

ہمارے سامنے معتبر مؤرخین نے اس سلسلہ میں اسلامی تاریخ کے ایسے عجیب و غریب واقعات پیش کئے ہیں جن کی نظیر اسلام کی دینی تاریخ کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتی، ان ہی واقعات میں سے ماعز بن مالک اسلمی کا واقعہ بھی ہے جس کو امام مسلم نے اپنی جامع صحیح میں نقل کیا ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس وہ حاضر ہوئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ مجھ سے خطا ہوئی ہے، میں زنا کا مرتکب ہو گیا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ کو پاک کروا دیں آپ نے ان کو واپس کر دیا، دوسرے دن وہ پھر آئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ میں زنا کا مجرم ہوں، آپ نے دوبارہ پھر واپس کر دیا، اور ان کے گھرانے سے دریافت کرایا کہ ان کی سمجھ میں کسی قسم کی

کوئی خرابی تو نہیں یا کوئی عادت کے خلاف بات تو نہیں پائی جاتی، انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو صرف اسی قدر جانتے ہیں کہ وہ سمجھ دار اور اچھے خاصے آدمی ہیں پھر تیسری بار ماعزؓ بن مالک آئے آپ نے دوبارہ دریافت کرایا جواب یکساں ملا، چوتھی بار جب وہ آئے تو آپ نے نصف دفن کرواکر سنگسار کردینے کا حکم دیا۔

اس کے بعد غامدیہؓ آئیں کہنے لگیں یا رسول اللہ مجھ سے زنا کی غلطی سرزد ہوگئی ہے، طاہر کروا دیجئے، آپ نے ان کو واپس کروا دیا، دوسرے روز پھر آئیں اور کہنے لگیں "آپ ہمیں کیوں واپس کرتے ہیں شاید اسی طرح جس طرح کہ ماعزؓ کو واپس کرتے تھے، ہاں میں حاملہ بھی ہوں" آپ نے فرمایا تو پھر جاؤ جب ولادت ہو جائے تو آنا، ولادت سے جب فارغ ہوئیں تو پھر آئیں لڑکا کپڑے میں لپٹا ہوا تھا، کہنے لگیں یہ میرا بچہ ہے آپ نے فرمایا جاؤ دودھ پلاؤ جب کچھ کھانے لگے تو لانا جب دودھ چھڑایا تو پھر آئیں، لڑکے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا، کہنے لگیں، اے اللہ کے نبی لیجئے میں دودھ پلانے سے بھی فارغ ہوگئی اور یہ کھانا بھی کھانے لگا، آپ نے لڑکا ایک مسلمان کے سپرد کیا، حد قائم کرنے کا حکم فرمایا ان کے سینہ تک گڑھا کھودا گیا اور آپ نے حکم فرمایا، لوگوں نے سنگسار کردیا، خالد بن ولیدؓ نے ایک پتھر مارا تو خون کی چھینٹیں ان پر آکے پڑیں تو انھوں نے مذمت کے لفظ کہے آپ نے یہ الفاظ سن لئے اور فرمایا "ہائیں خالد! اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ ایسی توبہ چنگی والا کرتا تو بخش دیا جاتا" پھر آپ نے حکم دیا نماز پڑھی گئی اور ان کو دفن کر دیا گیا۔[1]

امانت و دیانت

یہ ایمان انسان کی امانت اس کی پاکیزگی اور شرافت کا محافظ تھا، خلوت و جلوت میں

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الحدود۔

جہاں کوئی آنکھ دیکھنے والی نہ ہوتی اور ایسی جگہ جہاں آدمی کا پورا اقتدار اور اختیار ہوتا اور کسی سے خوف کھانے کی ضرورت نہ تھی، یہ ایمان نفس کی ترغیبات اور خواہشات پر پورا قابو رکھتا اسلامی فتوحات کی تاریخ میں دیانت وامانت واخلاص کے ایسے واقعات موجود ہیں کہ انسانی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتیں، یہ صرف ایمان راسخ اور اللہ کے دھیان اور ہر موقع ومحل پر اس کے علم کے استحضار کے نتائج تھے۔

تاریخ طبری کی روایت ہے کہ مسلمان جب مدائن پہونچے اور مال غنیمت جمع کرنے لگے تو ایک شخص اپنے حصہ کا مال غنیمت لایا اور خازن کے سپرد کر دیا، لوگوں نے کہا ایسا قیمتی سامان تو دیکھنے میں نہیں آیا ہمارے پاس جو مال ہے اس کو اس سے کچھ نسبت نہیں ان لوگوں نے اس شخص سے دریافت کیا کہ تم نے اس سے کچھ لیا بھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ خدا کی قسم اگر اللہ کا معاملہ نہ ہوتا تو تم کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی، ان لوگوں نے اندازہ کر لیا کہ یہ معمولی شخص نہیں، انھوں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا میں یہ نہیں بتا سکتا اس لئے کہ تم تعریف کروگے، سب تعریف اللہ کی ہے، اسی کے ثواب پر میں راضی ہوں، جب وہ واپس ہوا تو لوگوں نے ایک آدمی پیچھے کر دیا کہ معلوم کرو کون ہے، معلوم ہوا کہ عامر ان کا نام ہے، اور عبد قیس قبیلہ سے ان کا تعلق ہے۔[1]

مخلوقات اور مظاہر سے بے رغبتی

توحید کے عقیدہ نے ان کا سر اونچا اور گردن فراز کر دی تھی، کیا مجال تھی کہ غیر اللہ کے سامنے یا جابر بادشاہ کے آگے، یا کسی عالم و درویش یا دینی یا دنیوی سردار کے سامنے ان کی گردن خم ہو، اس ایمان نے ان کے دل و نظر کو خدائے تعالیٰ کی عظمت سے معمور کر دیا تھا، مخلوقات کا

---

[1] تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۶

حُسن وجمال دنیا کی دل فریبیاں، شان وشوکت کے مظاہرے ان کی نظر میں ہیچ تھے، وہ جب ملوک وسلاطین اوران کے جاہ وحشم، کر وفر اوران کے درباروں کی سجاوٹ اور زیب و زینت پر نظر ڈالتے اور یہ دیکھتے کہ یہ سلاطین اسی میں خوش ہیں توان کو ایسا معلوم ہوتا کہ چند بے جان مجسّمے یا مٹی کی مورتیں ہیں جن کو انسانی لباس سے آراستہ کر دیا گیا ہے۔

ابو موسیٰ کہتے ہیں، جب ہم نجاشی کے پاس پہونچے تو اس کا دربار لگا تھا، دائیں جانب عمرو بن العاص، بائیں جانب عمارہ تھے، مذہبی پیشوا دو رویہ بیٹھے تھے، عمرو اور عمارہ نے بادشاہ سے کہا کہ یہ لوگ سجدہ نہیں کرتے، پادریوں نے کہا کہ بادشاہ کو سجدہ کرو، حضرت جعفرؓ نے برجستہ جواب دیا کہ ہم صرف خدا کو سجدہ کرتے ہیں۔[۱]

حضرت سعدؓ نے رستم کے پاس جو کہ ایرانی افواج کا سپہ سالار تھا ربعی بن عامرؓ کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا، ربعی بن عامرؓ پہونچے تو دربار فرش فروش سے آراستہ تھا، رستم یاقوت اور بیش بہا موتی زیب بدن کئے لباس بیش قیمت پہنے تاج سر پر رکھے سونے کے تخت پر بیٹھا تھا، ربعی بن عامرؓ پھٹے پرانے لباس میں پہونچے، مختصر سی ڈھال، چھوٹا سا گھوڑا یہ ان کی حیثیت تھی، وہ گھوڑے پر سوار فرش کو روندتے ہوئے بڑھتے چلے گئے اور پھر گھوڑے سے اترے، قیمتی گاؤ تکیہ سے گھوڑا باندھ دیا، اور خود رستم کے پاس جانے لگے، آلات حرب ساتھ، سر پر خود، جسم پر زرہ بھی موجود تھی، لوگ بولے جنگی لباس تو اتار دو، کہنے لگے میں خود سے نہیں آیا، مجھے بلایا گیا ہے اگر تم کو منظور نہیں تو ابھی واپس جاتا ہوں، رستم نے کہا آنے دو، وہ اسی فرش پر نیزے سے سہارا لیتے ہوئے بڑھے نیزے کی نوک نے فرش کو جا بجا سے کاٹ دیا، لوگ بولے تمہارا کیسے آنا ہوا، بولے ہم کو اللہ نے اسی لئے بھیجا ہے کہ جس کے بارے میں اس کی مرضی ہو اس کو بندوں کی بندگی سے نجات دلا کر اللہ کی بندگی میں

---

[۱] البدایہ والنہایہ (ابن کثیر) ج ۳

داخل کردیں اور دنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں پہونچادیں اور مذاہب کی زیادتیوں سے چھٹکارا دلا کر اسلام کے عدل کے سایہ تلے لے آئیں۔[1]

بے نظیر شجاعت اور زندگی کی حقارت

آخرت کے عقیدے نے مسلمانوں کے قلوب میں ایسی دلیری بھر دی تھی جو بالکل خارقِ عادت تھی ان میں جنت کا عجیب و غریب شوق اور زندگی کی تحقیر پیدا کر دی تھی جنت کا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے اس طرح کھنچ جاتا تھا جیسے وہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں وہ اس طرح جنت کی جانب لپکتے تھے جیسے نامہ بر کبوتر اپنی اڑان میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا اور اپنی منزل پر پہونچکر دم لیتا ہے۔

معرکۂ اُحد میں جب کہ بہت سے مسلمان میدان چھوڑ چکے تھے حضرت انس بن نضرؓ بڑھے انھوں نے سعد بن معاذ کو سامنے دیکھا تو کہنے لگے اے سعد بن معاذ! خدا کی قسم جنت کی خوشبو اُحد پہاڑ کے اسی طرف سے آرہی ہے انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ ہم نے اسیؓ سے زیادہ زخم ان کے جسم پر پائے کچھ تلوار کے تھے کچھ نیزے کے اور کچھ تیروں کے زخم تھے ہم نے ان کو اس حال میں دیکھا کہ مشرکین نے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا جس کی وجہ سے سوائے ان کی بہن کے جنھوں نے ان کو انگلی کے پورے سے شناخت کیا اور کوئی نہ پہچان سکا۔[2]

بدر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا بڑھو اس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین و آسمان ہے تو عمیر بن حمام انصاری نے کہا یا رسول اللہ اس کی وسعت زمین و آسمان ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں کیا تم کو شک ہے کہنے لگے نہیں یا رسول اللہ میری یہ تمنا تھی کہ میں اس کو پالیتا۔ آپ نے فرمایا ہاں پالوگے وہ چند دانے کھجور نکال کر کھانے لگے پھر بولے اگر ان

---

[1] البدایہ والنہایہ (ابن کثیر) [2] بخاری و مسلم

کھجوروں کے کھالینے کا انتظار کروں گا تو بہت سا وقت لگے گا پھر تمام کھجور الگ پھینکے اور میدان میں کود پڑے اور شہادت پائی۔[1]

ابو بکر بن ابو موسیٰ اشعری راوی ہیں کہ میرے والد دشمن کے مقابل تھے اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنت کے دروازے تلواروں کے سایہ میں ہیں یہ سن کر ایک شخص اُٹھا اس کا لباس نہایت بوسیدہ تھا اس نے کہا ابو موسیٰ تم نے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا ہے انھوں نے جواب دیا ہاں وہ شخص اپنے ساتھیوں کے پاس گیا اور اس نے کہا میرا اسلام قبول ہو اور تلوار کا پرتلا توڑ کر ڈال دیا اور تلوار لے کر دشمن کے مقابلہ میں آگیا اور شہادت پائی۔[2]

عمرو بن جموح کے چار بیٹے تھے اور ان کے خود کے پیر میں لنگ تھا جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جنگ میں تشریف لے جاتے تو وہ بیٹے آپ کے ہمراہ جاتے جب آپ غزوۂ اُحد کے لئے تشریف لے جانے لگے تو عمرو بھی ساتھ ہونے لگے ان کے بیٹوں نے سمجھایا کہ آپ کو خدائے تعالےٰ کی طرف سے رخصت ہے اگر آپ تشریف نہ لے جائیں تو زیادہ اچھا ہے اور ہم تو آپ کی طرف سے کافی ہیں ہی، اللہ نے جہاد آپ پر سے ساقط کر دیا ہے، وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے کہنے لگے یا رسول اللہ یہ میرے بیٹے مجھ کو آپ کے ہمراہ نکلنے سے روکتے ہیں اور بخدا میری یہ تمنا ہے کہ میں اپنے اسی معذور پاؤں سے جنت میں چلوں پھروں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے تم کو جہاد سے معاف فرما دیا ہے، دوسری طرف ان کے بیٹوں سے فرمایا کہ جانے کیوں نہیں دیتے شاید شہادت اللہ تعالےٰ نصیب فرمادے وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کے لئے نکلے اور شہادت پائی۔[3]

---

[1] مسلم [2] ایضاً [3] زاد المعاد ج ۳ صـ ۱۳۵

شداد بن ہاد کہتے ہیں کہ ایک اعرابی نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا ایمان لایا اور آپ کے ساتھ ہو لیا اور کہا میں آپ کے ساتھ ہجرت کروں گا، آپ نے ایک صحابی سے فرمایا کہ اس کا خیال رکھنا، خیبر کا معرکہ پیش آیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت تقسیم فرمایا، اس میں اعرابی کا بھی حصہ لگا کر صحابہ کے سپرد فرمایا، یہ اعرابی سب کے جانور چرایا کرتا تھا جب شام کو لوٹ کر آیا تو لوگوں نے اس کا حصہ اس کے حوالہ کر دیا اس نے کہا یہ کیا؟ لوگوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تمہارا حصہ لگایا تھا، اس نے لے لیا اور لے کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچا اور کہا یا رسول اللہ یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ تمہارا حصہ ہے، وہ بولا میں اس لئے آپ کے ساتھ نہیں ہوا تھا، میں نے تو اس لئے رفاقت اختیار کی تھی کہ اس جگہ تیر لگے اور اس نے اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا تا کہ میں جنت جا سکوں آپ نے فرمایا اگر خدا سے تیرا معاملہ سچا ہے تو خدا بھی تیری یہ آرزو پوری کر دے گا، جب جنگ ہوئی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس اعرابی کے پاس سے گزرے تو آپ نے اس کو شہید پایا، آپ نے پوچھا کیا یہ وہی ہے؟ لوگوں نے جواب دیا ہاں، آپ نے فرمایا اللہ کے ساتھ اس کا معاملہ سچا تھا، اللہ نے بھی اس کو سچا کر دیا۔[1]

مکمل سپردگی

یہ تمام اس ایمان سے پہلے ایک پراگندہ و غیر منظم زندگی گزار رہے تھے، نہ کسی طاقت کے سامنے سر تسلیم خم کرتے، نہ کسی ضابطۂ حیات کے پابند تھے، نہ کسی نظام زندگی سے منسلک تھے، وہ خواہشات کے تابع تھے، بغیر سمجھے بوجھے عمل کرتے گمراہیوں میں بھٹکتے پھرتے، اب وہ ایمان اور بندگی کے دائرہ میں اس طرح داخل ہو گئے تھے کہ ان کے لئے اس سے باہر آنا

---

[1] زاد المعاد۔ ج ۲ ص ۱۹

مشکل ہوگیا تھا انھوں نے اللہ کی شہنشاہیت اور اس کے اقتدار کو تسلیم کر لیا تھا، اور اپنے کو رعایا، بندہ اور مطیع مطلق مان لیا تھا، مکمل طور پر اس کو اپنی قیادت حوالہ کر دی تھی، قانونِ الٰہی کو بے چوں وچرا تسلیم کر چکے تھے اور خواہشات وخودسری سے مکمل طور پر دستبردار ہو گئے تھے، وہ ایسے غلام بن گئے تھے، جو نہ اپنے مال کا مالک ہے، نہ اپنی جان کا، جو مالک کی رضی اور اجازت کے بغیر ادنیٰ سے ادنیٰ تصرف بھی نہیں کر سکتا ہے، ان لوگوں کی صلح وجنگ، دشمنی و دوستی، خوشی وناراضگی، عطا ومحرومی اور صلۂ رحمی وقطع رحمی سب اللہ کے حکم کے تابع بن چکی تھی، جو کچھ بھی کرتے، اس کے حکم کے موافق کرتے، وہ لوگ جاہلیت سے خوب واقف تھے، اس میں پلے بڑھے تھے، اس وجہ سے اسلام کا مطلب خوب سمجھتے تھے، ان کو خوب معلوم تھا کہ اسلام نام ہے ایک زندگی سے دوسری زندگی کی طرف منتقل ہونے کا، ایک طرف بندوں کا راج یا صرف نراج ہے، دوسری طرف خدا کی حکومت ہے، کل تک خدا سے جنگ تھی، اور اس کے قانون سے کش مکش، اب مکمل اطاعت وسپردگی اور دائمی صلح وآشتی ہے، کل تک صرف خودی تھی، اب صرف خدا کی بندگی، جب اسلام کو اختیار کر لیا تو اب خودرائی اور خودسری کا کوئی کام نہیں، اب حکمِ خداوندی سے سرتابی اور قانونِ الٰہی سے بغاوت کی کوئی گنجائش نہیں، خدا کے حکم کے بعد اختیار باقی نہیں ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے مخالفت اور اس سے حُجت وبحث کا کوئی موقع نہیں، نہ غیر اللہ کے سامنے مقدمہ جا سکتا ہے اور نہ اپنی رائے کے مطابق فیصلہ ہو سکتا ہے، نہ دین کے مقابلہ میں رسم ورواج کی پابندی ہو سکتی ہے، نہ نفس پرستی باقی رہ سکتی ہے، جب وہ اسلام لائے تو انھوں نے جاہلی زندگی کو اس کی تمام خصوصیات، عادات اور رسوم کے ساتھ ترک کر دیا اور اسلام کو پوری خصوصیات، متعلقات اور لوازم کے ساتھ اختیار کیا اس سے ان کی زندگی میں بلا تاخیر مکمل انقلاب رونما ہو گیا۔

فضالہ بن عمیر بن ملوح نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کا ارادہ کیا آپ خانۂ کعبہ کا طواف کر رہے تھے، جب فضالہ آپ کے قریب ہوئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کون؟ فضالہ ــــ انھوں نے جواب دیا ہاں فضالہ، یا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) آپ نے فرمایا کہ تم کیا سوچ کر آئے تھے؟ کہنے لگے نہیں کچھ نہیں! اللہ کو یاد کر رہا تھا، نبی صلے اللہ علیہ وسلم ہنسے پھر فرمایا اللہ سے توبہ کرو پھر اپنا دست مبارک ان کے سینہ پر رکھا اور ان کا قلب پُر سکون ہوگیا، فضالہ کہا کرتے تھے آپ کا ہاتھ جیسے ہی سینہ سے اُٹھا آپ مجھ کو ایسے محبوب لگنے لگے کہ دنیا میں اللہ تعالےٰ نے آپ سے زیادہ کوئی محبوب چیز پیدا ہی نہیں کی، فضالہ کہتے ہیں میں گھر لوٹا تو راستہ میں وہ عورت ملی جس سے دل لگی کیا کرتا تھا اس نے کہا آؤ باتیں کریں، میں نے کہا اللہ کی اطاعت اور اسلام کے بعد اب اس کا کوئی امکان نہیں۔[1]

صحیح معرفت

انبیاء علیہم السلام نے انسان کو اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات اور اس کے افعال کا صحیح اور یقینی علم عطا کیا تھا اس عالم کی ابتداء و انتہا اور موت کے بعد انسان کا جس سے سابقہ پڑنے والا ہے اس سب کا علم انبیاء کے ذریعہ انسانوں تک بے منت و مشقت پہونچا تھا، انبیاء علیہم السلام نے ایسے علوم میں ان کی رہنمائی کی جن کے اصول و مبادی بھی ان کو حاصل نہ تھے جن پر یہ انسان اپنی تحقیق کی عمارت قائم کر سکتا، انبیاء علیہم السلام نے انسانوں کے وقت اور قوت کو بچا لیا اور مابعد الطبعیات و مسائلِ الٰہیات کی اس لاحاصل تلاش و تحقیق سے فرصت دی جن میں نہ ان کے حواس کام دے سکتے تھے، نہ نظر رسَا پا سکتی تھی، نہ ان کے پاس اس کے بنیادی معلومات ہی موجود تھے۔

---

[1] زاد المعاد۔ ج ۲ ص ۲۳۲

لیکن لوگوں نے اس نعمت کا شکرادا نہ کیا ایک بے ضرورت مہم اپنے سر لی، ان حقائق کو جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ان کو بے محنت حاصل ہو گئے تھے از سر نو تحقیق شروع کی اور ان نامعلوم خطّوں میں سفر کی ابتداء کی جہاں ان کے ساتھ نہ کوئی رہبر تھا اور نہ کوئی ان کی راہوں سے باخبر، وہ اس معاملہ میں اس سیاح سے بھی زیادہ بدقسمت اور فضول پسند ثابت ہوئے جو ان معلومات و تحقیقات پر قانع نہیں جو جغرافیہ اور نقشہ جات کی شکل میں نسلوں اور صدیوں کی محنتوں کا نتیجہ ہے وہ کوشش کرتا ہے کہ پہاڑوں کی بلندی اور سمندروں کی گہرائی کی از سر نو پیمائش کرے صحراؤں، فاصلوں اور حدود کو اپنی اس مختصر عمر، اور محدود وسائل کے ساتھ دوبارہ منضبط کرے اس آدمی کی محنت کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ تھک کر رہ جائے اس کا عزم جواب دے جائے، اور وہ شخص صرف چند یادداشتوں اور نا تمام اشاروں کا سرمایہ جمع کر سکے، اس سے بڑھ کر جن لوگوں نے الٰہیات کے میدان میں بصیرت اور روشنی کے بغیر قدم رکھا ان کو اس علم میں سوائے متضاد آراء، ادھورے معلومات، اتفاقی خیالات اور عجلت کے نظریات کے کچھ ہاتھ نہ لگا، خود راہ کھو بیٹھے اور دوسروں کی بھی منزل کھوٹی کی۔

صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) دین کے بارے میں بڑے خوش قسمت اور صاحبِ توفیق تھے کہ دین کے بارے میں انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و اطلاع پر پورا اعتماد کیا اور ذات و صفات کے بارہ میں "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کی سعی لاحاصل سے محفوظ رہے، انھوں نے اپنی ذکاوت و طاقت کو محفوظ رکھا اور اپنی جدّ و جہد اور کوشش اور اپنے اوقات کو پوری احتیاط کے ساتھ دین و دنیا کے مُفید میدانوں میں صرف کیا، وہ دین کے مضبوط حلقہ کو تھامے رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر دوسروں کے پاس دین کے متعلقات و تفصیلات تھے تو ان کے پاس دین کا مغز اور اس کا لُبِّ لُباب تھا۔

انسانی گلدستہ

اللہ و رسولؐ اور یوم آخرت پر ایمان اور کامل سپردگی نے زندگی سے پیچ و خم کو دور کر دیا اور انسانی خاندان کے ہر فرد کو اس کا صحیح مقام عطا کیا، انسانی معاشرہ ایک بے خار گلدستہ بن گیا جس کا ہر پھول اور ہر پتی اس کے لئے باعث زینت تھی۔

نوعِ انسانی کے افراد ایک خاندان میں تبدیل ہو گئے، وہ سب ایک باپ (آدمؑ) کی اولاد تھے اور آدم کی اصل مٹی سے ہے، نہ کسی عرب کو کسی عجمی پر فضیلت تھی اور نہ کسی عجمی کو کسی عرب پر فوقیت تھی، ہاں اگر کسی کو کسی پر فضیلت تھی تو محض تقویٰ کی بناء پر۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اے لوگو! بیشک اللہ نے تم سے جاہلیت کے عیب کو دور فرما دیا اور آباؤ اجداد پر فخر کرنے کی رسم ختم کر دی، انسانوں کی دو ہی قسمیں ہیں، نیک اور خدا سے ڈرنے والے اور اللہ تعالےٰ کے یہاں شریف دوسرے بدعمل بدبخت اور اللہ تعالےٰ کے یہاں ذلیل"۔[1]

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: "دیکھو تم کسی سے نہ بہتر ہو اور نہ بڑے، ہاں اگر تقویٰ میں بڑھ جاؤ (تو بیشک بڑے ہو)۔

آپ جب اپنے رب سے رات کے آخری حصّہ میں مناجات کرتے تھے، تو فرماتے تھے:
"میں گواہ ہوں کہ تمام بندے بھائی بھائی ہیں"۔[2]

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کا پورا پورا استیصال کر دیا تھا اور اس کے داخلے کے تمام روزن بند کر دیئے تھے۔ فرمایا:۔

"جو عصبیت کا علمبردار ہو وہ ہم میں سے نہیں، اور جو عصبیت پر جنگ کرے وہ

---

[1] ابن ابی حاتم [2] ابوداؤد

ہم میں سے نہیں اور جس کی موت عصبیت پر ہو وہ بھی ہم میں سے نہیں۔"[1]

جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں تھے، ایک مہاجر نے ایک انصاری کو کچھ کہہ دیا اور انصاری پکار اٹھا "انصاریو!" اور مہاجر پکار اٹھا "مہاجرو!" تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "چھوڑو اس جتھے بندی کے نعروں کو یہ نجس ہے۔"[2]

آپ نے جاہلی حمیت کو ناجائز قرار دیا اور مدد و تعاون کے اس جاہلی اصول کو بدل دیا جس پر ساری زندگی چل رہی تھی کہ اپنے بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے اپنے لوگوں کی باطل پر مدد کی تو وہ اس اونٹ کی مثال ہے جو کنوئیں میں گرنا چاہتا ہے، اور لوگ اس کو دم سے پکڑ پکڑ کر روکتے ہوں۔"[3] عربوں کی نفسیات اور ذہنیت ایسی تبدیل ہوگئی کہ اب ان کا ذوق اس مشہور مثل کو ہضم نہ کرپاتا تھا جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بار یہ فرمایا "اپنے بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم" تو صحابۂ کرامؓ خاموش نہ رہ سکے اور بے ساختہ بولے کہ یا رسول اللہؐ مظلوم کی مدد تو بیشک کی جائے، مگر ظالم کی مدد کیسے کی جائے، آپ نے فرمایا: "اس کو ظلم سے روکو یہی اس کی مدد ہے۔"[4]

اسلامی معاشرے میں مختلف طبقے شیر و شکر ہو گئے تھے، وہ ایک دوسرے کا سہارا بن گئے تھے، اب وہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِپیکار نہیں تھے، مرد عورتوں کے ذمہ دار و منتظم تھے، عورتیں نیک، وفا شعار اور امانت دار تھیں، ان کے حقوق مردوں پر تھے، اور مردوں کے حقوق اُن پر تھے۔

ذمہ دار معاشرہ

پورے معاشرے میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو گیا تھا، اب انسانی معاشرہ

۱؎ ابوداؤد۔ ۲؎ صحیح بخاری۔ ۳؎ تفسیر ابن کثیر۔ ۴؎ بخاری ومسلم۔

(سوسائٹی) ایک مجبور وبے اختیار اور مفلوج ومعطل جماعت نہ تھی جو نہ اپنے دماغ سے کام لے سکتی ہے نہ اپنے اختیار سے، اس کی عقل وبلوغ اور اس کا اختیار تسلیم کیا جاچکا تھا، اس کا ہر فرد ایک ذمہ دار با اختیار شخص تھا جو اپنے اپنے دائرہ میں صاحبِ اختیار وذمہ دار تھا، آدمی اپنے گھر کا سرپرست اور ذمہ دار ہوتا تھا، عورت اپنے شوہر کے گھر کی منتظم اور ماتحتوں کے متعلق جواب دہ تھی، ملازم اپنے مالک کے مال میں ذمہ دار اور اس ذمہ داری کا جواب دہ تھا، اس طرح اسلامی معاشرہ ایک ذی ہوش اور صاحبِ اختیار معاشرہ تھا جو اپنے اعمال کا جواب دہ تھا۔

تمام مسلمان حق کے مددگار بن گئے تھے، ان کا کام مشورہ سے ہوتا، خلیفہ جب تک خدا کا مُطیع رہتا وہ اس کے مطیع ہوتے اور اگر نافرمانی کرتا تو اطاعت باقی نہ رہتی حکومت کا شعار "لاطاعة لمخلوق فی معصية الخالق" بن گیا تھا یعنی خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں وہ مال اور خزانے جو سلاطین اور رئیسوں کا لقمۂ تر اور اُمراء کی ذاتی جائداد سمجھے جاتے تھے، اب اللہ کی امانت سمجھے جانے لگے تھے، اس کی رضا میں خرچ اور صحیح محل پر صرف کئے جاتے، اور مسلمان اس دولت کے امین اور متولّی تھے، خلیفہ کی مثال یتیم کے سرپرست کی سی تھی، اگر صاحبِ استطاعت ہوتا تو احتیاط کرتا اور اگر حاجت مند ہوتا تو بقدر ضرورت لیتا، اللہ کی وہ زمین جس کو سلاطین و امراء نے اپنی جاگیر سمجھ لیا تھا، جس کے لئے چاہتے وُسعت دیتے تھے، اور جس پر چاہتے تنگ کر دیتے تھے، اور بعض اس میں کپڑے کی طرح کتر بیونت کرتے تھے اب اللہ کی زمین تھی، جس کے متعلق ایک ایک بالشت کا حساب دینا تھا۔

صاحبِ ضمیر معاشرہ

انسانی سوسائٹی مدت سے اپنا ارادہ و اختیار اور ذوق ونشاط کھو چکی تھی، وہ

ایک گھٹی گھٹی سی سوسائٹی بن کر رہ گئی تھی، وہ ایک مجبور و مقہور جماعت تھی جس کی نہ جنگ کے بارے میں رائے لی جاتی تھی نہ صلح کے موقعہ پر اس کی مرضی معلوم کی جاتی تھی، اس سوسائٹی کے افراد کو قربانی و ایثار اور تکالیف کو جھیلنے، مشقتوں سے مقابلہ کرنے پر مجبور کیا جاتا، حالانکہ اس کو نہ تو اس کی خواہش ہوتی اور نہ اس سے کچھ فائدہ، نہ وہ افسروں کو پسند کرتے اور نہ افسران ان کو، وہ مجبور تھے کہ اس کی اطاعت کریں، جسے وہ ناپسند کرتے ہوتے اور اپنی جان و مال کو اس پر قربان کریں جس سے وہ نفرت کرتے ہوں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دلوں کی چنگاری بجھ گئی، جذبات سرد پڑ گئے، اور لوگوں کا اٹھان، ریاء اور فریب پر ہوا، توہین و حقارت اور ذلت کے برداشت کی طبیعتیں عادی ہو گئیں۔

محبّت کا صحیح مصرف

وہ فطری عنصر جن کے سر انسانیت کے اکثر عجوبۂ روزگار اور حیرت انگیز کارناموں کا سہرا ہے جس کو لوگ "محبت" سے یاد کرتے ہیں، عرصہ سے حقیر اور مردہ تھا، صدیوں سے کوئی اس کو کام میں لگانے والا اور اس سے حقیقی فائدہ اٹھانے والا پیدا نہیں ہوا تھا، بس وہ چمک دمک اور حسن و جمال کے فانی مظاہر کی نذر ہو کر رہ گیا تھا، عرصہ سے دنیا میں کوئی ایسا انسان نہیں پیدا ہوا تھا، جو اپنے جمال و کمال اور اپنی اعلیٰ صفات سے ساری انسانیت کی محبت کا مستحق ہو اور اپنی طاقت و دل آویز شخصیت سے اس محبت سے کام لے سکے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات میں انسانیت کو وہ گم شدہ دولت مل گئی، آپ وہ انسان تھے جن کو اللہ نے مجموعۂ خوبی بنایا تھا، دیکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ آپ کو جو اچانک دیکھتا مرعوب ہو جاتا، اور جو آپ سے ملتا جلتا وہ فریفتہ ہو جاتا،

آپ کا تعریف کرنے والا کہتا، آپ جیسا نہ آپ سے قبل دیکھنے میں آیا اور نہ آپ کے بعد آپ کے آنے کے بعد سچی اور پاک محبت کا بند چشمہ اُبل پڑا نفوس و قلوب اس طرح کھنچے جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے گویا کہ طبیعتیں اور دل پہلے سے آپ کے منتظر اور آپ کے لئے بیتاب تھے آپ کی امت کے افراد نے آپ سے ایسی محبت اور ایسی اطاعت کی ہے جس کی مثال عُشّاق اور اہل محبت کی تاریخ میں سننے میں نہیں آئی، آپ کی اطاعت و تابعداری میں اپنے آپ کو بالکل مٹا دینے اور گھر بار مال و دولت لٹا دینے کے ایسے واقعات پیش آئے جو نہ آپ سے قبل پیش آئے تھے اور نہ آئندہ ان کی امید ہے۔

محبّت و جاں نثاری

حضرت ابو بکرؓ کے اسلام لانے کے بعد اُن پر مکہ میں ایک روز دشمنوں نے حملہ کر دیا، عتبہ بن ربیعہ نے اس قدر مارا کہ آپ کا چہرہ سوج گیا حتیٰ کہ شناخت تک مشکل ہو گئی تھی، بنو تیم حضرت ابو بکر کو کپڑے میں لپیٹ کر ان کے گھر اٹھا لے گئے، ان کو آپ کی موت میں ذرا شک نہ تھا، آپ کو دن چھپتے ہوئے ہوش آیا تو سب سے پہلے بولے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے"؟ لوگوں کو اس پر بڑا غصہ آیا کہ اس حالت میں بھی آپ انھیں کو یاد کرتے ہیں جن کی وجہ سے یہ حال ہوا، وہ آپ کو بُرا بھلا کہنے لگے، انھوں نے اُن کی ماں ام الخیر سے کہا کہ دیکھو ان کو کچھ کھلا پلا دو، انھوں نے کچھ کھانے کے لئے اصرار کیا، آپ برابر کہتے رہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں"؟ انھوں نے جواب دیا "بخدا مجھے تمہارے ساتھی کا کچھ علم نہیں" انھوں نے کہا تو "خطاب کی بیٹی ام جمیل کے پاس جاؤ اور آپ کی خیریت دریافت کر کے مجھے بتاؤ" وہ ام جمیل کے پاس آئیں اور کہا کہ "ابو بکر محمد بن عبد اللہ کے متعلق پوچھتے ہیں"

انھوں نے کہا کہ "میں نہ ابوبکر کو پہچانتی ہوں اور نہ محمد بن عبداللہ کو، اور اگر تمہاری یہ خواہش ہو کہ میں تمہارے ساتھ تمہارے بیٹے کے پاس چلوں تو ہو سکتا ہے" انھوں نے کہا "ہاں چلو" وہ اُن کے ہمراہ گئیں اور ابوبکر کو پڑا ہوا پایا، ام جمیل ان کے قریب پہونچیں تو ان کا حال دیکھ کر کہا "واللہ! جس قوم نے تمہارے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہے وہ فاسق و کفار ہیں، اور مجھے امید ہے کہ اللہ ان سے تمہارا انتقام لے گا" انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ وہ بولیں کہ تمہاری ماں سنتی ہیں! انھوں نے کہا ان سے کچھ پردہ نہیں" انھوں نے جواب دیا، بخیر و عافیت ہیں آپ نے فرمایا کہاں ہیں؟ وہ بولیں "دار ابن ارقم میں" آپ نے فرمایا اللہ کی قسم بخدا میں کھا پی نہیں سکتا جب تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک نہ پہونچ جاؤں" وہ دونوں ذرا رکیں، جب رات ہوئی اور آمد و رفت موقوف ہوئی تو وہ ان کو لے کر نکلیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک پہونچا دیا آپ نے جب حضورؐ کو دیکھ لیا تو جان میں جان آئی اور کھایا پیا۔[1]

ایک انصاری عورت جس کا باپ، بھائی اور شوہر اُحد کے دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے، اور شہید ہو گئے تھے، قیام گاہ سے نکلی اور پوچھنے لگی" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے"؟ لوگوں نے کہا: "بحمد اللہ عافیت سے ہیں جیسا تم چاہتی ہو" اس نے کہا "مجھے دکھاؤ، میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں" اس نے جب آپؐ کو دیکھ لیا تو بولی، اگر آپ سلامت ہیں تو ہر مصیبت ہیچ ہے۔[2]

حضرت خبیبؓ کو پھانسی کے تختہ پر چڑھایا گیا سب کہنے لگے کہو یہ پسند ہے کہ محمدؐ تمہاری جگہ ہوں؟ انھوں نے کہا خدائے تعالےٰ کی قسم میں اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ آپؐ کے

---

[1] البدایہ والنہایہ۔ ابن کثیر ج ۲ ص ۳۰ [2] ابن اسحاق و بیہقی۔

پیر میں کانٹا چبھے اور میں چھوڑ دیا جاؤں، وہ سب ہنس دیئے۔[۱]

زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ اُحد کے روز رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے مجھے سعد بن ربیع کی تلاش میں بھیجا اور مجھ سے فرمایا، ان کو اگر دیکھو تو میرا سلام کہو اور کہو کہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کہتے ہیں کہ اپنے کو کیسا پاتے ہو، کہتے ہیں کہ میں مقتولین میں چکر لگانے لگا، پھر ان کے پاس پہونچا، ان کا آخری وقت تھا، اور ان کے جسم پر تیر، تلوار اور نیزے کے ستر زخم تھے، میں نے ان سے کہا "اے سعد! رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) تم کو سلام کہتے ہیں اور دریافت فرماتے ہیں کہ تمہارا کیا حال ہے" وہ انھوں نے کہا رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کو سلام کہو اور آپ سے کہہ دو یا رسول اللہؐ جنت کی خوشبو پا رہا ہوں، اور میری قوم انصار سے کہہ دو کہ اگر رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کو کچھ ہو گیا اس حال میں کہ تم میں ایک آنکھ بھی حرکت کر سکتی ہو تو اللہ کے یہاں تمہارا کوئی عذر نہیں اور اسی وقت روح پرواز کر گئی۔[۲]

اُحد کے روز ابو دجانہ نے اپنی پیٹھ کو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے لئے ڈھال بنا دیا تھا، تیر اس پر لگتے تھے، اور وہ حرکت نہ کرتے تھے۔[۳] مالک الخدری نے رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا زخم چوس کر صاف کر دیا تھا، اُن سے آپ نے فرمایا تھوک دو انھوں نے کہا:- بخدا! میں کبھی بھی نہ تھوکوں گا۔[۴]

ابو سفیان جب مدینہ آئے اور اپنی بیٹی ام حبیبہ کے پاس پہونچے، اور جب رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے بستر مبارک پر بیٹھنا چاہا تو انھوں نے اس کو لپیٹ دیا، انھوں نے کہا "اے بیٹی! مجھے خبر نہیں کہ تم نے بستر میرے لائق نہ سمجھا، یا مجھ کو اس کے لائق نہ سمجھا" انھوں نے کہا نہیں! بلکہ یہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا بستر ہے، اور تم مشرک نجس ہو۔[۵]

عروہ بن مسعود ثقفی نے حدیبیہ سے واپسی کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہا "اے لوگو! بخدا

---

[۱] البدایۃ والنہایہ ج ۴ ص ۹۳ [۲] زاد المعاد ج ۲ ص ۱۳۴ [۳] ایضاً ص ۱۳۰ [۴] ایضاً ص ۱۳۶
[۵] سیرۃ ابن ہشام۔

میں سلاطین کے یہاں گیا، کسریٰ قیصر اور نجاشی کے دربار بھی دیکھے، خدا کی قسم میں نے ایسا بادشاہ نہیں دیکھا جس کے ساتھی اس کی اتنی عزت کرتے ہوں جتنی محمدؐ کے ساتھی محمدؐ کی، خدا کی قسم جب بھی وہ تھوکتے ہیں ان میں سے کسی شخص کے ہاتھ پر گرتا ہے وہ اپنے چہرے اور جسم پر مل لیتا ہے، اور جب وہ ان کو حکم دیتے ہیں تو وہ سب ان کے حکم پر لپکتے ہیں، اور جب وہ وضو کرتے ہیں تو اس کے پانی پر لڑتے لڑتے رہ جاتے ہیں، اور جب بات کرتے ہیں تو وہ لوگ اپنی آوازیں پست کر لیتے ہیں، اور وہ لوگ فرطِ ادب سے آپؐ پر گہری نظر نہیں ڈال سکتے۔[1]

اطاعت وتابعداری

اطاعت وتابعداری محبت کا لازمی نتیجہ ہے، جب صحابۂ کرامؓ محبت کی دولت سے مالامال ہوئے تو انھوں نے اپنی ساری طاقت آپؐ کی اطاعت میں صرف کردی اس کی بہترین مثال سعد بن معاذ کا وہ قول ہے جو انھوں نے اپنی اور جماعت انصار کی جانب سے بدر سے قبل کہا تھا:۔

"میں انصار کی طرف سے شرح صدر کے ساتھ کہتا ہوں، اور ان کی جانب سے جواب بھی دیتا ہوں کہ آپ جہاں چاہیں مقیم ہوں جس کا تعلق چاہیں قائم رکھیں اور جس کا چاہیں توڑ دیں، اور ہمارے مال و دولت سے جو چاہیں لے لیں اور جو چاہیں دے دیں، جو کچھ کہ آپ ہم سے لے لیں گے وہ اس سے زیادہ محبوب ہوگا، جو آپ چھوڑ دیں گے اور جس بارے میں جو کچھ حکم فرمائیں گے ہم اس کے تابع ہوں گے، بخدا اگر آپ برک غمدان تک چلے جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ چل پڑیں گے، اور خدا کی قسم اگر آپ سمندر میں گھوڑا ڈال دیں گے تو ہم بھی اس میں کود پڑیں گے"[2]

---

[1] زاد المعاد ج ۲ ص ۱۲۵ [2] ایضاً ص ۱۳۰

ان کی اطاعت کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ جب رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ان تین شخصوں سے گفتگو ممنوع قرار دی تھی جو غزوۂ تبوک نہ جا سکے تھے تو لوگوں نے آپ کی بات مانی اور مدینہ ان تینوں کے لئے شہر خموشاں بن گیا جہاں کوئی بات کرنے والا اور بات کا جواب دینے والا نہ تھا، کعب کہتے ہیں :۔

"رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ہم تینوں سے گفتگو منع فرمادی تھی لوگ ہم سے کترانے لگے اور ان کی نگاہیں بدل گئیں حتیٰ کہ مجھے زمین تنگ محسوس ہونے لگی گویا وہ زمین ہی نہ تھی جس کو میں جانتا تھا، یہاں تک کہ جب لوگوں کی میرے ساتھ بے رُخی بہت بڑھ گئی میں چلا اور ابو قتادہ کی دیوار پھاند کر ان کے باغ میں گھس گیا، یہ ابو قتادہ وہ ہیں جو میرے محبوب چچا زاد بھائی تھے اور میرے سب سے زائد چہیتے تھے، میں نے ان کو سلام کیا بخدا انھوں نے مجھے جواب بھی نہ دیا تو میں نے ان سے کہا اے ابو قتادہ میں تم کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں، کیا تم کو علم ہے کہ میں اللہ و رسولؐ سے محبت رکھتا ہوں، وہ خاموش رہے میں نے پھر دُہرایا، ان کو واسطہ دیا اور وہ خاموش رہے، میں نے مکرر کہا اور ان کو واسطہ دیا، تو وہ بولے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کو زیادہ علم ہے، میری آنکھیں بھر آئیں اور میں پلٹ پڑا اور دیوار پھاند کر باہر نکل آیا۔"[1]

ان کی اطاعت کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ وہ ناراضگی و بے رُخی کے ہدف تھے کہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا قاصد آتا ہے اور کہتا ہے کہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) تم کو حکم دیتے ہیں کہ اپنی بیوی سے علیحدہ رہنا، وہ بولے "طلاق دیدوں یا کیا کروں؟" وہ بولا "نہیں، بلکہ الگ رہو ان کے قریب مت جاؤ" تو انھوں نے اپنی بیوی سے کہہ دیا اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ، ان ہی کے

[1] بخاری و مسلم

پاس رہو حتیٰ کہ اللہ تعالےٰ اس معاملہ میں کچھ فیصلہ کر دے۔[1]

رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) سے ان کی محبت و تعلق کا یہ حال تھا کہ ہر ایک پر آپ کو ترجیح دیتے تھے، عین اس مقاطعہ کے زمانہ میں غسان کا بادشاہ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور اپنے دربار کی پیش کش کرتا ہے اس بے رخی اور عتاب کے زمانے میں یہ حقیقتاً سخت آزمائش تھی لیکن وہ رد کر دیتے ہیں کہتے کہ میں مدینہ کے بازار میں چل رہا تھا کہ ان شامی نبطیوں میں سے جو مدینہ میں غلہ فروخت کرنے آتے تھے ایک نبطی کہتا ہے کعب بن مالک کو کوئی بتا دے یہ سن کر لوگ میری جانب اشارے کرنے لگے اس نے میرے پاس پہونچ کر شاہ غسان کا ایک خط حوالے کیا میں پڑھا لکھا تھا، میں نے اس کو پڑھا، اس میں تحریر تھا کہ :-

"ہم کو یہ خبر ملی ہے کہ تمہارے آقا نے تم سے بے رخی اختیار کر لی ہے، اللہ تعالےٰ نے تم کو ذلت کے لئے نہیں رکھا اور وہ تم کو ضائع کرنا نہیں چاہتا ہے، بس تم ہم سے مل جاؤ ہم تمہارا بہت خیال کریں گے۔"

میں نے جب پڑھ لیا تو کہا کہ یہ بھی ایک آزمائش ہے، اور میں نے جا کر اسے تنور کی نذر کر دیا۔[2]

اطاعت اور فوری تعمیل حکم کی ایک مثال وہ واقعہ ہے جو شراب کی حرمت کے حکم کے وقت پیش آیا، حضرت ابو بریدہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ :-

"ہم مجلس میں بیٹھے شراب پی رہے تھے کہ میں اٹھا تا کہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضری دوں اور سلام کروں، ادھر شراب کی حرمت نازل ہو چکی تھی۔"

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ	اے ایمان والو بات یہی ہے کہ شراب اور جوا
وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ	اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی
مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ	باتیں ہیں شیطانی کام ہیں سو ان سے بالکل

---

[1] بخاری و مسلم [2] ایضاً

تُفْلِحُوْنَ۝ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ	الگ رہو تاکہ تم کو فلاح ہو شیطان تو
یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ	یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ
فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّکُمْ عَنْ	سے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض واقع
ذِکْرِ اللّٰہِ وَعَنِ الصَّلٰوۃِ فَھَلْ اَنْتُمْ	کردے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز
مُّنْتَھُوْنَ۝ (المائدہ۔۹۰،۹۱)	سے تم کو باز رکھے، سو اب بھی باز آؤگے.

میں اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور میں نے یہ آیت "ھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ" (کیا تم رک جاؤگے) تک پڑھ کر سنادی کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کے ہاتھ میں ساغر تھا، کچھ پیا تھا اور کچھ ساغر میں بچ رہا تھا جو شراب ہونٹوں میں پہونچ گئی تھی وہ فوراً تھوک دی گئی۔[1]

رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت اور اپنے نفس پر، گھر والوں اور خاندان والوں پر آپ کو ترجیح دینے کی عجیب و غریب مثال یہ ہے کہ عبداللہ بن اُبی کے بیٹے عبداللہ کو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے بلایا اور فرمایا "دیکھتے ہو تمہارے والد کیا کہتے ہیں؟" وہ بولے یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان وہ کیا کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا "کہتے ہیں کہ اگر مدینہ واپسی ہوئی تو جو معزز ہوگا وہ ذلیل کو نکال دے گا" وہ بولے "خدا کی قسم یا رسول اللہ! انھوں نے سچ کہا، بخدا آپ معزز ہیں اور وہ ذلیل ہیں، یا رسول اللہ آپ مدینہ تشریف لائے اور اہلِ یثرب کو علم ہے کہ وہاں مجھ سے بڑھ کر اپنے باپ کا کوئی فرمانبردار نہیں اگر اللہ و رسول کی مرضی یہ ہے کہ میں اس کا سر لے آؤں تو میں حاضر ہوں، رسول اللہ نے فرمایا "نہیں!"

جب لوگ مدینہ پہونچے تو عبداللہ بن عبداللہ بن اُبی مدینہ کے دروازے پر تلوار لے کر اپنے باپ کے انتظار میں کھڑے ہوگئے جب ان کے والد آئے تو بولے:۔

"تم ہی کہتے تھے اگر مدینہ واپسی ہوئی تو جو معزز ہوگا وہ ذلیل کو نکال دے گا؟ تم کو ابھی معلوم

---

[1] تفسیر ابن جریر ج ۷

ہو جائے گا کہ معزز کون ہے؟ خدا کی قسم! تم مدینہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اجازت کے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

اس نے کہا:۔

"اے خزرج کے لوگو! دیکھو میرا لڑکا مجھے میرے گھر سے روکتا ہے، اے خزرج کے لوگو! میرا لڑکا مجھے میرے گھر سے روکتا ہے۔"

وہ بولے:۔

"خدا کی قسم! یہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی اجازت کے بغیر مدینہ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔"

لوگ اکٹھا ہو گئے اور ان کو سمجھایا، انھوں نے کہا:۔

"یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا۔"

لوگ نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے آپؐ کو خبر دی، آپؐ نے فرمایا:۔

"جاؤ اور عبداللہ سے کہہ دو کہ آنے دو۔"

لوگ واپس آئے، انھوں نے کہا:۔

"ہاں! اب جب کہ نبی کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) کی اجازت آگئی ہے، وہ مدینہ میں داخل ہو سکتا ہے۔"[1]

نئے افراد اور نئی امت

اس وسیع و عمیق ایمان، اس محکم پیغمبرانہ تعلیم، اس دقیق و حکیمانہ تربیت، اپنی عجیب و غریب طاقت و شخصیت اور اس محیر العقول آسمانی کتاب کے ساتھ کہ جس کے عجائب و غرائب ختم ہونے کو

---

[1] تفسیر طبری۔ ج ۲۸

نہیں آتے، اور حسن کی تازگی میں کبھی فرق نہیں پیدا ہوتا، رسول اللہ ﷺ نے جاں بلب انسانیت میں ایک نئی زندگی پیدا کردی، انسانیت کے وہ ذخائر جو خام اشیاء کی شکل میں پڑے پڑے ضائع ہو رہے تھے جن کی افادیت اور مصرف کی کسی کو خبر تک نہ تھی اور جن کو جہالت، کفر اور کم ہمتی نے برباد کر رکھا تھا، آپ ﷺ نے ان کی زندگی کا رُخ بدل دیا، اس میں خدا کی مدد سے ایمان و عقیدہ پیدا فرما دیا، زندگی کی نئی رُوح پھونک دی، دبی ہوئی صلاحیتیں اُبھار دیں اور اندرونی استعدادیں اُجاگر کر دیں، پھر ہر ایک کو اس کی صحیح جگہ عطا فرمائی گویا کہ اسی کے لئے اس کا وجود تھا اور گویا کہ جگہ خالی تھی اور اس کی منتظر تھی، وہ بے جان پتھر تھا، اب وہ ایک جیتا جاگتا انسان بن گیا، وہ بے حس و حرکت مردہ تھا، اب وہ زندہ ہو کر دنیا پر حکومت کرنے لگا، پہلے نابینا تھا جس کو خود رستہ کا پتہ نہ تھا اب ساری دنیا کا رہبر و رہنما بن گیا:۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ	بھلا وہ جو مردہ ہو ہم نے اس کو زندہ کیا اور
نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ	اس کو ایک نور عنایت کیا جس کے ذریعہ وہ
فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ	لوگوں میں چلتا ہو اس جیسا ہے جو اندھیروں
(الانعام ۔ ۱۲۲)	میں گم ہو نکل نہ سکتا ہو۔

آپ کی توجہ و تعلیم سے عرب کی برباد شدہ قوم میں ایسا انقلاب ہوا کہ دنیا نے تھوڑے ہی عرصہ میں ان میں وہ عظیم الشان شخصیتیں دیکھیں جو عجوبۂ روزگار اور دنیا کی تاریخ میں یادگار ہیں، وہ عمرؓ جو اپنے باپ خطاب کی بکریاں چرایا کرتے تھے اور ان کے باپ ان کو جھڑکا کرتے تھے اور جو کہ قوت و عزم میں قریش کے متوسط لوگوں میں تھے، جن کو کوئی غیر معمولی امتیاز حاصل نہ تھا، ان کے معاصران کو غیر معمولی اہمیت نہیں دیتے تھے، وہی عمرؓ تھے کہ یکبارگی تمام عالم کو اپنی عظمت و صلاحیت سے متحیر بنا دیتے ہیں، اور قیصر و کسریٰ کو تخت و تاج سے محروم کر دیتے ہیں، اور ایسی اسلامی سلطنت

بنا ڈالتے ہیں، جو بیک وقت ان دونوں حکومتوں پر حاوی ہے اور تدبیر و حسنِ انتظام میں ان سے فوقیت رکھتی ہے ورع وتقویٰ اور عدل کو چھوڑ دیجئے کہ ان میں تو وہ ضرب المثل ہیں۔

یہ ولید کے فرزند خالد ہیں، قریش کے نوجوان حوصلہ مندوں میں سے ایک شخص تھے مقامی جنگوں میں انھوں نے نام پیدا کیا تھا، قریش کے سردار قبائلی جنگوں میں ان سے مدد لیتے تھے، انھوں نے جزیرۃ العرب کے علاقوں میں کوئی بڑی شہرت بھی حاصل نہیں کی تھی، اچانک وہ آسمانی تلوار (سیف من سیوف اللہ) بن کر چمکتے ہیں، جو چیز سامنے آتی ہے کٹ جاتی ہے، یہ خدائی تلوار روم پر بجلی بن کر گرتی ہے، اور تاریخ کے طول و عرض میں اپنے تذکرے چھوڑ جاتی ہے۔

یہ ابو عبیدہ ہیں جن کی امانت اور نرمی کی تعریف کی جاتی تھی وہ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے لشکروں کی قیادت کر لیا کرتے تھے، ان کو دیکھئے کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی قیادت کا بوجھ سنبھال لیتے ہیں، اور ہرقل کو شام کے ہرے بھرے ملک سے ہمیشہ کے لئے نکال دیتے ہیں، غریب اس پر وداعی نظر ڈالتا ہے اور کہتا ہے اے ملک شام تجھ کو رخصتی سلام، ایسا سلام جس کے بعد کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔

یہ عمرو بن العاص ہیں، جن کا شمار قریش کے سمجھدار لوگوں میں تھا قریش ان کو حبشہ کا سفیر بنا کر بھیجتے ہیں تاکہ مسلمان مہاجرین کو واپس لے آئیں مگر ناکام واپس ہوتے ہیں، ان کو دیکھئے مصر فتح کرتے ہیں اور زبردست اقتدار کے مالک بن جاتے ہیں۔

اور یہ سعد بن ابی وقاص ہیں، اسلام سے قبل اُن کے متعلق نہ کسی بڑی فوجی قیادت کا پتہ چلتا ہے اور نہ کسی ماہر جنگ کی حیثیت سے ان کی شہرت ہے ان کو دیکھئے مدائن کی کنجیاں سنبھالتے ہیں اور عراق و ایران کو اسلامی سلطنت میں شامل کر کے ہمیشہ کے لئے فاتح عجم کہلاتے ہیں۔

یہ سلمان فارسی ہیں ایک مذہبی عہدہ دار کے بیٹے تھے، فارس کا ایک گاؤں وطن تھا، ایک غلامی سے

دوسری غلامی اور ایک مصیبت سے دوسری مصیبت دیکھتے ہوئے مدینہ پہونچتے ہیں اور اسلام قبول کرتے ہیں ان کو دیکھئے؟ اپنی ہی قوم کے عظیم الشان دار السلطنت (مدائن) کے حاکم بن کر پہونچتے ہیں کل جہاں کی رعیت کے ایک فرد تھے آج اس ملک کے حکمراں ہیں اور اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس سے ان کے زہد و سادگی میں فرق نہیں پڑتا لوگ ان کو اس حال میں دیکھتے ہیں کہ ایک جھونپڑی میں قیام ہے سر پر بوجھ ڈھوتے ہیں۔

یہ بلال حبشی ہیں فضیلت و عزت میں اس درجہ کو پہونچتے ہیں کہ امیر المومنین ان کو اپنا سردار کہتے ہیں۔

یہ ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام ہیں جن میں حضرت عمرؓ کو خلافت کی صلاحیت نظر آتی ہے، فرماتے ہیں: "اگر حیات ہوتے تو میں ان کو خلیفہ بناتا"

یہ زید بن حارثہ ہیں جنگ موتہ کے لئے مسلمانوں کے لشکر کی قیادت کرتے ہیں اور اسی لشکر میں جعفر بن ابی طالب، خالد بن ولید جیسے ممتاز لوگ بھی موجود ہیں، اور ان کے بیٹے اُسامہ اس لشکر کی قیادت کرتے ہیں جس میں ابو بکرؓ، عمرؓ جیسے افراد موجود تھے۔

یہ ابوذرؓ، مقدادؓ، ابو الدرداءؓ، عمار بن یاسرؓ، معاذ بن جبلؓ اور اُبی بن کعبؓ ہیں اسلام کی باد بہاری کا ایک جھونکا چل جاتا ہے، اور وہ دنیا کے نامور زاہدوں اور جلیل القدر عالموں میں دیکھتے دیکھتے شمار ہونے لگتے ہیں۔

یہ علی بن ابی طالبؓ اور عائشہؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ اور زید بن ثابتؓ اور عبد اللہ بن عباسؓ ہیں جو نبی اُمی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی گود میں پل کر دُنیا کے عظیم ترین عالموں میں شمار ہونے لگے جن سے علم کی نہریں بہتی ہیں، اور حکمت اُن کی زبان پر جاری ہو جاتی ہے قلب کے سچے، علم کے گہرے اور تکلف سے دور، بات کرتے ہیں تو زمانہ ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگتا ہے خطاب کرتے ہیں تو دنیا کے مؤرخ کا قلم لکھنے میں مشغول ہو جاتا ہے کہ کوئی لفظ ضائع نہ ہو۔

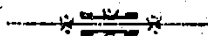
متوازن انسانی مجموعہ

پھر تھوڑا عرصہ بھی نہیں گذرتا کہ متمدن دنیا دیکھتی ہے کہ وہ خام اشیاء جو بکھری پڑی تھیں، جن کی معاصر قوموں نے بھی ذرا قدر نہ کی تھی اور پڑوسی ملکوں نے جن کا مذاق اُڑایا تھا، اس سے ایک ایسا مجموعہ تیار ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ نے اس سے زیادہ متوازن و مکمل مجموعۂ کمالات نہیں دیکھا، جیسے ایک ڈھلا کرہ، یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ اس کا سرا کدھر ہے، یا بارانِ رحمت کی طرح کہ اس کا پتہ نہ چل سکے کہ اس کا پہلا چھینٹا مبارک ہے یا آخری، ایسا مجموعہ جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی صلاحیت رکھتا ہے، دین و دنیا کی ہر ضرورت کے لئے اس کے پاس سامان موجود ہے، اس لئے اس کو کسی سے مدد کی ضرورت نہیں، لیکن دنیا اس کی مدد کی محتاج ہے۔

اس نوزائیدہ جماعت نے اپنی تہذیب کی خود بنیاد ڈالی، نئی حکومت کی داغ بیل ڈالی، حالانکہ اس کو اس سے پہلے اس کا کوئی تجربہ نہ تھا، اس کے باوجود اس کو ذرا ضرورت نہ پڑی کہ کسی دوسری قوم سے کوئی آدمی مستعار لے، یا کسی انتظام میں کسی حکومت سے مدد چاہے، ایسی حکومت کی بنیاد ڈالی جس کا سکہ دو بڑے برِّ اعظموں کے وسیع رقبہ میں چلتا تھا، اس کے ہر شعبہ اور ہر ضرورت کے لئے متعدد آدمی ایسے تھے، جو اپنی لیاقت، کارکردگی، امانت و دیانت، قوت اور احساس ذمہ داری میں بے نظیر تھے، یہ عالمگیر سلطنت قائم ہوئی تو اس نوزائیدہ قوم نے جس پر تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا اس کو پورے آدمی فراہم کئے جن میں کوئی عادل حاکم تھا، کوئی امانت دار خازن، کوئی منصف قاضی تھا اور کوئی عبادت گذار قائد، کوئی پرہیزگار اور متقی فوجی تھا، اس ذہنی تربیت کی برکت سے جس کا کام مسلسل جاری تھا، اور اس اسلامی دعوت کی مدد سے جو مستقل چل رہی تھی اس اسلامی حکومت کو اہل ترین خدا ترس، فرض شناس و مستعد کارکن ملتے رہے، حکومت کی ذمہ داری

ان ہی اشخاص کے سپرد ہوتی جو ہدایت کو تحصیل وصول کے جذبہ پر ترجیح دیتے، جو اپنے کو بجائے تحصیلدار کے مبلّغ و ہادی سمجھتے جن کی شخصیت میں صلاحیت و صلاح اور دین و دنیا کا صحیح امتزاج ہوتا ان کے اثر سے اسلامی تہذیب اپنی پوری خصوصیتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی، اور دین کے برکات اس طرح وجود میں آئے کہ پھر کسی دور میں دیکھنے میں نہیں آئے۔

حقیقت میں محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے نبوت کی کنجی انسانی فطرت کے قفل پر رکھ دی تھی بس وہ کھل گیا اور اس کے تمام خزانے عجائبات، طاقتیں اور کمالات دنیا کے سامنے آگئے، آپؐ نے جاہلیت کی شہ رگ کاٹ دی اور اس کے طلسم کو پاش پاش کر دیا، آپ نے سرکش اور ضدی دنیا کو خدا کی طاقت سے مجبور کر دیا کہ زندگی کی ایک نئی شاہراہ پر گامزن ہو اور تاریخ میں انسانیت کے ایک بالکل نئے دور کا آغاز کرے، یہ وہ اسلامی دور ہے جو تاریخ کی پیشانی پر ہمیشہ دمکتا رہے گا۔



باب سوم

مسلمانوں کا دورِ قیادت

مسلمانوں کی قائدانہ خصوصیات

مسلمان میدان میں آئے، دنیا کی رہنمائی کی باگ انھوں نے اپنے ہاتھ میں لی اور ان بیمار قوموں کو رہنمائی کے اس منصب سے معزول کیا جس پر وہ قابض ہوگئی تھیں اور جس کو انھوں نے کبھی صحیح طور پر استعمال نہیں کیا، مسلمانوں نے دنیا کے انسانوں کو اپنے ساتھ لے کر متوازن اور صحیح رفتار کے ساتھ صحیح منزل کی طرف بڑھنا شروع کیا، ان میں وہ تمام صفات جمع تھیں، جو ان کو قوموں کی رہنمائی کے منصب جلیل کا اہل ثابت کرتی تھیں اور ان کی نگرانی اور قیادت میں قوموں کی فلاح و سعادت کی ضمانت کرتی تھیں، یہ امتیازی صفات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ ان کے پاس آسمانی کتاب اور الٰہی شریعت تھی، اس لئے ان کو قیاس اور اپنی طرف سے قانون سازی کی ضرورت نہیں تھی، اور اس طرح وہ جہالت و ناواقفیت اور روز روز کے قانونی ردّ و بدل اور ترمیم ہولناک غلطیوں اور مظالم سے محفوظ تھے، وہ اپنے سیاست و معاملات میں اَدھا دھند چلنے اور اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور نہ تھے، ان کے پاس وحی اور شریعتِ الٰہی کی روشنی تھی جس کے سہارے وہ چلتے تھے، اور جس سے زندگی کی تمام راہیں اور اس کے موڑ ان کے لئے روشن تھے، ان کا ہر قدم روشنی میں پڑتا تھا اور منزل مقصود ان کو صاف نظر آتی تھی:۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا	کیا وہ جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس میں
لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ	جان ڈالی اور اس کو ایک روشنی عطا فرمائی
مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ	جس کی مدد سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے کیا
مِّنْهَا ۔	وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہے کہ
(سورۃ الانعام۔۱۲۳)	اندھیروں میں گھرا پڑا ہے وہاں سے نکل نہیں سکتا۔

ان کے پاس الٰہی قانون تھا جس کے مطابق وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے تھے، وہ حق و انصاف کے علم بردار بنائے گئے تھے، اور ان کو سخت سے سخت اشتعال و برہمی اور عداوت و بیزاری کی حالت میں بھی انصاف اور صداقت کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے اور نفس کا انتقام لینے کی اجازت نہیں دی گئی تھی :۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ	مسلمانو! خدا واسطے انصاف کے ساتھ
لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ	گواہی دینے کو آمادہ رہو اور کسی قوم کی دشمنی
شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ	کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو،
اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ	عدل کرو یہی بات زیادہ نزدیک ہے
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا	تقویٰ سے، اور ڈرتے رہو اللہ سے اللہ
تَعْمَلُوْنَ ۝ (المائدہ۔۸)	کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو۔

۲۔ وہ حکومت اور قیادت کے منصب پر مستحکم اخلاقی تربیت اور مکمل تہذیب نفس کے بعد فائز ہوئے تھے، انھوں نے دنیا کی عام حکمراں قوموں اور اہل حکومت کی طرح اپنے تمام اخلاقی عیوب و نقائص کے ساتھ پستی سے بلندی کی طرف جست نہیں لگائی تھی، بلکہ ایک طویل عرصہ تک وحی الٰہی ان کی اصلاح اور تربیت کرتی رہی تھی، اور سالہا سال وہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی

کامل نگرانی اور تعلیم میں رہے تھے آپؐ ان کا تزکیہ فرماتے رہے، ان کی مکمل تربیت فرمائی، زہد و ورع کی زندگی کا عادی بنایا، عفت و امانت، ایثار و قربانی، خوف خدا کا اُن کو خوگر کیا حکومت و مناصب کی حرص و طمع ان کے دل سے بالکل نکال دی، آپؐ کا ارشاد تھا کہ "بخدا ہم کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد نہیں کریں گے جس نے اس کی فرمائش کی یا جس کو اس کی خواہش ہے[1]"، ترفع، ذاتی سربلندی اور اعزاز کا شوق، اور فتنہ و فساد کی خواہش سے ان کے دل بالکل صاف ہو گئے تھے، اُن کے کانوں میں رات دن قرآن مجید کے یہ الفاظ پڑتے رہتے تھے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ	یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو عطا کریں گے
لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا	جو دنیا میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور
فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝	فساد کے خواہاں نہیں اور انجام بخیر
(القصص۔ ۸۳)	پرہیز گاروں ہی کا ہے۔

اس لئے وہ حکومت کے عہدوں اور منصبوں پر پروانہ وار نہیں گرتے تھے، بلکہ وہ اس کے قبول کرنے سے گریز کرتے تھے، اور اُن کی ذمہ داریوں سے لرزہ براندام ہو جاتے تھے، اُن میں سے ہر ایک پیچھے ہٹتا تھا، اور اپنے کو اس بار کا سزاوار نہیں سمجھتا تھا چہ جائے کہ وہ اپنا نام حکومت کے لئے پیش کریں، اپنے منہ سے تعریف کریں اور اپنی ذات کے لئے پروپگنڈا کریں، پھر جب وہ کسی ذمہ داری کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے تو اُس کو مال غنیمت یا لقمۂ تر نہ سمجھتے بلکہ اس کو اپنے ذمہ ایک امانت اور اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھتے اور یقین رکھتے کہ اللہ کے سامنے ان کو حاضر ہونا ہے، اور ہر چھوٹی بڑی چیز کا جواب دینا ہے، وہ یہ آیت ہمیشہ پیش نظر رکھتے۔

---

[1] روایت بخاری و مسلم۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا	مسلمانو! اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت
الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ	والوں کی امانتیں ان کو پہونچا دو اور
بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ	جب فیصلہ کرنے لگو لوگوں میں تو فیصلہ
(النساء ـ ۵۸)	کرو انصاف سے۔

نیز یہ ارشاد:۔

وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ	اور اسی نے تم کو زمین میں نائب کیا ہے اور
الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ	تم میں ایک کے ایک پر درجے بلند کئے تاکہ جو
دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ اِنَّ	نعمتیں تم کو دی ہیں ان میں تمہاری آزمائش
رَبَّکَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّہٗ	کرے، بے شک تمہارا پروردگار جلد سزا دینے والا
لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (الانعام ـ ۱۶۶)	اور وہی بخشنے والا مہربان ہے۔

۳۔ وہ کسی قوم کے خدمت گزار اور کسی نسل و وطن کے نمائندے نہ تھے جن کے پیش نظر محض اس کی خوشحالی اور ترقی ہو اور جو اس کی برتری اور تمام اقوام و اوطان پر اس کی سیادت کے قائل ہوں اور یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ ان کی قوم تنہا حکومت کرنے کے لئے، اور باقی تمام قومیں اس کی محکوم بننے کے لئے پیدا کی گئی ہیں، وہ عرب سے اس لئے نہیں نکلے تھے کہ دنیا میں عربی شہنشاہی کی بنیاد ڈالیں اور اس کے زیر سایہ راحت و عشرت کی زندگی گزاریں اور اس کے زیر حمایت دوسروں پر فخر و تکبر کریں نہ اس لئے کہ لوگوں کو رومیوں اور ایرانیوں کی غلامی سے نکال کر عربوں کی اور اپنی غلامی میں داخل کرلیں، وہ صرف اس لئے نکلے تھے کہ وہ بندگانِ خدا کو اپنے جیسے تمام بندوں کی بندگی سے نکال کر صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی بندگی میں داخل کریں، مسلمانوں کے سفیر ربعی بن عامرؓ نے یزدگرد شاہ ایران کے بھرے دربار میں اسی حقیقت کا اعلان کیا، انھوں نے کہا "اللہ نے ہم کو اس لئے بھیجا ہے کہ لوگوں کو

بندوں کی بندگی سے نکال کر ایک اللہ کی بندگی کی طرف، دنیا کی تنگی سے رہائی دے کر اس کی وسعت کی طرف اور مذاہب کے ظلم وستم سے نجات دے کر اسلام کے عدل وانصاف میں لائیں"[1] پس دنیا کی تمام قومیں اور تمام انسان اُن کی نگاہ میں ایک حیثیت رکھتے تھے، اگر فرق تھا تو محض دین کا، رسول اللہ کے اس ارشاد پر اُن کا پورا عمل تھا:۔

الناس کلھم من آدم وآدم من تراب لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی الا بالتقوی۔[2]	انسانوں کی ابتدا آدم سے ہے اور آدم کی خلقت مٹی سے، نہ کسی عرب کو کسی غیر عرب پر فضیلت ہے نہ کسی غیر عرب کو عرب پر سوائے تقویٰ کے۔
یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط (الحجرات۔ ۱۳)	اے آدمیو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے بنایا اور تمہاری ذاتیں اور قبیلے رکھے تاکہ آپس کی پہچان ہو، اللہ کے یہاں اسی کی عزت زیادہ ہے جو خدا ترسی اور تقویٰ میں بڑھا ہوا ہے۔

حاکمِ مصر حضرت عمرو بن العاص کے بیٹے نے ایک مصری کو ایک موقع پر کوڑا مارا اور اپنے باپ دادا پر فخر کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصری کو ان سے بدلہ لینے کا حکم دیا اور عمرو بن العاص سے کہا "تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا، حالانکہ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے ہیں"[3]

ان فاتحین اور حکمرانوں نے دین وعلم وتہذیب کی بخشش میں کبھی بخل وتنگدلی سے کام نہیں لیا اور حکومت واعزاز کے بارہ میں کبھی وطنیت اور رنگ ونسب کا لحاظ نہیں کیا،

[1] البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر۔ [2] خطبۂ حجۃ الوداع۔ [3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ عمر بن الخطاب، ابن جوزی

وہ ایک ابرِ کرم تھے' جو تمام عالم پر محیط تھا اور اس کا فیض سب کے لئے عام تھا' جو سارے عالم کو سیراب کرتا گیا' اور زمین کے ہر حصّہ نے اس کو دعائیں دیں اور مخلوقات نے اپنی اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق اس سے نفع اٹھایا۔[۱]

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

ان لوگوں کے زیرِ سایہ اور زیرِ حکومت دنیا کی تمام قوموں کو بلا اختلافِ رنگ و وطن' دین' علم' تہذیب اور حکومت میں اپنا پورا پورا حصّہ لینے اور عربوں کے ساتھ دنیا کی تعمیرِ نو میں شریک ہونے کا پورا موقع ملا' بلکہ ان کے بہت سے افراد بہت سی فضیلتوں میں عربوں سے سبقت لے گئے اور ان میں ایسے ائمہ' فقہا اور محدثین پیدا ہوئے جو خود عربوں کے سر کا تاج اور مسلمانوں کا سرمایۂ فخر ہیں' ابن خلدون کے الفاظ ہیں "یہ ایک عجیب تاریخی حقیقت ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کے حاملینِ علم میں باستثناء چند اکثر غیر عرب ہیں' کیا علوم شرعیہ میں اور کیا علوم عقلیہ میں اور اگر ان میں سے کوئی عربی النسب ہے' تو وہ اپنی زبان تربیت اور اساتذہ کے اعتبار سے عجمی ہے' باوجود اس کے کہ

---

[۱] حضرت ابو موسیٰ اشعری آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ نے جس ہدایت و علم کے ساتھ مجھے بھیجا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی زمین پر ایک بڑی بارش ہوئی اس کا ایک ٹکڑا نرم اور صاف تھا اس نے پانی کو قبول کر لیا اور بڑا سبزہ اور ہری گھاس پیدا ہوئی کچھ حصے سنگلاخ اور بنجر تھے' انھوں نے پانی کو روک لیا اور لوگوں نے اس سے نفع اٹھایا' پیا اور پلایا' اور ایک ٹکڑا ایسا تھا کہ بالکل چٹیل میدان نہ پانی کو روک سکتا ہے' اور نہ اس میں سبزہ اُگ سکتا ہے' یہ مثال ان کی ہے جنھوں نے دین کی سمجھ حاصل کی اور اللہ نے جس چیز کے ساتھ مجھے بھیجا ہے' اس سے ان کو نفع پہونچا' انھوں نے سیکھا اور سکھایا اور آخری مثال اس کی ہے جس نے سر بھی اٹھا کر نہ دیکھا کہ میں کیا لایا اور اللہ کی اس ہدایت کو قبول نہیں کیا جو مجھے دے کر اس نے بھیجا۔ (صحیح بخاری کتاب العلم)

دین عربی ہے اور اس کی شریعت لے کر جو پیغمبر آئے وہ بھی عرب ہی سے تعلق رکھتے تھے[۱] بعد کی صدیوں میں بھی ان غیر عرب مسلمانوں میں ایسے قائد حکمراں وزراء فضلاء علماء اور مشائخ پیدا ہوئے جو زمین کی زینت اور انسانیت کا گل سرسبد اور اپنی فضیلت شرافت نفس، جوہر و قابلیت اور دینداری اور علم میں نوادر روزگار تھے اور ان کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ خدا کے سوا ان کا کوئی صحیح شمار نہیں کر سکتا۔

۴۔ انسان مجموعہ ہے جسم و روح، قلب و عقل و جوارح کا، انسان حقیقی سعادت اور فلاح اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا اور انسانیت کو متوازن ترقی نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان کی یہ تمام قوتیں تناسب طور پر اس کے مرتبہ کے شایان شان نشو و نما اور پرورش نہ پائیں، دنیا میں صالح تمدن کا اس وقت تک وجود نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایسا دینی، اخلاقی، عقلی، مادی ماحول نہ قائم ہو جائے جس میں انسان کے لئے بسہولت تمام اپنے کمال انسانی کو پہونچنا ممکن ہو اور تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ زندگی کی رہنمائی اور تمدن کی جہازرانی ان لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہو جو روحانیت و مادیت دونوں کے قائل دینی و اخلاقی زندگی کا نمونہ، کامل عقل سلیم اور علم صحیح سے متصف ہوں، اگر ان کے عقیدہ یا تربیت میں ذرا سا بھی رخنہ یا دھبہ ہو گا تو وہ ان کے قائم کردہ تمدن میں بہت پھیل جائے گا، اور مختلف مظاہر اور صورتوں میں ظاہر ہو گا اگر کوئی ایسی جماعت غالب آ گئی جو صرف مادیت کی پرستار مادی لذتوں اور محسوس منفعتوں کی قائل اور معتقد ہے وہ اس زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی پر اعتقاد نہیں رکھتی اور حواس کے ماوراء کسی اور حقیقت پر اس کا یقین نہیں تو اس کے مزاج اس کے اُصول اور میلانات کا اثر تمدن کی تشکیل و ساخت پر پڑنا ناگزیر ہے، وہ تمدن اُس کے مخصوص سانچہ میں ڈھل کر رہے گا، اور اس پر اس کی چھاپ ہمیشہ باقی رہے گی، اس کا نتیجہ ہو گا کہ انسانیت کے

---

[۱] مقدمۂ ابن خلدون مطبوعہ مصر ص ۴۹۹

بہت سے خانے بھر جائیں گے اور بہت سے خانے خالی رہ جائیں گے' اس تمدن کی نمود صرف اینٹ' پتھروں' کاغذ' کپڑے' اور لوہے اور سیسے میں ہوگی' جنگ کے میدان' عدالتیں' لہو ولعب کے مرکز اور عیش و عشرت کے حلقے اس کے مرکز ہوں گے اور وہاں وہ اپنی پوری بہار اور شباب پر ہوگا' باقی دل اور روح' لوگوں کے اخلاق' خانگی زندگی اور معاشرت تعلقاتِ باہمی اور معاملات اس کے حلقۂ اثر سے خارج ہوں گے' اور وہاں انسان حیوانات سے ممتاز نہ ہوگا' تمدن کی کیفیت اس جسم کی سی ہوگی جس میں غیر طبعی فربہی طاری ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ ظاہری نگاہ میں بڑا شاندار اور پرشکوہ معلوم ہوتا ہے لیکن اندرونی طور پر وہ بیسیوں امراض اور تکالیف میں مبتلا ہوتا ہے' اس کا قلب ضعیف اور ماؤف ہوتا ہے' اور اس کی صحت نقطۂ اعتدال سے ہٹی ہوئی ہوتی ہے۔

اس کے برخلاف اگر ایسی جماعت غالب آ جائے جو سرے سے مادیت کی منکر یا اس کی طرف سے بے پرواہ اور صرف روحانیت اور مابعد الطبیعات حقائق کی قائل ہو اور اس کا رویہ زندگی کے بارہ میں مخالفانہ اور معاندانہ ہو تو تمدن کا شاداب پھول کمھلا جائے گا' انسانی قوتیں اور فطری صلاحیتیں ٹھٹھر جائیں گی' اس قیادت کے اثر سے لوگ صحراؤں اور غاروں کی زندگی کو شہری زندگی اور تجرد کو ازدواجی زندگی پر ترجیح دینے لگتے ہیں' خود آزادی اور جسمانی تعذیب مستحسن ہو جاتی ہے تاکہ جسم کا تسلط کمزور پڑ جائے اور روح پاک و بے آمیز ہو جائے لوگ موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں' تاکہ مادیت کے پرشور اور پر تلاطم اقلیم سے نکل کر روحانیت کی پرسکون اور پرامن اقلیم میں پہونچ جائیں اور وہاں اپنی تکمیل کے مدارج حاصل کریں' اس لئے کہ ان کے عقیدہ میں اس عالم مادی میں انسان کی تکمیل ممکن نہیں' اس کا طبعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمدن پر عالم نزع طاری ہو جاتا ہے' شہر ویرانے بننے لگتے ہیں' اور زندگی کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے' چونکہ یہ اصول و عقائد فطرتِ انسانی سے برسرِ جنگ ہیں اس لئے فطرت ان کے خلاف رہ رہ کر بغاوت کرتی ہے' اور اس کا انتقام

ایسی حیوانی مادیت سے لینی ہے جس میں روحانیت واخلاق کے ساتھ کوئی رواداری نہیں برتی جاتی، اس انقلاب میں انسانیت کی جگہ ایک چوپایانہ زندگی یا درندگی یا مسخ شدہ انسانیت برسرِ ظہور ہو جاتی ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس رہبانی جماعت پر کوئی طاقت ور مادی جماعت حملہ آور ہوتی ہے اور پہلی جماعت اپنی فطری کمزوری کی وجہ سے اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو کر حملہ آور جماعت کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے یا رہبانی جماعت خود امورِ دنیاوی کے انصرام میں مشکلات محسوس کر کے مادیت اور اہلِ مادیت کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھاتی ہے اور تمام سیاسی اُمور اُن کو سپرد کر کے خود عبادات اور مذہبی رسوم پر قانع ہو جاتی ہے اور دین وسیاست کی تفریق وجود میں آتی ہے، روحانیت واخلاق روز بروز بے اثر اور عملی زندگی سے بے دخل ہوتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ انسانی سوسائٹی ان کی گرفت سے بالکل آزاد ہو جاتی ہے، زندگی خالص مادہ پرستانہ بن کر رہ جاتی ہے اور دین واخلاق صرف ایک سایہ ہی سایہ بن کر یا ایک علمی نظریہ کے طور پر باقی رہ جاتے ہیں، دنیا کی کثر جماعتیں (جنھوں نے بنی نوع انسان کی قیادت ورہنمائی کی ہے) اس عیب سے خالی تھیں یا وہ مادہ پرست تھیں یا رہبانی اس لئے انسانی تمدن اپنے اکثر عہد میں حیوانی مادیت اور رہبانی روحانیت کے درمیان جھولا جھولتا رہا، اور انسانوں کی کشتیِ حیات دو انتہائی سروں کے درمیان ہچکولے کھاتی رہی کبھی مادیت کا غلبہ ہو گیا اور کبھی روحانیت کا اعتدال وجامعیت بہت کم اس کو نصیب ہوئی۔

صحابۂ کرامؓ کا امتیاز

صحابۂ کرامؓ کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ دین واخلاق اور قوت وسیاست کے مکمل پیکر تھے، اور ان کی منتشر صفات ان میں بیک وقت جمع تھیں، ان میں انسانیت کی اپنے تمام گوشوں شعبوں

اور محاسن کے ساتھ نمود تھی اس اخلاقی اور اعلیٰ روحانی تربیت اس عجیب و غریب اعتدال (جو انسانوں میں کمتر دیکھنے میں آتا ہے) اس غیر معمولی جامعیت جس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے اور پھر مکمل مادی تیاری اور وسیع عقل کی بنا پر ان کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ انسانی گروہوں کو ان کے اعلیٰ روحانی واخلاقی و مادی مقصد و کمال تک پہونچا سکیں، چنانچہ ہم کو تاریخ میں خلافتِ راشدہ کے دور سے زیادہ ان تمام حیثیتوں سے مکمل اور کامیاب دور کا علم نہیں، اس دور میں روحانی واخلاقی، دینی و علمی و روحانی وسائل و سامان انسانِ کامل اور صالح تمدن کے وجود میں لانے میں ایک دوسرے کے مددگار تھے، اس حکومت میں جس کا شمار دنیا کی عظیم ترین حکومتوں میں تھا اور ایسی سیاسی و مادی قوت کے ساتھ جو تمام معاصر قوتوں سے فائق و برتر تھی اعلیٰ اخلاقی نمونے معیار کا کام دیتے تھے، اور اخلاقی تعلیمات زندگی اور نظام حکومت کے لئے میزان کا درجہ رکھتی تھیں، تجارت و صنعت کے ساتھ اخلاق اور فضیلت بھی اپنے پورے عروج پر تھی فتوحات کی وسعت اور تمدن کی ترقی کے ساتھ اخلاق و روحانیت کی ترقی بھی جاری تھی چنانچہ اسلامی حکومت کی غیر معمولی وسعت آبادی کی انتہائی افزونی عیش و عشرت کے وسائل و اسباب اور ترغیبات کے باوجود جرائم و بداخلاقیوں کے واقعات بہت کم پیش آتے تھے، فرد کا دوسرے فرد کے ساتھ اور فرد و جماعت کا باہمی تعلق حیرت انگیز طریقہ پر بہتر تھا یہ ایک معیاری دور تھا جس سے زیادہ ترقی یافتہ دور کا انسان خواب نہیں دیکھ سکا اور اس سے زیادہ مبارک و پُر بہار زمانہ فرض نہیں کیا جا سکا۔

یہ نتیجہ تھا محض ان لوگوں کی سیرت کا جو حکومت کا کاروبار چلا رہے تھے، اور تمدن کے نگراں تھے اور ان کے عقیدہ، تربیت، طرزِ حکومت، اور اُصول سیاست کا، اس لئے کہ وہ جہاں اور جس حال میں ہوتے دین و اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے، وہ حکام کی حیثیت میں ہوتے یا معمولی کارکنوں کی، پولیس کی حیثیت میں ہوتے یا فوج کی ہمیشہ محتاط و پاک دامن، دیانت دار، امانت شعار، خدا ترس اور منکسر مزاج پائے جاتے۔

ایک رومی سردار مسلمان فوجوں کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے "رات کو تم ان کو عبادت گزار پاؤ گے اور دن کو روزہ دار، عہد وفا کرتے ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں اور آپس میں پورا انصاف اور مساوات برتتے ہیں"[1]

دوسرے کے الفاظ ہیں "وہ دن کو شہسوار ہوتے ہیں اور رات کو عبادت گزار، اپنے مفتوحہ علاقہ میں بھی وہ قیمت دے کر کھاتے ہیں، سلام کرکے داخل ہوتے ہیں اور ایسا جم کر لڑتے ہیں کہ دشمن کا خاتمہ ہی کر دیتے ہیں"[2]

ایک تیسرے شخص نے ان الفاظ میں تعریف کی "رات کو دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ ان کو دنیا سے کچھ تعلق نہیں اور عبادت کے سوا کوئی کام نہیں، اور دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اس طرح نظر آئیں گے کہ گویا یہی کام ہے، بڑے تیر انداز اور بڑے نیزہ باز، خدا کی یاد میں اس طرح مشغول و تر زباں کہ ان کی مجلس میں کسی بات کا سننا مشکل ہوتا ہے"[3]

اسی اخلاقی تربیت کا نتیجہ تھا کہ مدائن کی فتح میں کسریٰ کا مرصّع تاج اور اس کا فرشِ بہار جو لاکھوں اشرفیوں کی مالیت کا تھا، فوج کے ہاتھ لگتا ہے لیکن کیا مجال کہ اس میں ذرا بھی تصرّف کیا جائے وہ قائد کے حوالہ کر دیتے ہیں اور قائد حضرت عمرؓ کو بھیج دیتے ہیں، وہ تعجب کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے اس کو حوالہ کر دیا اور حفاظت کے ساتھ پہونچایا ان کی امانت واقعی قابلِ تعریف ہے۔[4]

دنیا اور دنیا کی زندگی کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر و طرزِ عمل

رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کے پیروؤں کی یہ پہلی جماعت ایسی ہی تھی کہ اس کے سایہ اور

---

[1] روایت احمد بن مروان مالکی کتاب المجالسہ۔ [2] البدایہ والنہایہ (ابن کثیر) جلد ۷ صفحہ ۵۳

[3] ایضاً صفحہ ۱۶ [4] سیرۃ عمر بن الخطاب ابن جوزی۔

اس کی حکومت میں نوع انسانی کو پوری کامیابی وسعادت حاصل ہو اور اس کی قیادت میں اس کا جو قدم پڑے وہ صحیح پڑے اور صحیح منزل کی طرف اُٹھے، دنیا کو ہر قسم کا اطمینان اور فارغ البالی ہر طرح کی سرسبزی و شادابی اور خیر و برکت حاصل ہو انسانوں کی مصلحتوں کا ان سے زیادہ جاننے والا اور ان سے زیادہ ان کا خیال رکھنے والا، دنیا کے لئے ان سے بہتر نگراں و محافظ اور انسانوں کا ان سے بڑھ کر خیر خواہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا، وہ بعض اہلِ مذاہب کی طرح دنیا کی زندگی کو لعنت کا طوق نہیں سمجھتے تھے اسی کے ساتھ وہ اس کو عیش و عشرت کی آخری فرصت و مہلت بھی نہیں سمجھتے تھے کہ اس کا ایک ایک منٹ قیمتی سمجھتے اور اس کے لذائذ اور نعم کو کسی دوسرے دن کے لئے نہ اُٹھا رکھتے اسی طرح سے وہ اس زندگی کو کسی سابق قدیم گناہ کی سزا بھی نہیں سمجھتے تھے، جو ان کے لئے مقدر ہو چکی ہے نیز مادہ پرست اقوام کی طرح وہ دنیا کو خوانِ یغما بھی نہیں سمجھتے تھے جس پر وہ بھوکوں کی طرح گریں اور زمین کی دولتوں اور خزانوں کو پڑا ہوا لاوارثی مال نہیں سمجھتے تھے، جس کے لوٹنے کے لئے وہ ٹوٹ پڑیں، وہ کمزور قوموں کو شکار نہیں سمجھتے تھے جس کے شکار کرنے کے لئے وہ ایک دوسرے سے مقابلہ کریں ان کا اعتقاد تھا کہ یہ زندگی اللہ کی ایک نعمت ہے جس میں اللہ سے قرب حاصل کرنے اور اپنے کمال انسانی تک پہونچنے کا ان کو موقع دیا گیا ہے، اور عمل اور جدوجہد کی ایک مہلت ہے جس کے بعد اس کے لئے کوئی مہلت نہیں۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ	جس نے مرنا اور جینا بنایا تاکہ تم کو جانچے
اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط (الملک۔۲)	کہ کون تم میں عمل میں بہتر ہے۔
اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَۃً	ہم نے جو کچھ زمین پر ہے اس کو اس کی رونق
لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا	بنایا ہے تاکہ لوگوں کو جانچیں کہ کون ان میں
(الکہف۔۷)	زیادہ اچھا کام کرتا ہے

وہ اس عالم کو اللہ کی مملکت سمجھتے تھے جس میں اللہ نے ان کو اول بحیثیت انسان کے اور پھر بحیثیت مسلمان کے اپنا نائب اور اہلِ زمین کا نگراں بنایا۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (البقرہ۔ ۳۰)	میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔
ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (البقرہ۔ ۲۹)	وہی ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے واسطے پیدا کیا۔
وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰھُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰھُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا۔ (بنی اسرائیل۔ ۷۰)	ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور خشکی وتری دونوں میں اس کی سواری کا سامان کیا اور اچھی چیزیں اس کی روزی کے لئے مہیا کر دیں اور جو مخلوقات ہم نے پیدا کی ہیں اُن میں سے اکثر پر اُسے پوری پوری برتری دے دی۔
وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا۔ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا۔ (النور۔ ۵۵)	جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے ہیں ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کی خلافت ضرور عطا کرے گا جیسے ان لوگوں کو عنایت کی تھی جو ان سے پہلے تھے اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو ان کے لئے جما کر رہے گا اور خوف جو ان کو لاحق ہے اس کے بدلے امن دے گا میری بندگی کریں گے میرا کسی کو شریک نہ کریں گے۔

اُن کو اللہ نے زمین کی دولتوں سے بغیر اسراف و فضول خرچی کے فائدہ اٹھانے کا حق بخشا۔

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ○ (اعراف۔۳۱)	کھاؤ پیو مگر حد سے نہ گزر جاؤ خدا انہیں پسند نہیں کرتا جو حد سے گزر جانے والے ہیں۔
قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ ۚ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۔ (اعراف۔۳۲)	اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو خدا کی زینتیں جو اُس نے اپنے بندوں کے برتنے کے لئے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی اچھی چیزیں کس نے حرام کی ہیں؟ تم کہو یہ نعمتیں تو اسی لئے ہیں کہ ایمان والوں کے کام آئیں دنیا کی زندگی میں، قیامت میں خالص ہو کر۔

ان کو دنیا کی قوموں اور انسانی گروہوں پر نگراں اور اتالیق مقرر کیا ہے اور وہ ان پر مامور ہیں کہ وہ اُن کی رفتار سیرت و اخلاق اور رجحانات کا جائزہ لیتے رہیں، جو راہِ راست سے منحرف ہو جائے اُس کو صراطِ مستقیم پر لائیں، جو اعتدال سے بڑھ جائے اس میں اعتدال پیدا کریں، کجی کو دُور کرتے رہیں، رخنوں کو بھرتے رہیں، کمزور کو طاقتور سے اس کا حق دلائیں، مظلوم کا ظالم سے انصاف کرائیں اور خدا کی زمین میں انصاف و امن قائم رکھیں۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ (آل عمران۔۱۱۰)	تم سب امتوں سے بہتر ہو جو بھیجی گئی عالم میں، اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ	اے ایمان والو انصاف پر قائم رہو،

بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ ۰ (النساء ۱۳۵)   اللہ کی طرف سے گواہ بنو۔

ایک یوروپین نومسلم عالم نے مسلمانوں کے اس امتیاز کو اور دنیا کی زندگی کے بارہ میں اس معتدل نقطۂ نظر اور طرز عمل کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے اس کا اقتباس نامناسب نہ ہوگا:

"اسلام عیسائیت کی طرح دنیا کے متعلق بری رائے نہیں رکھتا، اس کی تعلیم ہے کہ ہم دنیاوی زندگی کی قدر و قیمت میں موجودہ مغربی تہذیب کی طرح مبالغہ نہ کریں، عیسائیت دنیاوی زندگی کی مذمت کرتی ہے اور اس سے نفرت رکھتی ہے موجودہ یورپ روحِ عیسویت کے خلاف زندگی پر ایسا گرتا ہے جیسے بوالہوس کھانے پر وہ اس کو نگلتا تو ہے لیکن اس کی عزت کرنا نہیں جانتا، اسلام ان دونوں کے برعکس زندگی کو سکون واحترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے، وہ زندگی کی پرستش نہیں کرتا بلکہ ایک بلند تر زندگی کے سفر کی ایک ضروری منزل سمجھتا ہے جس سے گزر جاتا ہے اس بنا پر انسان کو اس کی تحقیر اور اپنی اس دنیاوی زندگی کی بے وقعتی نہیں کرنی چاہئے، زندگی کے سفر میں ہمارا اس دنیا سے گزرنا ضروری اور اللہ کے یہاں مقدر ہو چکا ہے پس انسان کی زندگی اپنی پوری قیمت رکھتی ہے لیکن ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ محض ایک واسطہ اور آلہ ہے اور اس کی قیمت اس سے زائد نہیں جو واسطوں اور آلات کی ہوتی ہے اسلام اس مادہ پرستانہ نظریہ کا روادار نہیں جس کا قول ہے کہ میری سلطنت یہی دنیا ہے اور نہ وہ عیسائیت سے متفق ہے جو زندگی کی تحقیر کرتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ دنیا میری سلطنت نہیں اسلام کی راہ ان دونوں کے درمیان ہے، قرآن ہم کو اس جامع دعا کی تعلیم دیتا ہے "رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً" (اے اللہ ہم کو دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی) اس دنیا اور اس کی چیزوں کی قدر شناسی ہماری روحانی جدوجہد کے راستہ میں سنگ گراں نہیں

مادی ترقی اور خوش حالی نہ مقصود بالذّات ہے اور نہ ناپسندیدہ شئی، ہماری ساری کوششوں اور جد وجہد کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ایسے انفرادی و اجتماعی حالات واسباب پیدا ہو جائیں اور ایسا ماحول قائم ہو جائے، اور اگر موجود ہے تو ہم اس کو باقی رکھیں جو انسان کی اخلاقی طاقت کی ترقی میں مددگار ہو، اس اصول کے مطابق اسلام مسلمان میں ہر چھوٹے بڑے کام کے موقع پر اخلاقی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا چاہتا ہے، اسلام کا مذہبی نظام انجیل کی اس تقسیم کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ قیصر کا حق قیصر کو دے دو اور اللہ کا حق اللہ کو دو، اس لئے کہ اسلام ہماری زندگی کی ضروریات کو اخلاقی اور عملی قسموں میں تقسیم کرنے کا روادار نہیں، اس کے نزدیک انتخاب کا ایک ہی حق ہے، اور وہ یہ کہ انسان یا تو حق کو اختیار کرے یا باطل کو، اس کے نزدیک کوئی درمیانی چیز نہیں، اس لئے وہ عمل پر زور دیتا ہے کہ وہ اخلاق کا ایک لازمی جزو ہے، اسلامی تعلیمات کی رو سے ہر فرد مسلم کو اپنے آپ کو ماحول اور اس کے گردوپیش کے واقعات کا شخصی طور پر جواب دہ سمجھنا چاہیئے، اور اپنے تئیں دینی جدّ وجہد کے لئے مامور اور ہر وقت اور ہر سمت میں حق کے قیام اور باطل کے زوال کا ذمہ دار تصوّر کرنا چاہیئے، قرآن کریم ارشاد ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط (آل عمران ۱۱۰)	تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی، نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

یہی بات اسلام کی جارحانہ کارروائی، ابتدائی اسلامی فتوحات اور اسلامی ملوکیت کو

اخلاقی طور پر حق بجانب ثابت کرتی ہے پس اسلام استعماری (IMPERIALIST) ہے اگر یہ مفہوم انھیں الفاظ سے ادا ہو سکتا ہے لیکن استعمار IMPERIALISM کی اس قسم کی محرک حکومت اور غلبہ کی محبت بالکل نہیں اور نہ اقتصادی اور خود غرضی کو اس میں کچھ دخل ہے، مجاہدینِ اوّلین کو جو چیز میدانِ جنگ میں بڑے ذوق وشوق کے ساتھ لے جاتی تھی، وہ دوسروں کی دولت ومحنت کے ذریعہ عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے کی لالچ نہ تھی، اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک ایسا دنیاوی ڈھانچہ بنا دیا جائے جس میں انسان کے لئے بہتر سے بہتر روحانی ترقی ممکن ہو، اسلامی تعلیمات کی رُو سے اخلاق وفضیلت کا علم انسان سے اخلاقی ذمہ داری کا مطالبہ کرتا ہے، یہ بڑی بے غیرتی کی بات ہے کہ انسان نظری طور پر حق وباطل میں امتیاز کرے، پھر حق کی ترقی اور باطل کے زوال کے لئے جدوجہد نہ کرے، اسلام کی رُو سے اگر انسان حق اور نیکی کے غلبہ اور حکومت کے لئے سعی وجانفشانی کرتا ہے تو وہ زندہ رہتی ہے اور پھلتی پھولتی ہے اور اگر اس کی مدد اور تقویت میں دریغ کرتا ہے اور اس کی حمایت ونصرت سے دست کشی کرتا ہے تو اس کو زوال ہو جائے گا اور وہ بالکل مغلوب ہو جائے گی۔"[1]

اسلامی اقتدار اور اسلامی تمدّن کے اثرات ونتائج

پہلی صدی ہجری میں اسلامی تمدن کا اپنی پوری روح اور مظاہر کے ساتھ ظہور اور اسلامی حکومت کا اپنی صحیح شکل ونظام کے ساتھ قیام مذاہب، اخلاق کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز اور سیاست واجتماع کی دنیا میں ایک بالکل نیا واقعہ تھا، اس انقلاب سے تمدن کے دھارے کا رُخ

[1] ISLAM AT THE CROSS ROADS BY MOHAMMAD ASAD FORMERLY LEOPOLD WEISS PP. 26-29

اور دنیا کے سفر کی سمت بدل گئی، اسلام کی یہ عظیم الشان فتح جاہلیت کے لئے ایک ایسی آزمائش اور خطرہ تھا جس سے اس کو اس سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا، ابھی تک اس کے حریف (اسلام) کی حیثیت ایک دینی اور روحانی دعوت سے زیادہ نہ تھی، اب دفعتہً وہ سب کچھ ہو جاتا ہے، سعادت ونجات کا پورا نظام، روحانیت ومادّیت کا مکمل مجموعہ، زندگی اور قوت کا پورا مظہر، ایک مکمل تمدن اور اجتماع، ایک طاقتور حکومت، ایک کامل نظام سیاسی۔

اب ایک طرف ایک ایسا معقول سہل الفہم اور ممکن العمل دین تھا جو سراسر حکمت ومعقولیت تھا، دوسری طرف محض اوہام وخرافات اور قصہ کہانیاں، ایک طرف الٰہی شریعت اور آسمانی وحی تھی، اس کے مقابلہ میں محض قیاسات اور انسانی تجربہ اور انسانوں کا بنایا ہوا قانون۔

ایک طرف ایسا بلند وبرتر تمدن تھا جس کی بنیاد غیر متزلزل اور جس کے اصول غیر متبدل خوف خدا احتیاط وامانت کی رُوح اس کے پورے نظام میں جاری وساری تھی، اس کے حلقہ میں دولت وعزت کے مقابلہ میں اخلاق وپارسائی اور کھوکھلے مظاہر کے مقابلہ میں رُوح اور اصلیت کی عزت وقیمت زیادہ تھی، لوگوں میں مساوات تھی، اور اگر کسی کو کسی پر ترجیح حاصل تھی تو محض تقویٰ کی بنا پر، لوگوں کی بڑی توجہ اور اصل کوشش آخرت کے لئے تھی، اس لئے طبیعتوں میں اطمینان اور دلوں میں قناعت تھی، زندگی کے سامان واسباب میں کوئی حرص ومسابقت اور دنیا کی دولت پر پروانہ وار وارفتگی نہیں تھی، اس کے مقابلہ میں جاہلی تمدن تھا، پُرشور اور پُر تلاطم، متزلزل اور مضطرب، بڑا چھوٹے پر ظلم کرتا تھا، اور طاقتور کمزور کو کھائے ڈالتا تھا، لہو ولعب اور بداخلاقی میں مسابقت اور جاہ ودولت اور سامانِ عیش وراحت کے حصول میں سخت مقابلہ تھا، یہاں تک کہ دنیا ایک میدانِ جنگ اور زندگی عذاب جان بن کر رہ گئی تھی۔

ایک طرف عادل اسلامی حکومت تھی جو اپنی رعیت کو ایک نظر سے دیکھتی تھی کمزور کو طاقتور سے

اُس کا حق دلاتی تھی، لوگوں کے گھروں اور جان و مال کی طرح ان کے اخلاق کی نگرانی و حفاظت بھی اپنا فرض سمجھتی تھی، ان میں سب سے بہتر ان کے حکام تھے اور سب سے زاہدانہ زندگی ان لوگوں کی تھی جن کو سب سے زیادہ عیش و راحت کا سامان اور اس کے مواقع حاصل تھے، اس کے مقابلہ میں جاہلی حکومتیں تھیں جہاں ظلم و ستم رانی کا بازار گرم تھا، جس کے کارکنانِ حکومت نے خیانت و ظلم پر گویا کمر باندھ رکھی تھی، جس کے افراد لوگوں کا مال ناحق کھانے اور ان کی بے آبروئی و خونریزی میں ایک دوسرے سے بڑھ جانا چاہتے تھے، اور اپنے عمل کا نمونہ پیش کر کے لوگوں کے اخلاق خراب کرتے تھے، ان میں سب سے بدتر حکام اور بادشاہ تھے، ان کی حکومت میں انسان بھوکوں مرتے اور ان کے جانور اور کتے شکم سیر ہوتے، ان کے محل زرنگار پردوں میں ملبوس ہوتے اور لوگوں کو تن ڈھکنے کے لئے کپڑا نصیب نہ ہوتا۔

اب لوگوں کو اسلام میں کوئی رکاوٹ اور اس کے قبول کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی تھی، اور جاہلیت میں کوئی وجہ ترجیح نظر نہیں آتی تھی، آدمی کو اسلام قبول کرنے پر کچھ کھونا نہیں پڑتا تھا، اور سب کچھ حاصل ہو جاتا تھا، اس کو یقین کی ٹھنڈک، ایمان کی شیرینی، اسلام کی قوت ایک طاقتور حکومت کی سرپرستی اور ایسے دوستوں اور مددگاروں کی حمایت حاصل ہو جاتی تھی، جو اس پر اپنی جان و مال قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، اطمینانِ قلب اور موت کے بعد کی زندگی کے بارہ میں اعتماد و سکون حاصل ہوتا تھا، لوگ آسانی کے ساتھ جاہلیت کے محاذ سے اسلام کے محاذ کی طرف منتقل ہونے لگے، جاہلیت کے علاقہ میں اسلام پھیلنے لگا اور اسلام کو طاقت اور اقتدار حاصل ہوتا گیا، یہاں تک کہ کمزور طبیعتوں کے لئے بھی کفر و اسلام کے بارہ میں کوئی کشمکش باقی نہیں رہی، اور خالص اللہ کی فرماں برداری آسان ہو گئی۔

اس انقلاب کا اثر بہت وسیع اور گہرا تھا، خدا پرستی کی راہ جاہلیت کی حکومت و اقتدار میں دشوار اور خطرات سے بھری ہوئی تھی، اب بہت سہل اور محفوظ ہو گئی، جاہلیت کے حلقہ اور

ماحول میں خدا کی اطاعت مشکل تھی اب اسلامی ماحول میں خدا کی نافرمانی مشکل ہوگئی، کل تک برسر بازار اور ڈنکے کی چوٹ پر فسق و فجور اور جہنم کی طرف دعوت دی جاتی تھی اب ایسا کرنا بہت مشکل تھا، کل تک خدا کی ناراضگی اور اس کی نافرمانی کے اسباب و مواقع بکثرت اور بالاعلان تھے اب ان پر بڑی پابندیاں اور ان کے لئے بڑی رکاوٹیں تھیں، کل تک اللہ ہی کی زمین میں اللہ کی طرف دعوت دینا ایک جرم تھا جس کے لئے بڑی احتیاط اور رازداری کی ضرورت تھی اب وہ ایک ایسا کار خیر تھا جس کے لئے کسی رازداری اور پردہ کی ضرورت نہ تھی، نہ دعوت دینے والوں کو کوئی خطرہ تھا، اور نہ قبول کرنے والوں کو، قرآن مجید نے اس فرق کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے :۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ط	اور وہ وقت یاد کرو جب تمہاری تعداد بہت تھوڑی تھی اور تم ملک میں کمزور سمجھے جاتے تھے تم اس وقت ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تم کو اچک نہ لے جائیں پھر اللہ نے تمھیں ٹھکانا دیا اپنی مددگاری سے قوت بخشی اور اچھی چیزیں دے کر رزق کا سامان مہیا کر دیا تاکہ تم شکر گزار ہو۔
(الانفال۔ ۲۶)	

اس اقتدار و طاقت کی وجہ سے مسلمان لفظی و لغوی معنی میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے لگے، اور حکم و ممانعت کی قوت ان کو حاصل ہوگئی۔

جس طرح موسم بہار میں نباتات اور انسانوں کے مزاج موسم سے متاثر ہوتے ہیں اسی طرح محسوس اور غیر محسوس طریقہ پر اسلامی اقتدار و تمدن کے زمانہ میں لوگوں کی طبیعتیں اور ذہنیتیں متغیر

اور اسلام سے متاثر ہونے لگیں، دلوں میں گداز و نرمی پیدا ہونے لگی اسلام کے اُصول و حقائق دل و دماغ میں پیوست ہونے لگے، اشیاء کی قدر و قیمت کے بارہ میں لوگوں کا نقطۂ نظر بدلنے لگا، کل تک جن چیزوں اور جن صفات کی لوگوں کی نگاہ میں بڑی وقعت و اہمیت تھی اب وہ جاتی رہی اور جو چیزیں بے وقعت تھیں اب وہ وقیع بن گئیں، پُرانے معیاروں کی جگہ نئے معیاروں نے لی، جاہلیت رجعت پسندی اور جمُود کی علامت بن گئی، اور اس کے متّبعین میں احساس کمتری پیدا ہو گیا، اسلام کی طرف انتساب اس کے شعائر او خصوصیات کو اختیار کرنا ایک فخر اور تعریف کی چیز بن گئی، دنیا اسلام سے آہستہ آہستہ قریب ہو رہی تھی جس طرح اس کرۂ ارضی کے رہنے والوں کو آفتاب کے گرد گردش کا احساس نہیں ہوتا، اسی طرح ان قوموں کو اور ان کے افراد کو اپنے اسلامی رجحانات اور اسلام کے اندرونی اثرات کا احساس نہیں ہوتا تھا، ان اثرات سے نہ علم و فلسفہ خالی تھا نہ مذاہب و تمدن، لوگوں کے ضمیر اور ان کے باطن ان اثرات کی شہادت دیتے تھے، اور ان کے اصلاحی میلانات اس کی غمازی کرتے تھے، مسلمانوں کے تنزّل کے بعد بھی جو اصلاحی تحریکات ان قوموں میں پیدا ہوئیں وہ اسلامی اثرات اور اسلامی خیالات کا نتیجہ ہیں۔

اسلام نے توحید کی دعوت پیش کی اور بُت پرستی اور شرک کی ایسی مذمّت اور ہجو کی کہ بُت پرستی اور شرک ہمیشہ کے لئے بے وقعت اور ذلیل ہو گیا، لوگوں کو اس سے شرم آنے لگی، اور اس سے وہ اپنے کو بَری ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگے، یا تو وہ بڑی جرأت اور صفائی کے ساتھ اس کا اقرار کرتے تھے اور تعجب سے کہتے تھے:۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝ (ص - ۵)

کیا سب معبودوں کو (برطرف کرکے) ایک ہی معبود قرار دیدیا یہ تو بڑے اچنبھے کی بات ہے

یا اب اپنے مذہب کے مشرکانہ اجزا و اعمال کی تاویل و توجیہ اور اس کی تشریح کی ایسی کوشش کرنے لگے کہ

وہ توحید سے ملتی جلتی چیز نظر آئے، عیسائیوں میں ایسے گروہ پیدا ہوئے جو حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا انکار اور عقیدۂ تثلیث کی توحید نما تشریح کرتے تھے' ان میں ایسے مصلح بھی پیدا ہوئے جو عیسائیوں کے مذہبی گروہ اور راہل کلیسا کے اللہ اور بندہ کے درمیان وساطت کے منکر تھے' ان پر سخت تنقیدیں کرتے تھے' اور ان کے مخصوص حقوق کو نہیں مانتے تھے' آٹھویں صدی عیسوی میں یورپ میں ایک ایسا گروہ ظاہر ہوا جو پادریوں کے سامنے اپنے گناہوں کے اقرار کرنے کی مخالفت کرتا تھا اور جس کی دعوت تھی کہ صرف اللہ کے سامنے دعا و استغفار اور اپنے سابقہ گناہوں کا اعتراف واقرار کرنا چاہیئے اور اس میں کسی انسانی وساطت کی ضرورت نہیں۔[1]

اسی طرح آٹھویں صدی عیسوی سے نویں صدی تک یورپ میں اس تحریک کا بڑا زور رہا ہے کہ تصاویر اور بُت ایک خلاف مذہب فعل ہے' اور ان میں کوئی تقدیس نہیں؛ اس تحریک نے اتنا زور پکڑا اور اتنا اثر و اقتدار حاصل کر لیا کہ لیو سوم' قسطنطین پنجم اور لیو چہارم جیسے عظیم الشان شاہانِ روما نے اس کی حمایت اور پشت پناہی کی' اول الذکر نے ۷۲۶ء میں ایک فرمان صادر کیا جس میں سرکاری طور پر تصویروں اور بتوں کی تقدیس کی ممانعت کی گئی تھی' ۷۳۰ء میں دوسرے فرمان میں اس کو اس نے بُت پرستی قرار دیا تھا' مسیحی اور بُت پرست یورپ اور رومی یونانی تمدن (جس کی تصویر نوازی اور بُت تراشی شہرۂ آفاق ہے) میں تصویروں اور بتوں کے خلاف یہ انکار و جہاد یقیناً اسلام کی بُت شکنی اور اعلانِ توحید کی صدائے بازگشت تھی جو مغرب میں اسلامی اندلس اور اسلامی تبلیغ و اثرات کے ماتحت پہونچی' اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ کلوڈیس (CLADIUS) جو تورین کا لاٹ پادری اور اس تحریک و دعوت کا بڑا پُر جوش علم بردار تھا (یہاں تک کہ وہ اپنے حلقۂ اثر میں تصویروں اور صلیبوں کو جلا دیا کرتا تھا) اس کے متعلق تاریخی طور پر معلوم ہے کہ اس کی ولادت اور نشو و نما اندلس میں

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو صفحی الاسلام بحوالہ صلاح الدین خدا بخش۔

ہوئی ہے اور یہ دوسری صدی ہجری کا زمانہ ہے جب وہاں مسلمانوں کی حکومت اور مسلمانوں کا تمدن اپنے عروج پر تھا۔[۱]

یورپ کی مذہبی تاریخ اور مسیحی کلیسا کی سرگزشت کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اسلام کے ذہنی اثرات کے اور بہت سے نمونے اور نظیریں ملیں گی، خود لوتھر کی مشہور اصلاحی تحریک اپنے نقائص کے باوجود اسلام سے متاثر تھی، اور مورخین کو اس کا اعتراف ہے کہ اس کے بانی پر اسلامی تعلیمات کے اثرات پڑے تھے اور صرف مذہب ہی نہیں بلکہ یورپ کی پوری زندگی اور اس کا تمدن اسلام سے متاثر ہوا ہے، رابرٹ بریفالٹ ROBERT BRIFFAULT اپنی کتاب (THE MAKING OF - HUMANITY میں لکھتا ہے:۔

"یورپ کی ترقی کا کوئی شعبہ اور کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں اسلامی تمدن کا دخل نہ ہو اور اس کی ایسی نمایاں یادگاریں نہ ہوں جنھوں نے زندگی پر بڑا اثر ڈالا ہے۔"[۲]

دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"صرف طبعی علوم ہی (جن میں عربوں کا احسان مسلّم ہے) یورپ میں زندگی پیدا کرنے کے ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ اسلامی تمدن نے یورپ کی زندگی پر بہت عظیم الشان اور مختلف النوع اثرات ڈالے ہیں، اور اس کی ابتدا اسی وقت سے ہو جاتی ہے جب اسلامی تہذیب و تمدن کی پہلی کرنیں یورپ پر پڑنی شروع ہوئی ہیں۔"[۳]

اسی طرح ہندوستان کی قوموں کے اخلاق و معاشرت اور قانون سازی میں اسلامی ذہنیت اور اسلامی شریعت کے اثرات نظر آئیں گے، عورت کا احترام اور اس کے حقوق کا اعتراف مختلف انسانی گروہوں کے درمیان مساوات کا اصول اسلامی فتوحات اور مسلمانوں کے اختلاط کے بعد سے

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے ضحی الاسلام ج ۱ ص ۱۶۴-۱۶۵ بحوالہ صلاح الدین خدابخش۔ [۲] ایضاً ص ۱۹۰
[۳] ایضاً ص ۲۰۲

روز بروز زیادہ تسلیم کیا جانے لگا، غرض متمدن اور آباد دنیا کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن بعثت محمدی اور ظہورِ اسلام کے بعد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں سے قطعاً متاثر نہیں ہوا۔

اسلامی حکومت اور اسلامی تہذیب کے دورِ انحطاط میں بھی اسلام کی سابقہ دعوت اور قوت کے آثار اور یادگاریں باقی تھیں، انھیں میں سے ایک "خدا شناسی" تھی جو پوری اسلامی دنیا میں عام تھی، خدا کا خیال مسلمان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اس طرح اُتار دیا گیا تھا کہ وہ ہر قسم کے انقلابات و تغیرات اور دینی تنزّل میں بھی نہیں نکل سکا، مسلمان کے لئے فسق و فجور ممکن تھا (اور مسلمانوں کے دور تنزّل میں اس کا اچھی طرح ظہور ہوا) مگر خدا کا خیال دل و دماغ سے دور نہیں ہو سکا، نفسِ لوّامہ کی ملامت، ضمیر کی سرزنش، خدا کی موجودگی کا خیال اور آخرت کا کھٹکا بدمستی اور خود فراموشی کے عالم میں بھی دل میں چٹکیاں لیتا تھا، اور کبھی کبھی اپنا کام کر جاتا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ فسّاق و فُجّار بعض اوقات دفعۃً فسق و فجور سے توبہ کر کے صالحین و متقین کے گروہ میں شامل ہو جاتے، رندانِ خرابات ایک ٹھوکر سے ہوشیار ہو کر کعبہ کی راہ لیتے، بڑے بڑے شاہزادے اور ناز پرورد امیرزادے ایک معمولی سی غیبی تنبیہ سے (جس سے ہزار درجہ زیادہ تنبیہیں مادّیت و کفر کے دور میں بے اثر ثابت ہوتی ہیں) تخت و تاج چھوڑ کر فقر و درویشی اور صلاح و تقوے کی زندگی اختیار کر لیتے تھے، بعض مرتبہ قاری نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی:۔

اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ	کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت
قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ	نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے
الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا	اور جو دین حق نازل ہوا ہے اس کے سامنے
الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ	جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں
فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ	جن کو ان کے قبل کتاب ملی تھی پھر اسی حالت میں

فٰسِقُوْنَ ○ (الحدید-۱۶) ان پر ایسا زمانہ دراز گزر گیا پھر ان کے دل سخت ہوگئے اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ بہت سے آدمی ان میں کے آج کافر ہیں۔

بعض لوگ ایسا معلوم ہوا کہ سونے سے چونک گئے اور ان کی زندگی میں ہمیشہ کے لئے انقلاب ہوگیا، تاریخ ان مثالوں سے لبریز ہے۔

بغداد کے انتہائی تعیش اور غفلت کے دور میں صاحبِ تاثیر واعظوں اور صاحب دل ناصحوں کی مجلس مشکل سے ایسے واقعات سے خالی ہوتی تھی۔

مشہور عرب سیاح ابن جبیر اندلسی (م ۶۱۴ھ) جس نے ۵۸۰ھ میں بغداد دیکھا ہے شیخ رضی الدین قزوینی کی مجلسِ وعظ کا حال بیان کرتا ہے کہ "اثناء واعظ میں آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں جاری تھیں، لوگ پروانوں اور متوالوں کی طرح توبہ کے لئے ان کے ہاتھ پر گر رہے تھے، اور اپنے بال کاٹ رہے تھے"۔

حافظ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ (م ۵۹۷ھ) کی مجلس وعظ میں تو یہ حال تھا کہ لوگ چیخ مار مار کر روتے تھے، لوگوں پر غشی طاری ہوجاتی تھی، اور بیہوش ہو ہو کر گرتے تھے اور لوگ ہاتھوں میں اٹھا کر لے جاتے تھے، اپنی پیشانی کے بال ان کے ہاتھ میں دیتے تھے اور وہ سر پر ہاتھ پھیرتے تھے۔[۱]

حافظ ابن جوزیؒ نے خود ایک موقع پر تخمینہ لکھا ہے کہ ایک لاکھ انسانوں نے ان کے ہاتھ پر توبہ کی ہے[۲]، پانچویں صدی کے ایک محدث شیخ اسمٰعیل لاہوری کے متعلق مورخ کے الفاظ ہیں "ہزارہا مردم در مجلس وعظ وے مشرف باسلام شدند"[۳] ابن بطوطہ نے متعدد ہندوستانی واعظین کی تاثیر کے ایسے ہی واقعات لکھے ہیں۔
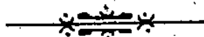
---

[۱] رحلۃ ابن جبیر ص۲۰۲ [۲] صید الخاطر ولفتۃ الکبد [۳] تذکرۂ علماء

کفر اور بے دینی کے تسلّط اور غلبہ کے زمانہ میں اثر پذیری کی ایسی مثالیں عنقا ہوتی ہیں، اس دور میں مؤثر سے مؤثر دینی خطابت اور اخلاقی نصائح بے اثر ہوتے ہیں۔

خدا کا خیال اس وقت کی زندگی میں داخل تھا جس سے کسی قوم یا مذہب یا فرقہ و خیال کا آدمی خالی نہ تھا، زبان و ادب میں خدا شناس طرز ادا، مذہبی تعبیرات اور وحی و رسالت کی زبان کے الفاظ و اصطلاحات روح و خون کی طرح جاری و ساری تھے کہ اس زبان و ادب کو اس سے معرّا نہیں کیا جا سکتا تھا، اسلامی تعبیرات، دینی آداب اور جملے غیر مسلموں کی زبان پر اس طرح جاری ہو گئے تھے اور وہ ان کے اس درجہ خوگر ہو گئے تھے کہ دوسرے ہم معنی جملوں سے ان کی تشفی نہیں ہوتی تھی، غیر مسلم ادیب اور فاضل قرآن مجید حفظ کرتے تھے مشہور غیر مسلم ادیب اور کاتب ابو اسحٰق صابی کے متعلق منقول ہے کہ وہ رمضان مبارک کے روزے بھی رکھتا تھا۔

خدا طلبی کا ذوق ساری اسلامی دنیا میں عام تھا، ہزاروں لاکھوں اشخاص اسلامی ملکوں اور شہروں میں دین کی طلب اور مردانِ خدا کی تلاش میں صحراؤں، پہاڑوں اور وادیوں کو عبور کر کے دنیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ میں پہنچتے تھے، خدا کی طرف بلانے والوں کی ذات مرجعِ خلائق اور ان کے مقامات طالبین خدا کے ہجوم سے معمور رہتے تھے اور ان کی آبادی اور رونق حکومت کے مرکزوں اور اہل حکومت کے دفاتر سے کہیں بڑھ کر تھی، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مجلس خلفاء عباسیہ کے دربار سے زیادہ پُر ہیبت اور بارونق تھی، امراء و اغنیاء بھی دین کے خیال اور خدا طلبی سے خالی نہ تھے، سوانح و تراجم کی کتابیں ایسی مثالوں سے پُر ہیں۔



باب چہارم

مسلمانوں کا تنزّل

مسلمانوں کے تنزّل کا آغاز اور اس کے اسباب

ایک ادیب نے خوب کہا ہے کہ "انسانی زندگی میں دو ایسے واقعات ہیں جن کا بالکل ٹھیک وقت ہم نہیں بتا سکتے، ان میں سے ایک جس کا تعلق فرد کی زندگی سے ہے نیند آنا ہے کوئی شخص آج تک اس خاص لمحہ کا تعیّن نہیں کر سکا جب جاگنے والا سو جاتا ہے، دوسرا واقعہ جس کا تعلق قومی زندگی سے ہے تنزّل یا زوال ہے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں قوم کا زوال کس تاریخ سے شروع ہوا سب کو اس کی خبر اس وقت ہوتی ہے جب وہ زور پکڑ جاتا ہے"۔

یہ حقیقت اکثر قوموں کے بارہ میں منطبق ہے لیکن امتِ اسلامیہ کی زندگی میں زوال وتنزّل کا آغاز دوسری قوموں کی زندگی کے مقابلہ میں زیادہ واضح اور روشن ہے، اگر ہم کمال وزوال کے درمیان کی حد کو متعین کرنا چاہیں تو ہم اپنی انگلی اس تاریخی خط پر رکھ دیں گے جو خلافتِ راشدہ اور ملوکیتِ عرب یا مسلمانوں کی بادشاہی کے درمیان حدِّ فاصل ہے۔

بات یہ تھی کہ براہِ راست اسلامی قیادت اور بالواسطہ دنیا کی رہنمائی کی زمام ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی جن کا ہر فرد اپنے ایمان وعقیدہ، اعمال واخلاق، تربیت وتہذیبِ نفس کی آراستگی، سیرت کی بلندی اور کمال واعتدال میں رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا ایک مستقل معجزہ تھا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کے قالب میں ایسا ڈھال دیا تھا کہ ان میں جسم کے علاوہ کسی چیز میں بھی اپنے ماضی سے مماثلت باقی نہیں تھی، نہ میلانات و رجحانات میں نہ ذہنیت و طرزِ فکر میں، نہ خواہشات میں، یہ حضرات جیسے اوپر بیان کیا گیا ہے، دین و دنیا کی جامعیت کا نمونۂ کامل تھے، وہ بیک وقت نمازوں کے امام، مسجدوں کے خطیب، قاضی اور منصف، بیت المال کے امین اور خازن اور لشکروں کے سپہ سالار تھے، اور ایک وقت میں اُمورِ جنگ کا انصرام ملکوں اور شہروں کا انتظام اور سلطنت کے مختلف صیغوں اور شعبوں کی نگرانی کرتے تھے، ان میں سے ایک ایک شخص ایک ہی وقت میں متقی و زاہد سپاہی اور مجاہد، معاملہ فہم قاضی، مجتہد فقیہ، صاحبِ تدبیر حاکم اور پختہ کار سیاسی تھا، اس لئے ایک ہی ذات میں (اور وہ خلیفہ و امیر المومنین کی ذات ہوتی تھی) دین و سیاست کا اجتماع تھا، اس کے گرد اُن لوگوں کی جماعت تھی جو اسی مدرسۂ نبویؐ یا مسجدِ نبویؐ کے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ تھے، ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے ایک ہی روح کے حامل اور ایک ہی سیرت سے متصف تھے، خلیفہ ان سے مشورہ لیتے اور کوئی اہم کام اُن کے مشورہ اور مدد کے بغیر نہ کرتے، پس ان کی روح تمدن کے پورے ڈھانچہ، حکومت کے پورے نظام اور لوگوں کی پوری زندگی و معاشرت و اخلاق میں جاری و ساری ہو گئی، ان کے میلانات اور خواہشات کا تمدن پر عکس اور ان کی خصوصیات کا پورا پرتو پڑا، وہاں نہ روحانیت اور مادیت میں کوئی کش مکش تھی، نہ دین و سیاست میں کوئی تصادم، نہ دین و دنیا کی تفریق تھی، نہ مصلحت و اُصول میں کوئی رسّہ کشی، نہ اغراض و اخلاق کے درمیان کوئی مزاحمت تھی، نہ طبقوں اور گروہوں کی باہمی جنگ، اور خواہشاتِ نفسانی میں باہمی سابقت و تقابل، غرض ان کا تمدن اور اسلامی سلطنت کی زندگی اس کے بانیوں کے اخلاق و خصوصیات اور اعتدال و جامعیت کی پوری آئینہ دار تھی۔

جہاد اور اجتہاد کا فقدان

اصل یہ ہے کہ اسلام کی امامت[1] بڑی نازک اور وسیع صفات کو چاہتی ہے جو فرد یا جماعت اس منصب پر فائز ہو اس کے لئے ذاتی صلاح وتقویٰ اور عدل کے علاوہ جہاد و اجتہاد کی قابلیت کی بھی ضرورت ہے یہ دو[2] لفظ بہت سادہ اور ہلکے ہیں لیکن معانی و مطالب سے لبریز، جہاد سے مراد ہے عزیز ترین اور اہم ترین مطلوب کے حصول کے لئے اپنی انتہائی طاقت اور وسائل صرف کر دینا مسلمان کا سب سے بڑا مقصود اللہ کی فرماں برداری اس کی خوشنودی کا حصول اور اس کی بادشاہی اور احکام کے سامنے سپردگی اور سرافگندگی ہے اس کے لئے ایک طویل جہاد کی ضرورت ہے ہر اس عقیدہ، تربیت، اخلاق، اغراض اور خواہشات کے خلاف جو اس میں مزاحم ہوں اور ان تمام نفسی و آفاقی (داخلی و خارجی) آلہہ و معبودانِ باطل کے خلاف جو اللہ کی فرماں برداری اور اخلاص میں حریف اور رقیب ہوں جب یہ مقصد حاصل ہو جائے تو مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ اللہ کی بادشاہی اور اس کے احکام کو اپنے گردوپیش کی دنیا اور اپنے بنی نوع پر پھیلانے کے لئے جدوجہد کرے یہ اس کا دینی فریضہ ہے اور خلقِ خدا پر شفقت اور مخلوق کے ساتھ خیر خواہی کا بھی یہی مقتضا ہے اور اس لئے بھی ضروری ہے کہ بعض اوقات انفرادی اطاعت اور دین داری بھی ماحول کی سازگاری کے بغیر مشکل ہو جاتی ہے اسی کا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں "فتنہ" ہے، دنیا میں جتنے بھی جمادات نباتات حیوانات اور انسان ہیں، وہ اللہ کی تکوینی مشیت و احکام اور اس کے طبعی قوانین کے سامنے سرافگندہ ہیں۔

---

[1] یہاں اس سے مراد وہ امامت (امارت) نہیں ہے جس کی تعریف و شرائط کتب فقہ و اصول میں ہیں، بلکہ وہ قوت و قابلیت ہے جس سے کوئی مسلمان فرد یا جماعت دنیا کی رہنمائی و پیشوائی کر سکے۔

وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اور اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین
طَوْعًا وَّ کَرْهًا وَّ اِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ ○	میں ہے خوشی سے یا لاچاری سے اور اس کی
(آل عمران ـ ۸۳)	طرف سب پھر کر جائیں گے۔
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی	کیا تم نہیں دیکھتے کہ جو کوئی بھی آسمانوں
السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ	میں اور جو کوئی بھی زمین میں ہے نیز سورج،
وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ	چاند، تارے، پہاڑ، درخت، چارپائے سب
وَالدَّوَآبُّ وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ	اللہ کے آگے سربسجود ہیں اور کتنے ہی انسان
وَکَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْهِ الْعَذَابُ ○	بھی اور آدمیوں میں بہت سے ایسے بھی جن پر
(الحج ـ ۱۸)	عذاب لازم ہو گیا۔

اس میں انسان کی نہ کسی کوشش کو دخل ہے اور نہ اُس کے لئے کسی جدّوجہد کی ضرورت، موجودات کے لئے موت و حیات، نشوونما کا جو قانون ہے اور ان کے جسم و فطرت کے لئے اللہ نے جو نظام مقرر کر دیا ہے اس پر وہ سب بے چوں وچرا چل رہے ہیں اور چلتے رہیں گے اور اس سے سرِ مو انحراف نہیں ہوگا جس مقصد کے لئے مسلمان کی جدّوجہد مطلوب ہے وہ خدا کے اس قانون کا نفاذ ہے جو انبیاء لے کر آئے اور جس کے غلبہ اور قیام کے لئے ان کے پیرو مامور ہیں جس کی مخالف طاقتیں اور دعوتیں دنیا میں ہمیشہ رہیں گی یہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا اس کی بکثرت قسمیں اور صورتیں ہیں جن میں سے ایک جنگ بھی ہے جو بعض اوقات اس کی سب سے افضل قسم ہو جاتی ہے اس کی غایت یہ ہے کہ اسلام کے مقابلہ میں کوئی برابر کی حریف طاقت باقی نہ رہے جو خواہشات اور طبیعتوں کو مخالف سمت کی طرف کھینچے اور بہت سے انسانوں کے لئے کفر و اسلام کے درمیان کش مکش پیش آئے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ	اور اہل کفر سے یہاں تک جنگ کرو کہ کفر کا

وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۔ (البقرہ-۱۹۳) زور باقی نہ رہے اور اطاعت اللہ ہی کی ہو۔

اس جہاد کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان اس اسلام سے بخوبی واقف ہو جس کی خاطر وہ جہاد کر رہا ہے اور کفر و جاہلیت کے بارہ میں بھی جس کے خلاف وہ جہاد کر رہا ہے اس کو گہری واقفیت ہو تاکہ جس لباس اور جس رنگ میں بھی ظاہر ہو اس کو پہچان لے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "مجھے خطرہ ہے کہ وہ شخص اسلام کی کڑیاں بکھیر دے گا جس نے اسلام میں نشو و نما پایا اور جاہلیت کو وہ نہیں پہچانتا" یقیناً ہر مسلمان کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ کفر و جاہلیت سے گہری اور تفصیلی واقفیت رکھتا ہو اور اس کے مظاہر ے اور صورتوں اور رنگوں کو پہچانتا ہو لیکن بلاشبہ اسلام کی رہنمائی اور کفر و جاہلیت کے خلاف اسلامی لشکر کی قیادت کرنے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ عام اور متوسط مسلمانوں سے زیادہ کفر و جاہلیت کو پہچانتا ہو۔

اسی طرح سے یہ بھی ضروری ہے کہ جو لوگ اس منصب پر فائز ہوں اُن کی تیاری پوری اور ان کی قوت مکمل ہو ان کے پاس لوہے کو کاٹنے کے لئے لوہا بلکہ فولاد ہو، وہ کفر کا مقابلہ ان تمام وسائل اور سامان سے کریں جو ان کی دسترس میں ہو جس کا انسان انکشاف کر سکا ہو اور جہاں تک انسان کے علم کی رسائی ہو اس لئے کہ اللہ کا حکم ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ	مسلمانو! جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت
قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ	پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے
عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ	مقابلہ کے لئے اپنا ساز و سامان مہیا کئے
دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ	رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے اور اپنے
يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ	دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے نیز
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ	ان لوگوں کے سوا اوروں پر بھی جن کی تمہیں

لَا تُظْلَمُوْنَ ○ (الانفال۔ ٦٠)

خبر نہیں اللہ انھیں جانتا ہے اور اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کی تیاری میں) تم جو کچھ بھی خرچ کروگے وہ تمہیں پورا پورا ل جائے گا ایسا نہ ہوگا کہ تمہاری حق تلفی ہو۔

اجتہاد سے ہماری مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کی سیادت و امامت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہو وہ نئے پیش آنے والے مسائلِ زندگی میں انفراداً یا اجتماعاً صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت اور استعداد رکھتے ہوں اور روحِ اسلام اور اسلامی قانون سازی کے اصول سے اتنی واقفیت اور مسائل کے استنباط کی قوت رکھتے ہوں جس سے وہ امت کی مشکلات کو حل کرسکیں، اور اشتباہ اور تحیر کے موقع پر اس کی رہنمائی کرسکیں، نیز وہ اتنی ذکاوت و مستعدی اور علم رکھتے ہوں اور محنت کرنے کے لئے تیار ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں جو طبعی قوتیں پیدا کی ہیں، اور زمین میں دولت و قوت کے جو چشمے اور دفینے رکھ دیئے ہیں ان سے کام لے سکیں اور ان کو اسلام کے مقاصد کے لئے مفید بنائیں، بجائے اس کے کہ اہلِ باطل ان کو اپنی خواہشات کے حصول کے لئے استعمال کریں اور زمین میں سربلندی اور فساد کے لئے ان سے مدد لیں اہلِ حق اُن سے وہ کام لیں جن کے لئے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔

اموی و عباسی خلفاء

لیکن دنیا کی بدقسمتی تھی کہ خلفائے راشدین کے بعد دنیا کی رہنمائی کے منصبِ جلیل پر وہ لوگ حاوی ہوگئے جنھوں نے اس کے لئے کوئی حقیقی تیاری نہیں کی تھی خلفائے راشدین کی طرح اور خود اپنے زمانہ کے بہت سے مسلمانوں کی طرح انھوں نے اعلیٰ دینی اور اخلاقی تربیت

نہیں پائی تھی، ان کا دینی، روحانی اور اخلاقی معیار اتنا بلند نہ تھا جو ملتِ اسلامیہ کے رہناؤں کے شایانِ شان ہے، ان کے ذہن اور طبیعتیں عرب کی قدیم تربیت اور ماحول کے اثرات سے بالکلیہ آزاد نہیں ہوئی تھیں، ان میں نہ روحِ جہاد تھی، اور نہ قوتِ اجتہاد جو دنیا کی پیشوائی اور عالمگیر قیادت کے لئے ضروری ہے، خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز (م ۱۰۱ھ) کی ذات کو مستثنیٰ کر کے عام خلفائے بنی اُمیہ اور بنی عباس کا یہی حال تھا۔

ملوکیت کے اثرات و نتائج

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی دیوارِ آہنی میں کئی رخنے پیدا ہو گئے جن سے مسلسل فتنے اور مصائب نفوذ کرتے رہے، ان کا اجمالی بیان یہ ہے :-

۱۔ دین و سیاست میں عملی تفریق ہو گئی، اس لئے کہ خلفاء علم اور دین میں ایسا مرتبہ نہیں رکھتے تھے جس سے ان کو علماء اور اہل دین کی ضرورت نہ پڑے، انھوں نے حکومت و سیاست کو تنہا اپنے ہاتھ میں رکھا اور مشیر یا ماہرین خصوصی کے طور پر جب چاہا یا جب ان کے مصالح کا تقاضا ہوا علماء اور اہل دین سے مدد لی اور جتنی بات انھوں نے چاہی قبول اور جب چاہا ان کے مشورہ پر عمل نہیں کیا، اس طرح سیاست دین کی نگرانی سے آزاد ہو گئی اور ایک پیل بے زنجیر بن گئی، اب اہل دین اور اہل علم کی صورت یہ تھی کہ یا تو وہ حکومت کے مخالف تھے، اور اس کے خلاف وقتاً فوقتاً خروج کرتے تھے، یا سیاسی زندگی سے کنارہ کش تھے، اور فوری انقلاب سے مایوس ہو کر افراد کی اصلاح و تربیت کے کام میں مشغول تھے، بعض اپنے ماحول کی خرابی کو دیکھ کر کڑھتے رہتے تھے، اور اس پر دینی و اخلاقی حیثیت سے سخت تنقید کرتے تھے لیکن مجبور تھے، بعض کسی دینی مصلحت کی بنا پر حکومت کے ساتھ تعاون کر رہے تھے، اور اس کے نظام میں شریک ہو کر

جتنی اصلاح ان کے امکان میں تھی کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور کچھ افراد ایسے بھی تھے، جو اپنی ذاتی مصلحت اور کامیابی کے لئے حکومت کے ساتھ اشتراک اور موالات کر رہے تھے، بہرحال یہ واقعہ ہے کہ نظری اور اعتقادی طور پر تو نہیں لیکن عملاً دین و سیاست میں علیحدگی ہوگئی اور اس بارہ میں خلافتِ راشدہ سے پہلے دنیا کے نظامِ سلطنت کا جو حال تھا، اس کا ایک رنگ پیدا ہو گیا تھا، دین روز بروز بے زور اور بے دست و پا ہوتا جاتا تھا، اور سیاست کے ہاتھ کھل رہے تھے، اور اس کی بے قیدی اور خود اختیاری بڑھ رہی تھی، اسی وقت سے اہل علم و دین اور اہل دنیا کے دو علیحدہ علیحدہ گروہ بن گئے اور ان کے درمیان اختلاف کی خلیج روز بروز وسیع ہوتی گئی اور بعض اوقات بیگانگی سے بڑھ کر مخالفت کی نوبت آگئی۔

۲۔ ارکانِ حکومت یہاں تک کہ بذات خود خلفاء دین و اخلاق کا کامل نمونہ نہیں تھے، بلکہ ان میں سے بعض اشخاص میں جاہلی جراثیم اور میلانات پائے جاتے تھے، قدرتی طور پر ان کی روح اور نفسیات کا اثر قومی زندگی پر پڑ رہا تھا، اور لوگ عموماً انھیں کے اخلاق و عادات و رجحانات کی تقلید کرتے تھے، دین کی نگرانی ختم ہو چکی تھی، احتساب اُٹھ چکا تھا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا زور ختم ہو چکا تھا اس لئے کہ اس کی پُشت پر کوئی طاقت اور حکومت کی حمایت نہیں تھی، وہ محض چند دین دار اشخاص کا رضا کارانہ عمل تھا جن کے پاس کوئی قوت اور تعزیر نہیں تھی، اس کے برخلاف بے قید اور آزاد زندگی کی ترغیبات بہت تھیں، اس لئے جاہلیت کو اسلامی ممالک کے اندر سانس لینے کا موقع ملا اور اس نے سر اٹھایا، عیش و عشرت، ترفّع و تنعّم کی زندگی عام ہوگئی، تفریحات اور لہو و لعب کی گرم بازاری ہوئی، لذت اندوزی اور نفس پروری کا غلبہ ہوا اور دنیا کی زندگی اور اس کی لذتوں کی ہوس بڑھ گئی، اس اخلاقی تنزّل اور اس تفریحی انہماک کے ساتھ کسی قوم کے لئے اسلام کی دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دینا، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی جانشینی کرنا،

اللہ اور روز آخرت کو یاد دلاتے رہنا، تقویٰ اور دین داری کی ترغیب دنیا اور لوگوں کے لئے اعلیٰ اخلاقی نمونہ قائم کرنا بہت مشکل ہے بلکہ ان حالات کے ساتھ اپنے وجود عزت اور آزادی کو برقرار رکھنا بھی دشوار ہے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (الاحزاب۔٦٢)	اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں میں بھی اپنا یہی دستور (جاری) رکھا ہے جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں اور آپ خدا کے دستور میں کسی کی طرف سے ردّ و بدل نہ پائیں گے۔

۳۔ یہ لوگ اپنے اخلاق و اعمال و معاملات میں اسلام کی شرعی سیاست اس کے جنگی قانون اس کے تمدنی نظام اور اس کی اخلاقی تعلیمات کی بہت کم نمائندگی کرتے تھے، اس طرح غیر مسلموں کے دلوں سے اسلام کے پیغام کا احترام اور اثر جاتا رہا اور ان کا اعتماد ان لوگوں سے زائل ہو گیا، ایک یورپین مؤرخ کے الفاظ میں "اسلام کو اس لئے زوال شروع ہوا کہ انسانیت کو ان لوگوں کی صداقت میں شبہ ہونے لگا جو دین جدید کی نمائندگی کر رہے تھے"۔

فلسفیانہ موشگافیاں

اس دور انحطاط میں مسلمان علماء اور مفکرین نے جس قدر علوم مابعد الطبیعیات METAPHYSICS اور یونانیوں کی الہیات کی طرف توجہ کی اس قدر علوم طبیعہ اور عملی اور نتیجہ خیز فنون کی طرف توجہ نہیں کی، حالانکہ یہ یونانی فلسفہ اور الہیات محض یونانیوں کا علم الاصنام MYTHOLOGY تھا جس کو انھوں نے اپنی چالاکی سے فلسفیانہ الفاظ و اصطلاحات میں ایک عقلی فن کے بالباس میں پیش کیا تھا، وہ محض چند خیالات و قیاسات کا مجموعہ اور الفاظ کا ایک طلسم تھا جس کے پیچھے

کوئی حقیقت واصلیت نہ تھی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مسلمانوں کو اس کنج کاوی اور لاحاصل سے مستغنی کردیا تھا، اور نبوت کے ذریعہ ان کو ذات وصفاتِ الٰہی کا وہ یقینی اور محکم علم بخشا تھا جس کی موجودگی میں اس چھان بین اور اللہ کی ذات وصفات کے بارہ میں اس کیمیاوی تحلیل وتجزیہ کی (جو فلسفۂ الٰہیات وکلام کا طرز ہے) قطعاً ضرورت نہ تھی لیکن افسوس ہے کہ اہلِ فلسفہ وکلام نے اس نعمتِ عظیم کی قدر نہ کی اور ان مباحث میں جن کا دنیا وآخرت میں کوئی فائدہ نہ تھا، صدیوں تک دردسری و دیدہ ریزی کرتے رہے اور اپنی بہترین قابلیت وذہانت اس لاحاصل شغلہ میں صرف کی، اس انہماک نے ان کو ان علوم اور تجربوں کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہ دیا جو ان کے لئے کائنات کی طبعی قوتیں مسخر کردیتے اور پھر وہ ان کو اسلام کے مقاصد ومصالح کا تابع اور خادم بناکر اسلام کے مادی وروحانی تسلط کو تمام عالم پر قائم کردیتے۔ اسی طرح سے انھوں نے فلسفۂ اشراق کے مباحث اور وحدۃ الوجود کے مسائل میں اپنا ضرورت سے زیادہ وقت اور طاقت صرف کی۔

شرک وبدعات

اس دورِ انحطاط میں مسلمانوں میں شرک وجہالت قدیم جاہلی قوموں کے عقائد وخیالات اور دینی گمراہی نے بھی نفوذ کرنا شروع کردیا اور مسلمانوں کی زندگی میں اور ان کے مزاج میں ایسی بدعات نے درخور حاصل کرلیا جنھوں نے مذہبی زندگی کی ایک بڑی جگہ کو گھیر لیا اور مسلمانوں کو صحیح دین اور کارآمد دنیا سے مشغول کردیا، ظاہر ہے کہ دنیا کی دوسری قوموں کے درمیان مسلمانوں کو جو کچھ امتیاز وخصوصیت حاصل ہے وہ اس دین کی بدولت ہے، جو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اللہ کے پاس سے لے کر آئے اور اس دین کا امتیاز واعجاز اس کی اصلیت

میں ہے، وہ اسی بارہ میں ممتاز ہے کہ وہ اللہ کی وحی و شریعت اس کی معجزانہ ساخت اور اس کی حکیمانہ صنعت ہے۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ ۔ اس اللہ کی کاریگری جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا۔

(النمل - ۸۸)

پس جب اس میں انسانوں کی عقلیں دخل دینے لگیں گی اس کے خود ساختہ اعمال و رسوم داخل ہو جائیں گے اور وہ خدانخواستہ اپنی اصلیت کھو دے گا تو دنیا و آخرت کی سعادت کی ضمانت باقی نہیں رہے گی اور وہ اس کا مستحق نہ ہوگا کہ انسانی عقلیں اس کے سامنے سرافگندہ ہوں اور دلوں کو وہ تسخیر کرے۔

دعوت و تجدید کا تسلسل

لیکن واضح رہے کہ جہاں تک اصل دین کا تعلق ہے، وہ اس پوری مدت میں ہر قسم کی تحریف و تبدیل سے محفوظ رہا، مسلمانوں نے راہِ راست سے جہاں جہاں انحراف کیا تھا کتاب و سنت سے مقابلہ کر کے اس کا علم اور احساس ہو جاتا تھا، دین و شریعت نے مسلمانوں کی غلطی میں کبھی ساتھ نہیں دیا، بلکہ ان کے مطالعہ سے غیر اسلامی ماحول مُشرکانہ اور مُبتدعانہ اعمال و رسوم اور جاہلی اخلاق و عادات کے خلاف نیز طبقۂ امراء اور گروہِ سلاطین کے تعیش اور استبداد کے خلاف ایک سخت احتجاج اور جذبۂ جہاد پیدا ہوتا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ اسلامی تاریخ کے ہر دور اور اسلامی دنیا کے ہر گوشہ میں ایسے عالی ہمت اور اولوالعزم اشخاص پیدا ہوتے رہے جنھوں نے اس امت میں انبیاء کی جانشینی کا حق ادا کیا مسلمانوں کے تنِ مُردہ میں روحِ جہاد پھونکی، اور برسوں کی ساکن سطح میں حرکت و تموّج پیدا کیا، اور مسائل اور علوم میں

اپنی فکر تازہ اور مجتہدانہ قابلیت سے کام لے کر مسلمانوں میں نئی علمی روح اور ذہنی بیداری پیدا کر دی۔ ایک مبصّر مؤرخ کو جہاد اور تجدید کی تاریخ میں کوئی خلا اور وقفہ نظر نہیں آتا، اصلاح کی شعلیں اور چراغ مسلسل طریقہ پر ایک دوسرے سے روشن ہوتے رہے اور بڑی تیز و تند ہواؤں میں بھی عالم اسلامی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اندھیرا نہیں پھیلنے پایا۔[1]

اسی کے ساتھ جب اسلام یا عالم اسلام کے لئے کوئی نیا خطرہ پیش آیا تو کوئی مرد مجاہد میدان میں آیا اور اس نے نہ صرف اس خطرہ کو دور کیا بلکہ عالم اسلام میں ایک نئی روح اور نئی زندگی پیدا کر دی۔ اس کی واضح مثال نور الدین اور صلاح الدین کی شخصیتیں ہیں۔

صلیبی خطرہ اور زنگی خاندان

مسیحی یورپ صدیوں سے اسلام سے خار کھائے بیٹھا تھا، مسلمان اس کی پوری مشرقی سلطنت پر قابض تھے، اور اس کے تمام مقدّس مقامات ان کے قبضہ اور تولیت میں تھے، لیکن طاقتور اسلامی سلطنتوں کی موجودگی اور ہمسایہ مسیحی سلطنت پر ان کی مسلسل پیش قدمیوں کی بنا پر اس کو حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا تھا، پانچویں صدی ہجری اور گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں ایسے حالات و اسباب پیش آئے کہ یورپ کے صلیبی "مجاہدین" نے شام و فلسطین کا رخ کیا اور ان کی فوجیں سیلاب اور طوفان کی طرح پھیل گئیں ۴۹۲ھ/۱۰۹۹ء میں صلیبیوں نے یروشلم (بیت المقدس) کو فتح کر لیا اور چند سال کے اندر اندر ملک فلسطین کا بڑا حصہ ان کے تصرف میں آگیا، مشہور انگریز مورخ سٹینلے لین پول (STANLEY LANE POEL) لکھتا ہے:۔

"صلیبی سپاہی ملک میں اس طرح گھسے جیسے کوئی پرانی لکڑی میں کچھ ٹھونکے تھوڑی دیر کو

---

[1] ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ اول

یہی معلوم ہونے لگا کہ درختِ اسلام کے تنے کو چیر کر اس کی چھپٹیاں اڑا دیں گے۔[1]

صلیبیوں نے داخلۂ بیت المقدس کے موقع پر فتح کے نشہ میں سرشار ہو کر مجبور مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا ان کا ذکر ایک ذمہ دار مسیحی مؤرخ ان الفاظ میں کرتا ہے :۔

"بیت المقدس میں فاتحانہ داخلہ پر صلیبی مجاہدین نے ایسا قتلِ عام مچایا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان صلیبیوں کے گھوڑے جو مسجد عمر سوار ہو کر گئے گھٹنوں گھٹنوں خون کے چشمے میں ڈوبے ہوئے تھے، بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر ان کو دیوار سے دے مارا گیا، یا ان کو چکر دے کر فصیل سے پھینک دیا گیا۔"[2]

بیت المقدس کی فتح اسلامی سلطنت کے ضعف اور زوال اور مسیحی دنیا کی بیداری اور اس کی نوخیز طاقت کی خبر دیتی تھی اور عالم اسلام میں خطرہ کی گھنٹی تھی، مسیحیوں کے حوصلے اتنے بلند ہو چکے تھے کہ ریجی نالڈ وائی گرک نے مکۂ معظمہ اور مدینہ طیبہ پر بھی چڑھائی کا ارادہ کیا تھا، واقعۂ ارتداد کے بعد اسلام کی تاریخ میں اس سے زیادہ نازک وقت اور خطرہ کی گھڑی نہیں آئی تھی۔

عین اس کش مکش اور بڑھتی ہوئی مایوسی کے عالم میں عالم اسلام کے اُفق پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا جس گوشہ سے امید نہ تھی وہاں سے ایک نئی طاقت اُبھری، یہ موصل کا زنگی خاندان تھا، جس کے دو افراد عماد الدین زنگی (م ۵۴۱ھ) اور اس کے فرزند نور الدین زنگی (م ۵۶۹ھ) نے صلیبیوں کو پے در پے شکستیں دیں اور بیت المقدس کے علاوہ (جس کی فتح صلاح الدین کے لئے مقدر تھی) تقریباً فلسطین کے پورے علاقہ کو صلیبیوں سے صاف کر دیا، نور الدین اپنی شرافتِ نفس، زہد و ورع، حسنِ انتظام، عدل و انصاف، انکسار و تواضع، شوقِ جہاد اور ایمان و یقین کے لحاظ سے

---

[1] سلطان صلاح الدین از اسٹینلے لین پول مترجمہ مولوی محمد عنایت اللہ صاحب ص ۱۲

[2] ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA VOL. VI, ART. "CRUSADES"

اسلامی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے مشہور مورخ ابن الاثیر جزری جوان کے خورد سال معاصر ہیں، تاریخ الکامل میں لکھتے ہیں:۔

"میں نے گزشتہ سلاطین کی زندگی اور حالات کا مطالعہ کیا ہے خلفائے راشدین اور عمر ابن عبدالعزیز کے بعد نورالدین سے بہتر سیرت اور ان سے زیادہ عادل سلطان میری نظر سے نہیں گزرا۔"[۱]

صلاح الدین کی قیادت

نورالدین کے بعد ان کے تربیت یافتہ سلطان صلاح الدین نے صلیبی دنیا کے مقابلہ میں عالم اسلام کی قیادت سنبھالی، بالآخر مختلف معرکوں کے بعد انھوں نے حطین (فلسطین) کے میدان میں ۱۴ ربیع الآخر ۵۸۳ھ (۴ جولائی ۱۱۸۷ء) کو صلیبیوں کو ایسی شکست دی جس سے ان کی کمر ٹوٹ گئی اور ان کی قسمت پر مہر لگ گئی لین پول اس کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے:۔

"ایک ایک مسلمان سپاہی تیس تیس عیسائیوں کو جنھیں خود اس نے گرفتار کیا تھا خیمے کی رسی میں باندھے لے جاتا دیکھا گیا، ٹوٹی ہوئی صلیبوں اور کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں میں مُردوں کے ڈھیر اس طرح لگے تھے جیسے پتھر پر پتھر پڑے ہوں اور کٹے ہوئے سر زمین پر اس طرح بکھرے پڑے تھے جیسے خربوزوں کے کھیت میں خربوزے پڑے نظر آتے ہیں مدتوں تک جنگ کا میدان جس میں یہ خونی لڑائی ہوئی تھی اور جہاں بیان کیا جاتا تھا کہ تیس ہزار آدمی مارے گئے مشہور رہا۔"[۲]

حطین کی فتح کے بعد سلطان صلاح الدین نے ۲۷ رجب ۵۸۳ھ ۱۱۸۷ء کو بیت المقدس کو

---

[۱] الکامل، ج ۱۱ ص ۱۶۴   [۲] سلطان صلاح الدین ص ۱۸۹

دوبارہ حاصل کیا اور اس آرزو کی تکمیل کی جو ۹۰ برس سے مسلمانوں کے دلوں کو بے چین کئے ہوئے تھی، سلطان کے رفیق و معتمد قاضی ابن شداد لکھتے ہیں :-

"ہر طرف دعاو تہلیل و تکبیر کا شور بلند تھا، بیت المقدس میں (۹۰ برس کے بعد) جمعہ کی نماز ہوئی، قبۂ صخرہ پر جو صلیب نصب تھی وہ اتار دی گئی، ایک عجیب منظر تھا اور اسلام کی فتح مندی اور اللہ تعالیٰ کی مدد کھلی آنکھوں نظر آرہی تھی"[1]

سلطان صلاح الدین نے اس موقع پر جس عالی ظرفی، دریا دلی اور اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کیا اس کا ذکر کرتے ہوئے لین پول لکھتا ہے :-

"اگر صلاح الدین کے کاموں میں صرف یہی کام دنیا کو معلوم ہوتا کہ اس نے کس طرح یروشلم کو بازیاب کیا تو صرف یہی کارنامہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانہ کا بلکہ تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی حوصلہ انسان اور جلالت و شہامت میں یکتا اور بے مثل شخص تھا"[2]

بیت المقدس کی فتح اور حطین کی ذلت آمیز شکست سے یورپ میں غیظ و غضب کی آگ پھر بھڑک اٹھی اور سارا یورپ شام کے چھوٹے سے ملک پر اُبل پڑا، ان سب کے مقابلہ میں تنہا سلطان صلاح الدین تھا اور اس کے اعزہ اور چند حلیف، جو پورے عالم اسلام کی طرف سے مدافعت کر رہے تھے، آخر پانچ برس کی مسلسل خونریز و خوں آشام جنگوں کے بعد ۱۱۹۳ئہ میں رملہ پر دونوں حریفوں میں جو تھک کر چور ہو گئے تھے، صلح ہوئی، بیت المقدس اور مسلمانوں کے مفتوحہ شہر اور قلعے بدستور ان کے قبضہ میں رہے، ساحل پر عکہ کی مختصر سی ریاست عیسائیوں کے قبضہ میں تھی اور سارا ملک سلطان صلاح الدین کے زیر نگیں تھا، صلاح الدین نے جو خدمت اپنے ذمہ لی تھی اور صحیح تر الفاظ میں جو کام اللہ تعالیٰ

---

[1] تاریخ ابی الفداء حموی [2] سلطان صلاح الدین صـ ۲۰۵

نے اس کے سپرد کیا تھا، اس کے ہاتھوں مکمل ہوا لین پول لکھتا ہے:۔

"جنگ مقدس خاتمہ کو پہونچی، پانچ برس کی مسلسل لڑائیاں ختم ہوئیں جولائی ۱۱۸۷ء میں حطین پر مسلمانوں کی فتح سے پہلے دریائے اردن کے مغرب میں مسلمانوں کے پاس ایک انچ زمین بھی نہ تھی، ستمبر ۱۱۹۲ء میں جب رملہ پر صلح ہوئی ہے تو صور سے لے کر یافا تک ساحل پر بجز زمین کی ایک پتلی سی پٹی کے سارا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا، اس صلح نامہ پر صلاح الدین کو شرمندہ ہونے کی مطلق ضرورت نہ تھی۔"[1]

سلطان صلاح الدین اعلیٰ تنظیمی قابلیت اور قائدانہ خصوصیات کا مالک تھا، وہ نہ صرف سپہ سالار اور فاتح تھا بلکہ محبوب قائد اور ہر دلعزیز سپاہی بھی تھا، اس نے صدیوں کے بعد منتشر و پراگندہ اسلامی ریاستوں اور طاقتوں اور متفرق اور باہم مخالف مسلمان قوموں اور قبائل کو جہاد کے جھنڈے کے نیچے جمع کر دیا، عرصۂ دراز کے بعد اس کی قیادت میں عالم اسلام نے ایک منظم اور پُرخلوص جنگ کی جس کا مقصد اسلام کی حفاظت اور جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کچھ نہ تھا، لین پول نے صحیح لکھا ہے کہ:۔

"تیسری جنگ صلیب میں تمام مسیحی دنیا کی مجموعی طاقت مقابلہ کرنے آئی مگر صلاح الدین کی قوت کو ٹس سے مس نہ کر سکی، صلاح الدین کی سپاہ مہینوں کی سخت محنت و جانفشانی اور برسوں کی مخدوش اور خطرناک خدمت کے بعد تھک کر چور چور ہو چکی تھی مگر کسی کی زبان پر حرف شکایت نہ تھا، کبھی طلبی پر حاضر ہونے اور ایک نیک کام میں اپنی جانیں قربان کرنے سے کسی نے انکار نہ کیا۔"[2]

آگے چل کر لکھتا ہے:۔

---

[1] سلطان صلاح الدین ص۳۱۰ [2] ایضاً ص۳۱۰-۳۱۱

کرد، ترکمان، عرب، مصری سب مسلمان اور سلطان کے خادم تھے اور طلبی پر خادموں ہی کی طرح سلطان کی خدمت میں حاضر ہوتے، باوجود اس کے کہ ان کی نسل و قوم جدا تھی اور باوجود قومی چشمکوں اور قبائلی غرور و تفاخر کے سلطان نے ان کو ایسا شیر و شکر کر رکھا کہ تمام لشکر تنِ واحد نظر آتا تھا۔[1]

صلاح الدین کے بعد

۲۷ صفر ۵۸۹ھ کو اسلام کا یہ وفادار فرزند دنیا سے رخصت ہوا صلاح الدین کی مجاہدانہ کوششوں اور اس کی بروقت قیادت عالم اسلام کو صلیبیوں کی غلامی کے خطرہ سے عرصہ تک کے لئے محفوظ کر دیا، عالم اسلام کا مطلع صاف ہو گیا لیکن صلیبیوں نے ان جنگوں سے فائدہ اٹھایا اپنی اور عالم اسلام کی کمزوری کا مطالعہ اور تجربہ کرنے کے بعد وہ نئے صلیبی حملہ کی (جس کی نوبت انیسویں صدی میں آئی) تیاری میں مصروف ہو گئے لیکن عالم اسلام پر پھر غفلت طاری ہو گئی اور باہمی اختلافات اور خانہ جنگیوں نے پھر سر اٹھایا، صلاح الدین کے بعد عالم اسلام کو پھر ایسا مخلص قائد اور رہنما نصیب نہیں ہوا جو اسلام کی بے غرض خدمت کے لئے بیتاب ہو اور جس کا مقصد جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کچھ نہ ہو اور جس پر عالم اسلام کو اس درجہ اعتماد اور اس کی ذات سے تعلق ہو جیسے صلاح الدین کے ساتھ تھا، عالم اسلام پھر ایک بار خود غرضیوں، خانہ جنگیوں اور سازش کا شکار ہو گیا۔ اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک انحطاط اور تنزل چھا گیا۔

جاہلیت کے لئے رکاوٹ

لیکن مسلمان اپنی ساری خرابیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اور اپنے انحراف کے

---

[1] سلطان صلاح الدین ص ۳۱۱

باوصف اپنی تمام معاصر جاہلی قوموں کے مقابلہ میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شاہ راہ سے قریب تر اور خدا کے زیادہ مطیع و فرمانبردار تھے ان کا وجود اور ان کا رہا سہا اقتدار جاہلیت کے لئے پھیلنے اور ترقی کرنے میں بڑی زبردست رکاوٹ اور سدِ سکندری کا کام دے رہا تھا، وہ اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود دنیا کی ایک اہم طاقت تھے جس سے حکومتیں خائف رہتی تھیں، اور جس کی ان کی نگاہ میں بڑی اہمیت تھی، لیکن بغیر اس کے کہ باہر کے لوگوں کو محسوس ہو اندرونی طور پر یہ طاقت کمزور ہوتی رہی یہاں تک کہ ساتویں صدی ہجری کے وسط میں ان کا سیاسی انتشار، اخلاقی کمزوری اور ضعف پورے طور پر نمایاں ہوگیا اور اسلامی طاقت کا وہ مہیب سایہ جو دور سے نظر آتا تھا، اوجھل ہوگیا اور اس کے ہٹتے ہی مسلمانوں پر وحشی قوموں اور حریف طاقتوں کا نرغہ ہوا اور اسلامی ممالک ایک لاوارثی مال کی طرح فاتحوں میں تقسیم ہونے لگے۔

ہنگامۂ تاتار

ان وحشیانہ حملوں میں سب سے بڑا حملہ تاتاریوں کا حملہ تھا جو مور و ملخ کی طرح مشرق سے بڑھے اور سارے عالم اسلام پر چھا گئے، تاتاری یورش عالم اسلام کے لئے ایک بلاء عظیم تھی جس سے دنیائے اسلام کی چولیں ہل گئیں مسلمان مبہوت و ششدر تھے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ہراس اور یاس کا عالم طاری تھا، ایک مرتبہ تقریباً سارا عالم اسلام (خصوصاً اس کا مشرقی حصہ) اس فتنۂ جہاں سوز کی لپیٹ میں آگیا مورخ ابن اثیر اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی قلبی کیفیت اور تأثر کو چھپا نہیں سکا وہ لکھتا ہے:۔

"یہ حادثہ اتنا ہولناک اور ناگوار ہے کہ میں کئی برس تک اس پس و پیش میں رہا کہ اس کا

ذکر کروں یا نہ کروں، اب بھی بڑے تردد و تکلف کے ساتھ اس کا ذکر کر رہا ہوں اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی خبرِ موت سنانا کس کو آسان ہے اور کس کا جگر ہے کہ ان کی ذلت و رسوائی کی داستان سنائے؟ کاش میں نہ پیدا ہوتا، کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر چکا ہوتا اور بھولا بسرا ہو جاتا، لیکن مجھے بعض دوستوں نے اس واقعہ کے لکھنے پر آمادہ کیا، پھر بھی مجھے تردد تھا، لیکن میں نے دیکھا کہ نہ لکھنے سے بھی کچھ فائدہ نہیں۔

یہ وہ حادثۂ عظمیٰ اور مصیبتِ کبریٰ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، اس واقعہ کا تعلق تمام انسانوں سے ہے لیکن خاص طور پر مسلمانوں سے ہے، اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ از آدم تا ایں دم ایسا واقعہ دنیا میں نہیں پیش آیا تو وہ کچھ غلط دعویٰ نہ ہوگا اس لئے کہ تاریخ میں اس واقعہ کے پاسنگ بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا اور شاید دنیا قیامت تک (یاجوج و ماجوج کے سوا) کبھی ایسا واقعہ نہ دیکھے، ان وحشیوں نے کسی پر رحم نہیں کھایا، انھوں نے عورتوں، مردوں اور بچوں کو قتل کیا، عورتوں کے پیٹ چاک کر دیئے اور پیٹ کے بچوں کو مار ڈالا" اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ " یہ حادثہ عالم گیر و عالم آشوب تھا، ایک طوفان کی طرح اٹھا اور دیکھتے دیکھتے سارے عالم پر پھیل گیا۔"[1]

۶۵۶ھ میں یہ تاتاری دار الخلافہ بغداد میں فاتحانہ داخل ہوئے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، مؤرخ ابن کثیر بغداد کی تباہی اور تاتاریوں کی غارتگری و خوں آشامی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

"بغداد میں چالیس دن تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا، چالیس دن کے بعد

---

[1] الکامل ابن اثیر ج ۱۲ ص ۲۰۲-۲۰۳

یہ گلزار شہر جو دنیا کا پُر رونق ترین شہر تھا، ایسا ویران و تاراج ہو گیا کہ تھوڑے سے آدمی دکھائی دیتے تھے، بازاروں اور راستوں پر لاشوں کے ڈھیر اس طرح لگے تھے کہ ٹیلے نظر آتے تھے، ان لاشوں پر بارش ہوئی تو صورتیں بگڑ گئیں اور سارے شہر میں تعفّن پھیلا جس سے شہر کی ہوا خراب ہوئی اور سخت وبا پھیلی جس کا اثر ملکِ شام تک پہونچا اس ہوا اور وبا سے بکثرت مخلوق مری، گرانی، وبا، اور فنا نیتوں کا دور دورہ تھا۔[1]

مصری افواج کے مقابلے میں تاتاریوں کی شکست

عراق و شام کے قبضے کے بعد تاتاریوں کا رُخ قدرتی طور پر مصر کی طرف تھا، اور وہی تنہا اسلامی ملک تھا جو ان کی غارتگری سے بچا ہوا تھا، سلطان مصر الملک المظفر سیف الدین قطز کو معلوم تھا کہ اب مصر کی باری ہے، اور تاتاریوں کی چڑھائی کے بعد ملک کی حفاظت مشکل ہے، اس نے مناسب سمجھا کہ وہ مصر میں مدافعت کرنے کے بجائے آگے بڑھ کر شام میں تاتاریوں پر خود حملہ کرے، چنانچہ ۲۵ رمضان المبارک ۶۵۸ھ کو عین جالوت کے مقام پر تاتاریوں اور مصر کی اسلامی افواج کا مقابلہ ہوا اور سابق تجربوں کے بالکل خلاف تاتاریوں کو شکست فاش ہوئی، وہ بُری طرح سے بھاگے اور مصریوں نے ان کا تعاقب کیا اور کثرت سے ان کو قتل کیا، اور بڑی تعداد میں گرفتار۔

سیف الدین قطز کے بعد الملک الظاہر بیبرس نے متعدد بار تاتاریوں کو شکست دی اور سارے ملک شام سے ان کو بے دخل اور خارج کر دیا، اور اس طرح وہ کہاوت غلط ثابت ہوئی کہ تاتاریوں کی شکست ممکن نہیں۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ۔

مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح

بایں ہمہ تاتاری عراق سے لے کر ایران و ترکستان تک قابض تھے اور خود دارالسلام بغداد ان کے قبضہ میں تھا، ایک نیم وحشی بت پرست قوم کا عالم اسلام کے علمی و تہذیبی مرکز پر قابض رہنا ایک افسوس ناک واقعہ تھا جس کا پورے عالم اسلام اور پوری زندگی اور تمدن و اخلاق پر اثر پڑ رہا تھا، عالم اسلام میں کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو ان کو عراق سے بے دخل کر سکے، اس وقت اسلام کی روحانی طاقت اور قوتِ تسخیر کا ایک معجزہ ظاہر ہوا اور چند گمنام و مخلص داعیوں اور مسلمان امراء دربار کی توجہ اور کوشش سے تاتاری سلاطین و امراء میں اسلام کی اشاعت شروع ہو گئی، اور اس طرح اسلام نے اس ناقابل تسخیر قوم کو فتح کر لیا جس نے سارے عالم اسلام کو ایک بار فتح کر لیا تھا، ابن کثیر ۶۹۴ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:۔

"اس سال چنگیز خاں کا پرپوتا قازان تاتاریوں کا بادشاہ ہوا اور امیر توزون رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر علانیہ مشرف باسلام ہوا اور تاتاری کل یا بیشتر اسلام میں داخل ہو گئے، جس روز بادشاہ نے اسلام قبول کیا اس روز سونا چاندی اور موتی لوگوں کے سروں پر نچھاور کئے گئے، اس نے اپنا نام محمود رکھا اور جمعہ اور خطبہ میں شرکت کی، بہت سے بت خانے گرا دیئے اور ان پر جزیہ مقرر کیا بغداد اور دوسرے شہروں اور ملکوں کی غصب کی ہوئی چیزیں واپس کی گئیں اور انصاف کیا گیا اور لوگوں نے تاتاریوں کے ہاتھ میں تسبیحیں دیکھیں اور اللہ تعالٰے کے فضل و احسان کا شکر ادا کیا۔"[1]

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ ص ۳۴۰

تاتاری حملے کا عالم اسلام پر اثر

تاتاری حملہ سے عالم اسلام کو ایسا دھچکا لگا تھا کہ اس کے سنبھلنے کے لئے مدت درکار تھی، تاتاری حملہ ہی سے مسلمانوں کے قوائے فکریہ میں اضمحلال وافسردگی اور طبیعتوں میں یاس انگیزی اور جمود پیدا ہو گیا، اس حملہ سے علوم دینیہ ادب وشاعری تصنیف وتالیف اور اخلاق ومعاشرت سب پر اثر پڑا تھا، علمی وادبی سرمایہ میں اضافہ، جدت واصلاح اور تعمیر وترقی کے بجائے اب اہلِ علم اور حاملین دین کو اس کی فکر تھی کہ وہ موجودہ سرمایہ کی حفاظت کا معقول انتظام کرسکیں اور کسی طرح اس فقہی علمی اور ادبی ذخیرہ کو تباہی سے بچاسکیں جو اب ان کی تولیت اور امانت میں تھا، انسانیت وتہذیب کی یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ دنیا کی زمام قیادت ان جاہلی اور وحشی قوموں کے ہاتھ میں آگئی جو نہ کوئی آسمانی دین رکھتے تھے، اور نہ کسی علم وتہذیب اور تمدن کے سرمایہ کے مالک تھے، ان کی قیادت میں کسی علمی ودینی ترقی کی امید نہیں کی جاسکتی تھی، ان کے اسلام قبول کر لینے کے بعد اگرچہ مسلمان ان کی غارتگری اور خون آشامی سے محفوظ ہو گئے تھے، اور ان کو دینی آزادی حاصل ہو گئی تھی، اور اسلام حکمران طبقہ کا مذہب بن گیا تھا، مگر ان جدید الاسلام تاتاریوں میں بہرحال دینی وعلمی قیادت اور اسلامی امامت کی صلاحیت نہ تھی، اور اس صلاحیت کے پیدا ہونے کے لئے ایک طویل مدت درکار تھی، اس وقت ایک ایسی تازہ دم عالی حوصلہ مجاہد سیرت قوم کی ضرورت تھی جو گرتے ہوئے عالم اسلامی کو سنبھال سکے، اس میں نئی زندگی اور نئی روح پیدا کر دے اور عالم اسلامی کی قیادت کا فرض انجام دینے کی کوشش کرے۔

میدانِ قیادت میں عثمانی ترکوں کی آمد اور عالم اسلامی کا ایک سنبھالا

کچھ ہی عرصہ کے بعد آٹھویں صدی میں عثمانی ترک تاریخ کے منظر عام پر آئے، انھوں نے

دنیا کو عام طور پر اور مسلمانوں کی نگاہوں کو خصوصیت کے ساتھ اپنی طرف اس وقت متوجہ کیا جب سلطان محمد فاتح نے ۸۵۳ھ مطابق ۱۴۵۳ء میں اپنی چوبیس (۲۴) برس کی عمر میں بازنطینی سلطنت کے ناقابل تسخیر دارالسلطنت قسطنطنیہ کو فتح کر لیا، اس واقعہ سے مسلمانوں میں ایک نئی اُمنگ اور نیا جوش پیدا ہو گیا ترک (جن کی قیادت آل عثمان کر رہے تھے) اس کے اہل تھے کہ ان پر اسلامی اقوام کی قیادت کے بارہ میں مسلمانوں کی طاقت کو ازسرِنو واپس لانے میں اور دنیا میں ان کے کھوئے ہوئے مرتبہ اور مقام کو حاصل کرنے میں اعتماد کیا جائے ان کا قسطنطنیہ کو فتح کر لینا جس کو مسلمان آٹھ سو برس تک بار بار کی کوششوں کے باوجود فتح نہیں کر سکے تھے ان کی قابلیت وقوت اور فنونِ جنگ میں مرتبۂ اجتہاد کو پہونچ جانے کی دلیل تھی، اور یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جنگی طاقت اور سامان جنگ میں اپنی تمام معاصر قوموں سے فائق ہیں، اور ان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے مقصد کے لئے علم وعمل کی طاقت اور اجتہاد سے کام لے سکیں اور قائد قوم کے لئے یہ تمام صفات بمنزلۂ شرائط کے ہیں۔

BARON CARRA DE VAUX اپنی کتاب "مفکرینِ اسلام" کے پہلے حصہ میں محمد فاتح کے تذکرہ میں لکھتا ہے:۔

"یہ فتح محمد فاتح کو محض بخت واتفاق سے حاصل نہیں ہوئی تھی اور نہ اس کا سبب محض بازنطینی سلطنت کی کمزوری تھی اصل وجہ یہ تھی کہ سلطان بہت پہلے سے اس کے لئے ضروری انتظامات کر رہا تھا اور اس کے زمانہ میں علم کی جتنی طاقت تھی اس سے کام لے رہا تھا توپیں اس وقت نئی نئی ایجاد ہوئی تھیں اس نے کوشش کی کہ جتنی زبردست اور بڑی توپ اس زمانہ میں بن سکتی ہے بنائی جائے، اس نے اس کے لئے ہنگری کے ایک انجینیر کی خدمات حاصل کیں جس نے اس کے لئے

ایک ایسی توپ بنائی جو تین سو کیلو کے وزن کا گولہ پھینکتی تھی اور اس کی مار ایک میل سے زیادہ کی تھی کہتے ہیں کہ اس توپ کو کھینچنے کے لئے سات سو آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی اور اس کے بھرنے کے لئے دو گھنٹے چاہیئے تھے۔ جب محمد فاتح قسطنطنیہ فتح کرنے چلا تو اس کی قیادت میں تین لاکھ سپاہی تھے اور زبردست توپخانہ اس کا بحری بیڑہ جو قسطنطنیہ کا سمندر کی جانب سے محاصرہ کئے ہوئے تھا ایک سو بیس جنگی کشتیوں پر مشتمل تھا، اس نے اپنی عقل و اجتہاد سے یہ تجویز کیا کہ جنگی بیڑہ کا ایک حصہ خشکی سے خلیج تک پہونچایا جائے اس نے لکڑیوں پر چربی مل کر ستر جہاز قاسم پاشا کی سمت سے سمندر میں اتار دیئے"۔

محمد فاتح سے یورپ اس قدر مرعوب اور خوف زدہ تھا کہ اس کے انتقال پر پاپائے اعظم نے جشن مسرت منانے کا حکم دیا اور فرمان صادر کیا کہ تین روز تک مسلسل شکرانہ کی نمازیں پڑھی جائیں۔[1]

ترکوں کی خصوصیات

مسلمان ترکی قوم میں درحقیقت کچھ ایسی خصوصیات جمع تھیں جن سے وہ مسلمانوں کی قیادت کی مستحق تھی۔

۱۔ وہ ایک بلند حوصلہ پرجوش اور زندہ قوم تھی جس میں جہاد کی روح تھی اور جو بدویت کی زندگی اور سادگی سے قریب العہد ہونے کی وجہ سے ان اخلاقی اور اجتماعی امراض سے محفوظ تھی، جن میں اسلامی قومیں مشرق میں مبتلا ہو کر کمزور ہو چکی تھیں۔

۲۔ اس کے پاس ایسی جنگی طاقت تھی جس سے وہ اسلام کے مادّی اور روحانی تسلط کو پھیلا سکے

---

[1] فلسفۂ تاریخ عثمانی (محمد جمیل بیہم) ص۲۷۴

اور حریف قوموں کی دست درازیوں کو روک سکے اور دنیا کی قیادت کے منصب پر فائز ہو سکے، ایک وقت میں عثمانی سلاطین تین براعظم یورپ، ایشیا اور افریقہ میں حکومت کرتے تھے، اسلامی مشرق ایران سے مراکش تک ان کے زیر فرمان تھا، ایشیائے کوچک کو وہ زیر کر چکے تھے اور یورپ میں آگے بڑھتے ہوئے وہ ویانا کی دیواروں تک پہونچ گئے تھے، بحر متوسط کے وہ تنہا مالک تھے جس پر کسی دوسری قوم یا سلطنت کا کوئی اثر نہ تھا، پطرس اعظم (PETER THE GREAT) کے معتمد نے ایک مرتبہ قسطنطنیہ سے قیصر کو لکھا تھا کہ سلطان بحر اسود کو اپنا گھر سمجھتے ہیں جس میں کسی غیر کو داخل ہونے کی اجازت نہیں، ترکوں کے بحری بیڑہ کا مقابلہ سارا یورپ ملکر بھی نہیں کرسکتا تھا، ۹۴۵ھ/۱۵۴۷ء میں پاپائے اعظم، وینس اسپین، پرتگال اور مالٹا کی متحدہ بحری طاقت نے اس بیڑہ کو شکست دینی چاہی لیکن شکست کھائی، سلیمان اعظم کے زمانہ میں ترکوں کو بحری و بری، اور سیاسی اور روحانی اقتدار حاصل تھا، اس کے زمانہ میں عثمانی حکومت کے حدود شمال میں دریائے صاوہ (SAVA) جنوب میں نیل کے دہانہ اور بحر ہند تک، مشرق میں قفقاز کے سلسلۂ کوہ اور مغرب میں کوہِ اطلس تک پہونچ گئے تھے، اور چار لاکھ مربع میل کا رقبہ اس کے زیر حکومت تھا، سلطنتِ عثمانیہ کا بحری بیڑہ تین ہزار فوجی جہازوں پر مشتمل تھا، روم کے علاوہ قدیم دنیا کا ہر مشہور شہر حکومتِ عثمانیہ کے زیر فرمان تھا۔[۱]

یورپ سارا ان سے ہیبت زدہ تھا، اس کے بڑے بڑے بادشاہ عثمانی سلاطین کی حفاظت اور پناہ میں داخل ہوتے تھے، ان کے احترام میں کلیساؤں کے گھنٹے بند ہو جاتے تھے۔

۳۔ بین الاقوامی قیادت کے لئے ان کو بہترین جغرافیائی مرکز حاصل تھا، وہ جزیرہ نمائے بلقان سے بیک وقت ایشیا اور یورپ کی نگرانی کر سکتے تھے، ان کا دارالسلطنت بحر اسود اور بحر ابیض کے

۱؎ فلسفۃ التاریخ العثمانی محمد جمیل بیہم ص ۲۸۰-۲۸۱

درمیان واقع اور ایشیا اور یورپ کی خشکیوں کا نقطۂ اتصال تھا، اس لئے ایک ایسی حکومت کا جس کو تینوں براعظم (یورپ، ایشیا اور افریقہ) کی بیک وقت نگرانی کرنی تھی، وہ بہترین پایۂ تخت تھا، نپولین نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "اگر کبھی ساری دنیا کی ایک متحدہ حکومت قائم ہوئی تو قسطنطنیہ ہی میں یہ صلاحیت ہے کہ اس کا دارالسلطنت بنے"[۱]

وہ یورپ میں تھے، اور یورپ کو مستقبل قریب میں بڑی اہمیت اور حیثیت حاصل ہونے والی تھی، زندگی کی طاقتیں اور ترقی کے محرکات و عناصر اس کے سینہ میں اُبل رہے تھے، اگر اللہ توفیق دیتا تو ترکوں کے لئے یہ ممکن تھا کہ علم و عقل کے میدان میں پیش قدمی کریں، اور یورپ کی عیسائی قوموں سے بازی لے جائیں اور دنیا کے پیشوا بن کر اس سے پہلے کہ یورپ دنیا کی عنانِ قیادت ہاتھ میں لے کر اس کو ہلاکت و تباہی کی طرف لے جائے، وہ اس کو حق و ہدایت کی منزل کی طرف جس کا نشان اُن کو اسلام کے طفیل میں مل چکا تھا لے چلیں۔

ترکوں کا تنزّل

لیکن ترکوں کی بدقسمتی سے زیادہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ عین ترقی و عروج کے زمانہ میں ترکوں میں تنزّل و انحطاط شروع ہوگیا اور قوموں کے پرانے امراض ان میں پیدا ہوگئے، آپس میں حسد و بغض کا نشو و نما ہوا، بادشاہ مستبد اور جابر ہونے لگے، حکمرانوں کی تربیت کا نظام بگڑ گیا، اخلاق میں انحطاط شروع ہوگیا، حکام اور سپہ سالار قوم و سلطنت سے خیانت اور غداری کرنے لگے، قوم میں راحت طلبی اور عافیت کوشی پیدا ہوگئی، غرض زوال پذیر قوموں کی وہ تمام صفات پیدا ہوگئیں جن کی تفصیل ترکوں کی تاریخ کی کتابوں میں ہے، اور یہ اس کا موقع نہیں۔[۲]

---

[۱] فلسفۃ التاریخ العثمانی از محمد جمیل بیہم ص ۱۵۶ [۲] ایضاً

ترکوں کا جمود اور پسماندگی

سب سے بڑا مرض جو ترکوں میں پیدا ہوا تھا وہ جمود تھا اور جمود بھی دونوں طرح کا علم و تعلیم میں بھی جمود اور فنون جنگ اور عسکری تنظیم و ترقی میں بھی، قرآن مجید کی یہ آیت انھوں نے بالکل فراموش کر دی۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ (الانفال ـ ۶۰)

مسلمانو! جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت پیدا کرکے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے لئے اپنا ساز و ساماں مہیا کئے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے نیز ان لوگوں کے سوا اوروں پر بھی جن کی تمہیں خبر نہیں۔

اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ان کے حافظہ سے گویا محو ہو گیا تھا" الحکمۃ ضالۃ المؤمن حیث وجدھا فھو احق بھا" (دانائی کی بات مومن کا گم شدہ مال ہے جہاں اس کو مل جاوے وہی اس کا زیادہ حقدار ہے) ایسی حالت میں کہ وہ یورپ کی حریف سلطنتوں اور قوموں کے درمیان گھرے ہوئے تھے ان کو فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص کی وہ وصیت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے تھی جو انھوں نے مصر کے مسلمانوں کو کی تھی کہ:۔

"اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ تم قیامت تک خطرہ کی حالت میں ہو اور ایک اہم ناکے پر کھڑے ہوئے ہو اس لئے تم کو ہمیشہ ہوشیار اور مسلح رہنا چاہئے کیوں کہ تمہارے چاروں طرف دشمن ہیں اور ان کی نگاہیں تم پر اور تمہارے ملک پر لگی ہوئی ہیں"[1]

---

[1] تاریخ مصر از جرجی زیدان۔

لیکن افسوس ہے کہ ترک مطمئن ہو کر بیٹھ گئے وہ اپنی جگہ پر رہے اور یورپین قومیں کہیں سے کہیں پہونچ گئیں۔ مشہور ترکی فاضلہ خالدہ ادیب خانم نے ترکوں کے اس علمی اور تعلیمی جمود کا بڑی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے، وہ کہتی ہیں:۔

"جب تک دنیا پر متکلمین کے فلسفہ کی حکومت رہی ترکی کے علماء اپنا کام نہایت خوبی سے کرتے رہے، مدرسۂ سلیمانیہ اور مدرسۂ فاتح اس زمانہ میں تمام مروّجہ علوم و فنون کے مرکز تھے، مگر جب مغرب نے کلام کی زنجیروں کو توڑ کر نئے علم و حکمت کی بنا ڈالی جس نے دنیا کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تو علماء کی جماعت معلّمی کے فرائض انجام دینے کے قابل نہیں رہی، یہ حضرات سمجھتے تھے کہ علم جس مقام پر تیرھویں صدی میں تھا وہاں سے اب تک آگے نہیں بڑھا، یہ طرز خیال انیسویں صدی کے وسط تک ان کے نظامِ تعلیم پر حاوی رہا، ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک کے علماء کا یہ طرز خیال جذبۂ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا تھا فلسفۂ کلام یا علم کلام خواہ وہ عیسائیوں کا ہو یا مسلمانوں کا یونانیوں کے فلسفہ پر مبنی ہے اس پر کم و بیش ارسطو کے خیالات کا رنگ غالب ہے جو ایک وثنی فلسفی تھا، یہاں اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ہم مختصر الفاظ میں عیسائی علماء اور مسلمان علماء کے طرزِ خیال کا مقابلہ کریں۔

قرآن کریم میں عالم طبیعی کی تخلیق کے مسئلہ کا کہیں تفصیل سے ذکر نہیں ہے اس کی تعلیم میں زیادہ اہمیت اخلاقی و معاشرتی زندگی کو دی گئی ہے اس کا خاص مقصد حُسن و قبح، خیر و شر میں امتیاز کرنا ہے وہ دنیا کے لئے ایک قانونِ عمل لے کر آیا ہے، مابعد الطبیعی مسائل و روحانی معارف بھی جہاں کہیں بیان کئے گئے ہیں ان میں کوئی پیچیدگی یا اشکال نہیں اس کی بنیادی تعلیم توحید ہے اسی وجہ سے اسلام ایک نہایت سہل و سادہ

مذہب ہے اور اس میں اور مذاہب سے کہیں زیادہ اس کی گنجائش ہے کہ عالم طبیعی کے نئے نظریات کو قبول کر سکے، مگر یہ سادگی اور وسعت نظر جو نئی علمی تحقیقات کے لئے اس قدر سازگار تھی کہ مسلمانوں میں زیادہ دن نہیں رہنے پائی نویں صدی میں علماء اور متکلمین نے نہ صرف فقہ بلکہ الٰہیات کو بھی اصول وضوابط کی زنجیروں میں جکڑ دیا یعنی تحقیق واجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا، اسی زمانہ میں اسلامی فلسفہ میں ارسطو کے خیالات دخیل ہو گئے۔

بخلاف اس کے دین عیسوی میں جسے مسیح کے مذہب کی جگہ سینٹ پال کا مذہب کہنا زیادہ موزوں ہے کتاب پیدائش کے اندر عالم طبیعی کی مفصل تفسیر موجود ہے، عیسائی اسے خدا کا کلام تسلیم کر چکے تھے اس لئے ان پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ اس تفسیر عالم کی حقانیت کو ثابت کریں اس تاویل میں مشاہدہ ان کا ساتھ نہیں دیتا تھا اس لئے استدلال سے مدد لینا پڑی ارسطو کا دامن انھوں نے اس لئے پکڑا کہ اس کی منطق سحر کی سی خاصیت رکھتی تھی۔

جب مغرب نے فطرت کا مطالعہ مشاہدہ اور تجربہ تحلیل اور تجزیہ کے ذریعہ سے کرنا شروع کیا تو ارباب کلیسا کے ہوش اُڑ گئے، ادھر نئے علمی طریقوں کی مدد سے بڑے بڑے انکشافات ہونے لگے اور ادھر عیسائی علماء کو یہ خوف پیدا ہوا کہ اب کلیسا کی حکومت کا خاتمہ ہے چنانچہ مغرب میں اس دور کا آغاز ہوا جس میں بڑے بڑے سائنسداں جو عالم طبیعی کے دائرہ کے اندر تحقیق میں مصروف تھے قتل کر دیئے جاتے تھے۔

سائنس اور مذہب کے خونریز معرکوں کے بعد آخر عیسوی کلیسا کو مصلحت شناسی سے کام لینا پڑا اس نے اپنے مدرسوں اور مکتبوں کے نصاب میں سائنس کو داخل کر لیا اس کی یونیورسٹیاں جو پہلے بالکل اسلامی مدارس کی طرح تھیں سائنس اور علوم جدیدہ کا مرکز

بن گئیں، مگر اسی کے ساتھ اس نے مابعد الطبیعی فلسفہ کو بھی نہیں چھوڑا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسا کا اثر تعلیم یافتہ طبقہ کے کم سے کم ایک حصہ پر بدستور باقی رہا کیتھولک اور پروٹسٹنٹ پادری نئے علوم پر عبور رکھتے تھے، اور نئے زمانہ کے نوجوانوں سے ہر موضوع پر بحث کر سکتے تھے۔

عثمانیوں کے یہاں علماء کی حالت اس کے بالکل برعکس تھی انھوں نے علوم جدیدہ کی تحصیل کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، بلکہ نئے خیالات کو اپنی قلمرو میں داخل ہی نہیں ہونے دیا، جب تک ملتِ اسلامی کی تعلیم کی باگ ان کے ہاتھ میں تھی کیا مجال کہ کوئی نئی چیز قریب آنے پائے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے علم پر جمود طاری ہو کر رہ گیا، ادھر دور انحطاط میں ان کی سیاسی مصروفیتیں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ مشاہدہ اور تجربہ کے جھمیلے میں پڑنے کی انھیں فرصت نہ تھی، سہل نسخہ یہی تھا کہ ارسطو کے فلسفہ پر قدم جمائے رہیں، اور علم کی بنیاد استدلال پر رہنے دیں چنانچہ اسلامی مدارس کا انیسویں صدی میں بھی وہی رنگ رہا جو تیرھویں صدی میں تھا۔[1]

عالم اسلام کا عام ذہنی و علمی انحطاط

علمی جمود اور ذہنی اضمحلال اس وقت صرف ترکی اور اس کے علمی اور دینی حلقوں کی خصوصیت نہیں تھی، واقعہ یہ ہے کہ پورا عالم اسلامی مشرق سے مغرب تک ایک علمی انحطاط کا شکار تھا، دماغ تھکے تھکے سے اور طبیعتیں بجھی بجھی سی نظر آتی تھیں، اور ایک عالمگیر جمود اور افسردگی چھائی ہوئی تھی، اگر ہم احتیاطاً آٹھویں صدی سے اس ذہنی اضمحلال کی ابتدا نہ کریں تو اس میں شبہ نہیں کہ نویں صدی ہجری

[1] ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش، از خالدہ ادیب خانم۔

وہ آخری صدی تھی، جب جدتِ فکر، قوتِ اجتہاد اور ادب و شاعری، حکمت و فن میں ندرت اور تخلیق کے آثار نظر آتے ہیں، یہی وہ صدی ہے جس میں مقدمہ ابن خلدون جیسی مفکرانہ تصنیف عالم اسلام کو حاصل ہوئی، دسویں صدی سے بہت واضح طور پر افسردگی، شدتِ تقلید اور نقالی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں، یہ افسردگی اور اضمحلال کسی خاص شعبہ اور کسی خاص فن کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، دینی علوم، شعر و ادب، انشا و تاریخ، تعلیمی نصاب و نظام سب کے سب کم و بیش اس سے متاثر نظر آتے ہیں، پچھلی صدیوں کے علماء کے تذکرے اور کتب سوانح پڑھئے، سیکڑوں ناموں میں ایک ایسے شخص کا ملنا مشکل ہوگا جس پر عبقری (GENIUS) کے لقب کا اطلاق درست ہو، یا جس نے کسی موضوع پر کوئی نئی چیز پیش کی ہو یا کسی خاص علم میں اس نے کوئی گرانقدر اضافہ کیا ہو، پچھلی صدیوں میں ہم صرف چند افراد کا استثناء کر سکتے ہیں، جو اپنے زمانہ کی عام علمی و ذہنی سطح سے بہت بلند تھے اور جنھوں نے دینی یا علمی دائرہ میں کوئی بڑا انقلابی کارنامہ یا علمی شاہکار پیش کیا ہے، خوش قسمتی سے ان تمام مستثنیٰ افراد کا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے ہے، ان میں سے ایک حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ (م ۱۰۳۴ھ) ہیں جن کے مکتوبات اسلام کے علمی و دینی سرمایہ میں ایک بیش بہا اضافہ ہے اور جنھوں نے پورے عالم اسلام پر گہرا اثر ڈالا ہے، دوسرے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) ہیں جن کی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" "ازالۃ الخفا" "الفوز الکبیر" اور "رسالۃ الانصاف" اپنے اپنے موضوع پر بالکل منفرد تصنیفات ہیں، تیسرے ان کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین دہلوی (م ۱۲۳۳ھ) جنھوں نے اپنی تصنیفات "تکمیل الاذہان" اور "رسالہ اسرار المحبت" میں بعض نئے خیالات کا اظہار کیا، چوتھے شاہ اسمٰعیل شہید دہلویؒ (ش ۱۲۴۶ھ) جن کی کتاب "منصب امامت" اور "عبقات" اجتہادی شان رکھتی ہے اور اپنے اپنے موضوع پر بے نظیر ہے، اسی طرح فرنگی محل کا خاندان اور پورب کے بعض تعلیمی سلسلے اپنی ذکاوت اور طباعی

میں بہت ممتاز نظر آتے ہیں اور انھوں نے اپنے وقت کے تعلیمی حلقوں پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے مگر ان کی ذہانت اور علمی کمالات درسیات کے دائرہ سے بہت کم تجاوز کرتے ہیں۔

صرف علم دین پر منحصر نہیں، ادب و شاعری بھی اپنی زندگی اور تازگی کھو چکی تھی اور ان پر بھی تقلید و تتبع کا غلبہ تھا، نثر و انشا پردازی کو تکلف و تصنع قافیہ پیمائی، لفظی صناعی اور عبارت آرائی نے بے رونق اور بے رُوح بنا رکھا تھا، دوستوں کے خطوط، تاریخ کی کتابیں اور دفتری تحریریں اور فرامین بھی اس عیب سے پاک نہیں تھے، کہیں کہیں ادب و انشاء کا کوئی ایسا نمونہ مل جاتا ہے جو اس زمانہ کے مذاق عام سے الگ اور پست سطح سے بلند نظر آتا ہے۔

تعلیمی حلقے اور مدارس سخت جمود و تقلید کا شکار، اور ایک علمی و فکری انحطاط میں گرفتار نظر آتے ہیں، متقدمین کی علم آموز اور ذوق آفرین کتابیں نصاب تعلیم سے رفتہ رفتہ خارج کر دی گئیں، اُن کی جگہ پر ان متاخرین کی کتابیں آگئیں جو اپنے فن میں درجۂ اجتہاد نہیں رکھتے تھے، اور متقدمین کے صرف مقلد یا شارح تھے، متون کی جگہ شروح و حواشی نے لے لی جن کی تالیف میں ان کے مصنفین نے کاغذ کے بارہ میں سخت کفایت شعاری سے کام لیا تھا، اور عام فہم اور واضح زبان کے بجائے اشارات و رُموز میں لکھا تھا، اس سے اس ذہنی و علمی انحطاط اور پستی کا اندازہ ہوگا جو پورے عالم اسلام پر طاری تھی، اور جس سے اس کا کوئی گوشہ اور زندگی کا کوئی شعبہ بچا ہوا نہیں تھا۔

ترکوں کے معاشرتی معاصر

دولتِ عثمانیہ کی ہمعصر وہمسر دو طاقتور مشرقی حکومتیں تھیں، ہندوستان میں مغلیہ سلطنت جس کی بنیاد ۹۳۳ھ/۱۵۲۶ء میں بابر کے مضبوط ہاتھوں سے پڑی تھی جو سلطان سلیم اوّل کا معاصر تھا،

اور جس کے تخت پر یکے بعد دیگرے طاقتور بادشاہ آئے ترکی کے بعد مشرق کی سب سے بڑی باعظمت اور پرشکوہ سلطنت تھی اسی خاندان کا آخری طاقتور بادشاہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر تھا جو سلطنت کی وسعت فتوحات کی کثرت شرع اور دینداری اور دینی علم اور واقفیت میں ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ میں خاص امتیاز رکھتا ہے اورنگ زیب ۹۰ سال سے زائد عمر پائی اور مسلسل پچاس برس حکومت کی اس کی وفات ۱۱۱۸ھ یعنی اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہوئی یہ زمانہ یورپ کی بیداری اور تعمیر و ترقی کا خاص دور ہے لیکن بدقسمتی سے اورنگ زیب کے سب جانشین نااہل پست ہمت اور عیش پسند نکلے وہ یورپ کے خطرات کا مقابلہ اور امت اسلامیہ کی حفاظت کرنے کے اہل تو کیا ثابت ہوتے اپنے ملک و سلطنت کی حفاظت بھی نہ کر سکے اور بالآخر اپنی نااہلی کمزوری اور نااتفاقی سے انگریزی حکومت کے قیام و استحکام انگلستان کی ترقی و تمول اور صنعتی انقلاب کا باعث ہوئے اور بالواسطہ اکثر اسلامی ممالک کی غلامی کا سبب بنے۔[1]

---

[1] برک اینڈ مزانچی کتاب قانون تہذیب و انحطاط کے صفحہ ۲۶۳-۲۶۴ پر لکھتا ہے: "جنگ پلاسی کے بعد بنگال کا مال غنیمت لندن میں آنا شروع ہوا اور اس کا نتیجہ بھی بہت جلد رونما ہوا، اتنا بڑا صنعتی انقلاب جس کے اثرات آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں نمایاں ہیں شاید وجود ہی میں نہ آتا اگر پلاسی کی لڑائی نہ ہوئی ہوتی کیونکہ ہندوستان ہی کا خزانہ اس کا محرک اور مدد معاون ہوا، (۲) جب ہندوستان کا خزانہ انگلستان پر امڈنا شروع ہوا اور سرمایہ میں اضافہ ہوا تو ایجادات کی تحریک بہت جلد ایک روح پیدا ہو گئی (۳) جب سے دنیا وجود میں آئی ہے شاید کبھی روپیہ سے اتنا منافع حاصل نہیں ہوا جتنا ہندوستان کے مال غنیمت سے ہوا کیونکہ پچاس برس تک انگلستان کا کوئی مدمقابل نہ تھا" سر ولیم ڈگبی لکھتا ہے:۔ "پلاسی کی لڑائی سے پہلے جب تک ہندوستان کے خزانے ڈھل ڈھل کر انگلستان نہیں آئے تھے ہمارے ملک کا ستارہ عروج پر نہیں تھا (یہ حقیقت ہے) کہ انگلستان کی صنعتی ترقی بنگال کی بے شمار دولت اور کرناٹک کے خزانوں کی بدولت ہوئی" (محمود بنگلوری)

دوسری بڑی مشرقی حکومت ایران کی صفوی سلطنت ہے جو ایک بڑی متمدن اور ترقی یافتہ سلطنت تھی لیکن تشیع کے غلو و تعصب اور ترکی حکومت سے نبرد آزمائی نے اس کو کسی اور کام کی فرصت نہ دی اور وہ بہترین زمانہ (جو یورپ کی تعمیر و تنظیم کا تھا) کبھی ترکی حکومت کے حدود پر حملہ کرنے اور کبھی اپنی حفاظت و مدافعت میں گزر گیا۔

یہ دونوں سلطنتیں اپنے مسائل و معاملات میں ایسی الجھی ہوئی تھیں اور بیرونی دنیا سے اتنی بے تعلق و بے خبر تھیں کہ ان کو یورپ اور دور دراز کے ممالک تو الگ رہے مشرق اوسط اور اسلامی ممالک کے حالات و واقعات کی خبر نہ تھی، رہا اسلامی سلطنتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات اور معاہدے اور پورے اسلامی ممالک کا اتحاد قائم کرنے کا مسئلہ تو شاید ان حکومتوں کے ذمہ داروں کے کبھی خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی، نہ مشرق کی شخصی حکومتوں سے امید ہو سکتی تھی، یورپ کے تعلیمی اور جنگی حالات کا مطالعہ اور بیرونی ممالک سے علمی و صنعتی استفادہ تو بہت دور کی بات تھی جس کی طرف کسی کا خیال جانا بھی مشکل تھا۔

اولوالعزم افراد

اس دورِ خزاں میں بھی اسلام کا درخت برگ و بار لاتا رہا اور خزاں میں اس نے بعض ایسے پھول اور پھل پیدا کئے جن کی مثال موسم بہار میں بھی بکثرت نہیں ملتی اور جن کی نظیر سے دوسری قوموں کی تاریخ خالی ہے، یہ دور قومی انحطاط و اضمحلال لیکن انفرادی عزیمت اور شخصی جد و جہد کا دور نظر آتا ہے متعدد ممالک میں ایسے صاحب عزم، بلند حوصلہ اور بیدار مغز قائد اور مجاہد پیدا ہوئے جنھوں نے ان آمادۂ زوال اور برسرِ انحطاط قوموں اور ملکوں میں کچھ عرصہ کے لئے نئی زندگی پیدا کر دی ہندوستان میں سلطان ٹیپو جیسا عالی ہمت، بلند نظر اور شیر دل قائد پیدا ہوا جو قریب تھا کہ ہندوستان کو غیر ملکی خطرات سے پاک کر دے، دوسری طرف حضرت سید احمد شہیدؒ جیسا صاحبِ عزیمت اور صاحب تاثیر داعی

اور مجاہد پیدا ہوا جو خلافتِ راشدہ کے اصول و منہاج پر ایسی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا جس کا حلقہ ہندوستان سے بخارا تک وسیع ہوا اس کی دعوت و تربیت نے ہزاروں کی تعداد میں ایسے بلند سیرت مجاہد حوصلہ ایثار پیشہ داعی اور سپاہی پیدا کر دیئے جنھوں نے اپنے ایمان ویقین، للّٰہیت وخلوص، اور دینی جوش وحمیت سے "قرونِ اولیٰ" کی یاد تازہ کر دی لیکن قومی انحطاط اجتماعی پراگندگی اور بے نظمی اور سیاسی بے شعوری اس درجہ کو پہونچ چکی تھی کہ ایسی عظیم اور طاقتور شخصیتیں بھی مسلمانوں کے حالات اور اُن کے تنزّل وانحطاط کی رفتار میں کوئی بڑی تبدیلی نہ پیدا کر سکیں اور اُمت بحیثیت مجموعی ان مجاہدانہ اور تجدیدی کوششوں سے فائدہ نہ اٹھا سکی۔

یورپ کی صنعتی وطبیعیاتی ترقیاں

سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی ہی سے ترک تنزّل وانحطاط، علمی پسماندگی اور جمود کا شکار ہو چکے تھے تاریخ انسانی کا یہ وہ اہم ترین عہد ہے جس کا اثر بعد کی صدیوں پر نقش ہے، یورپ اس میں اپنی لمبی نیند سے بیدار ہوا تھا اور ایک جوش وجنوں کی حالت میں اُٹھ کر غفلت اور جہالت کے اس طویل زمانہ کی تلافی کرنا چاہتا تھا، وہ ہر شعبۂ حیات میں گریز پا ترقی کر رہا تھا، طبعی قوتوں کو مسخر، کائنات کے اثرات کو منکشف اور نامعلوم سمندروں اور اقلیموں کو دریافت کر رہا تھا، ہر علم وفن میں اس کی فتوحات اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے انکشافات جاری تھے، اس مختصر سی مدت میں اس کے یہاں ہر علم میں بڑے بڑے محقق، موجد اور مجتہدِ فن پیدا ہوئے کوپرنکس COPERNICUS برونو BRUNOE گلیلیو (GALILIO) کیپلر (KEPLER) اور نیوٹن NEWTON وہ عالم اور محقّق تھے جنھوں نے ہیئت وطبیعیات کا ایک جدید نظام پیدا کر دیا، سیاحوں اور جہاز رانوں

میں کولمبس COLUMBUS واسکوڈی گاما (VASCO DA GAMA) اور میگلین (MAGLIN)
جیسے عالی ہمت، اولوالعزم پیدا ہوئے، جنھوں نے نئی دنیا اور نامعلوم ممالک دریافت کیے۔

قوموں کی تاریخ اس دور میں نئے سرے سے ڈھل رہی تھی اس زمانہ کا ایک ایک لمحہ کئی کئی دن اور ایک ایک دن کئی کئی برس کے برابر تھا، جس نے فرصت و تیاری کا ایک لمحہ کھو دیا اس نے ایک طویل زمانہ ضائع کر دیا افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس وقت لمحات ضائع نہیں کیے بلکہ صدیاں ضائع کیں اور یورپی قوموں نے ایک ایک منٹ اور ایک ایک سکنڈ کی قدر کی اور اس سے فائدہ اٹھایا اور صدیوں کی مسافت برسوں میں طے کی۔

علم و صنعت کے میدان میں ترکوں کی پسماندگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سولھویں صدی مسیحی سے پہلے ترکی میں جہاز سازی کی صنعت شروع نہیں ہوئی تھی اٹھارویں صدی عیسوی میں ترکی پریس و مطابع، حفظانِ صحت کے مراکز اور فوجی تعلیم کے نئے طرز کے مدارس سے روشناس ہوا اٹھارویں صدی کے آخر تک ترکی نئی ایجادات اور ترقیوں سے اس قدر بیگانہ تھا کہ جب قسطنطنیہ کے باشندوں نے دارالسلطنت پر ایک غبارہ (BALOON) کو پرواز کرتے ہوئے دیکھا تو اس کو سحر یا کیمیا کی کرشمہ سازی سمجھے، نہ صرف یورپ کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں ترکی سے اس میدان میں بازی لے جا چکی تھیں بلکہ مصر بھی بعض مفید نئی چیزوں سے فائدہ اٹھانے میں پیش قدمی کر چکا تھا ترکی سے چار سال پہلے مصر میں ریلوے کا نظام قائم ہو چکا تھا، ڈاک کے ٹکٹ بھی ترکی سے چند مہینے پہلے مصر میں رائج ہو چکے تھے۔[1]

جب ترکی کا یہ حال تھا جو عالم اسلام کا قائد تھا تو دوسرے عرب اور اسلامی ممالک کا جو ترکی کے زیر اثر یا دست نگر تھے جو کچھ حال ہو گا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، چھوٹی چھوٹی نئی صنعتیں بھی ابھی ان ملکوں میں رواج پذیر نہیں ہوئی تھیں ایک فرانسیسی سیاح موسیو والنی (VOLNEY) نے

---

[1] نئی ایجادات کی تاریخ مطبوعہ دارالہلال مصر۔

(جس نے اٹھارویں صدی میں مصر کی سیر کی ہے اور شام میں چار سال تک مقیم رہا ہے) اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ "یہ ملک صنعت میں اس قدر پیچھے ہیں کہ اگر تمہاری گھڑی خراب ہو جائے تو غیر ملکی کے علاوہ کوئی درست کرنے والا نہیں ملے گا۔"[1]

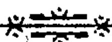
پھر مسلمانوں کا تنزل صرف حکمت و علوم نظریہ اور صنعت و حرفت ہی میں نہ تھا بلکہ یہ ایک ہمہ گیر اور عمومی انحطاط تھا جو مسلمانوں پر پورے طور پر محیط تھا، حتیٰ کہ وہ اپنے فنون جنگ میں بھی یورپ سے پیچھے رہ گئے جن میں ترکوں کو درجۂ امامت و اجتہاد حاصل تھا اور ان میں ان کی فوقیت کا دنیا کو اعتراف تھا لیکن یورپ اپنی ایجاد و اجتہاد اور تنظیم کی بدولت فنون حربیہ میں بھی ترکوں سے بہت بڑھ گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی فوجوں نے ۱۷۷۴ء میں عثمانی افواج کو شرمناک شکست دی اور دنیا پر ظاہر ہو گیا کہ ترک جنگی طاقت میں یورپ کی عیسائی قوموں سے پیچھے رہ گئے ہیں، اس واقعہ سے حکومتِ عثمانی کی کچھ آنکھیں کھلیں، اور اس نے چند یورپین ماہرین فن کی خدمات حاصل کر کے فوج کی از سرِ نو تنظیم و تربیت کا کام شروع کیا، لیکن اصلاح و ترقی کا اصل قدم سلطان سلیم ثالث نے (جس کی قصر شاہی سے باہر تعلیم و تربیت ہوئی تھی) انیسویں صدی کے آغاز میں اٹھایا، نئے طرز کے مدارس قائم کئے جن میں سے انجینئرنگ کالج میں وہ خود تعلیم دیتا تھا، نظام جدید کے نام سے ایک نئی فوج کی بنیاد بھی ڈالی اور سیاسی نظام میں بھی کچھ تبدیلیاں کیں، لیکن قوم اور سلطنت کے جمود کا یہ حال تھا کہ پرانی فوج نے بلوہ کر کے سلطان کو قتل کر ڈالا، اس اصلاحی مہم میں محمود ثانی (جس نے ۱۸۰۸ء سے ۱۸۳۹ء تک حکومت کی) اور اس کے بعد عبد المجید اول (۱۸۳۹ء تا ۱۸۵۱ء) نے جانشینی کی اور ترکی نے ترقی کے کچھ قدم بڑھائے۔

---

[1] زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث (ڈاکٹر احمد امین) ص۶

ترقی کے میدان میں مسلمان ترکی نے جو فاصلہ طے کیا ذرا اس کا مقابلہ اس فاصلہ سے کیجئے جو یورپ کے اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں طے کیا، ترقی کے میدان میں ان دونوں کی دوڑ میں کچھوے اور خرگوش کا مقابلہ تھا، فرق اتنا ہے کہ خرگوش برابر بیدار اور مشغول تھا اور کچھوا اپنی سست رفتاری کے باوجود کبھی کبھی سو بھی جاتا تھا۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں مراکش، الجزائر، مصر، ہندوستان اور ترکستان میں مشرق کی مسلمان اقوام اور مغربی قوموں اور طاقتوں کے درمیان جو معرکے پیش آئے ان کا فیصلہ دراصل سولھویں اور سترھویں صدی میں ہو گیا تھا، اور اسی وقت ان کے نتیجہ کی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی۔



باب پنجم

بین الاقوامی سیادت و قیادت کا مغربی عہد اور اس کے اثرات

ترکوں کے تنزّل و انحطاط سے عالمگیر طاقت و اقتدار اور ذہنی اور تہذیبی قیادت یورپ کی غیر مسلم قوموں کی طرف منتقل ہو گئی جنھوں نے عرصۂ دراز سے اس کی تیاری کی تھی، اور جن کی کوئی حریف مساوی درجہ کی طاقت میدان میں نہ تھی، مغرب سے مشرق تک کوئی ملک ان کے اثر اور نفوذ سے خارج نہ رہا، قومیں یا تو مادّی اور سیاسی حیثیت سے ان کی غلام اور زیر فرمان تھیں، یا ذہنی علمی اور تہذیبی حیثیت سے زیر اثر اور زیر اقتدار تھیں۔

اس سے پہلے کہ ہم ان اثرات کا جائزہ لیں جو قیادت کے اس انتقال اور تبدیلی نے دنیا کی ذہنیت، قوموں کے اخلاق، تمدن و اجتماع، اور انسانی میلانات و رجحانات میں پیدا کیا اور اس کا فیصلہ کریں کہ انسانیت کو اس انقلاب سے فائدہ پہونچا یا نقصان، یہ ضروری ہے کہ ہم مغربی تمدن کی فطرت، ساخت اور روح کو اور ان مؤثر قوموں کے فلسفۂ زندگی کو سمجھنے کی کوشش کریں اور یہ دیکھیں کہ وہ کیسے پیدا ہوا اور اس نے کس طرح نشو و نما حاصل کی۔

مغربی تہذیب کا شجرہ نسب

بیسویں صدی کی مغربی تہذیب (جیسا کہ بعض سطحی النظر سمجھتے ہیں) کوئی ایسی نوعمر تہذیب نہیں ہے جس کی پیدائش پچھلی صدیوں میں ہوئی ہے' دراصل اس کی تاریخ ہزاروں سال کی پرانی ہے' اس کا نسبی تعلق یونانی اور رومی تہذیب سے ہے' ان دونوں تہذیبوں نے اپنے ترکہ میں جو سیاسی نظام، اجتماعی فلسفہ' اور عقلی و علمی سرمایہ چھوڑا تھا، اس کے حصہ میں آیا اس کے سارے رجحانات اور خصوصیات اس کو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوئے۔

یونانی تہذیب مغربی ذہنیت کا سب سے پہلا واضح مظہر اور نمونہ تھی' یہ پہلا تمدن تھا' جو خالص مغربی فلسفہ کی بنیاد پر قائم ہوا اور اس میں مغربی نفسیات کا پورے طور پر ظہور ہوا' یونانی تہذیب کے کھنڈر پر رومی تہذیب کی عمارت قائم ہوئی جس میں ایک ہی مغربی روح کام کر رہی تھی' مغربی قومیں صدیوں تک ان دونوں تہذیبوں کی خصوصیات اور مزاج، ان کے فلسفہ' علوم و ادب' افکار کو سینہ سے لگائے رہیں' انیسویں صدی میں انھیں خصوصیات کے ساتھ انھوں نے ایک نئے لباس میں ظہور کیا' اس لباس کی چمک دمک سے دھوکہ ہوتا ہے کہ وہ نیا ہے لیکن دراصل اس کا تانا بانا یونانیوں اور رومیوں کے ہاتھ کا کاتا ہوا ہے۔

اس بنا پر ضروری ہے کہ ہم پہلے یونانی اور رومی تہذیب سے واقفیت پیدا کریں اور ان کے مزاج اور روح کو پہچان لیں تاکہ ہم بصیرت کے ساتھ بیسویں صدی کی مغربی تہذیب کی تنقید کر سکیں۔

یونانی تہذیب

یونانی تہذیب کی تحلیل و تنقید کرنے سے ان اجزا کو نظرانداز کر دینے کے بعد جو اصل نہیں

بلکہ فروعات اور مظاہر ہیں اور جو عام انسانی تہذیبوں کے درمیان مشترک ہیں اس کا ایک مخصوص مزاج معلوم ہوتا ہے، اس کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ غیر محسوسات کی بے وقعتی اور ان میں اشتباہ۔

۲۔ خشوع وخضوع اور روحانیت کی کمی۔

۳۔ دنیاوی زندگی کی پرستش اور دنیاوی فوائد ولذائذ کا اہتمام شدید۔

۴۔ حبّ وطن میں افراط وغلو۔

ہم ان متعدد اجزاء اور پہلوؤں کو اگر ایک مفرد لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو اس کے لئے تنہا "مادیت" کا لفظ کافی ہے، پس یونانی تہذیب کا مابہ الامتیاز "مادیت" ہے، یونانیوں کا علم فلسفہ، شاعری حتیٰ کہ دین، سب ان کی مادی روح کی غمازی کرتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی قدرت کا تصور مختلف دیوتاؤں کی شکل کے بغیر نہ کر سکے، انھوں نے ان صفات کے بُت تراشے اور ان کے لئے معبد تعمیر کئے تاکہ محسوس طریقہ پر ان سے تعلق رکھیں، ان کے ہاں ایک روزی کا دیوتا تھا، ایک رحمت کا اور ایک قہر وعذاب کا، پھر ان کی طرف انھوں نے مادی جسم کے تمام خصوصیات اور متعلقات منسوب کئے اور اُن کے گرد قصے کہانیوں کا ایک جال پھیلا دیا، انھوں نے معانیِ مُجرّدہ کو بھی اجسام واشکال کی شکل میں پیش کیا، چنانچہ ان کے نزدیک محبت کا ایک دیوتا تھا، اور ایک حُسن کا، ارسطو کے فلسفہ میں عقولِ عشرہ اور افلاکِ تسعہ کا جو شجرہ ملتا ہے وہ بھی اسی مادی عقلیت کا کرشمہ ہے جس کے اثر سے یونانی فطرت کبھی آزاد نہیں ہونے پائی۔

مغربی علماء نے بھی یونانی تہذیب میں مادیت کے غلبہ کو تسلیم کیا ہے اور اپنی تصنیفات اور علمی مباحث میں اس کی طرف متوجہ کیا ہے، چند سال پہلے ڈاکٹر ہاس نے جنیوا میں "یورپی تمدن کیا ہے" کے عنوان سے تین لیکچر دیئے تھے، ان کا ایک اقتباس خالدہ ادیب خانم کے توسط سے پیش کیا جاتا ہے:۔

"موجودہ مغربی تمدن کا مرکز قدیم یونانی تمدن تھا۔ اس کا اصل اصول انسان کی تمام قوتوں کا ہم آہنگ نشو و نما اور سب سے بڑا معیار خوبصورت اور سڈول جسم سمجھا جاتا تھا، ظاہر ہے کہ اس میں زیادہ زور محسوسات پر ہے جسمانی تربیت، ورزشی کھیلوں اور رقص وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل تھی، ذہنی تعلیم جو شاعری، موسیقی، ڈراما، فلسفہ، سائنس وغیرہ پر مشتمل تھی، ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھنے پائی تھی تاکہ ذہن کی ترقی سے جسم کو نقصان نہ پہونچنے پائے، یونان کے مذہب میں نہ روحانیت کا عنصر ہے نہ باطنیت کا، نہ علم دین ہے، نہ پیشوایانِ دین کا طبقہ"!

متعدد مغربی علماء نے یونانیوں کی دینی کمزوری اور اس کی بے اثری خشیت و خوف اور مذہبی اعمال و رسوم میں سنجیدگی کی کمی اور کھیلوں اور تفریحات کی کثرت کا ذکر کیا ہے "تاریخِ اخلاق یورپ کا مصنف "لیکی" لکھتا ہے کہ "یونانی تحریک تمام تر عقلی اور دماغی تھی، بخلاف اس کے مصری تحریک یکسر روحانی و باطنی تھی" وہ رومی مصنف آپولیس کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ "مصری دیوتاؤں کی عزت آہ و زاری سے تھی، اور یونانی دیوتاؤں کی رقص و سرود سے" پھر خود کہتا ہے کہ "اس میں شبہ نہیں کہ اس مقولہ کے آخری جزء کی تصدیق تاریخِ یونان میں قدم قدم پر ہوتی ہے، درحقیقت کسی مذہب کے مراسم میں جشن، کھیل اور تماشوں کی اتنی آمیزش نہیں پائی جاتی جتنی اس میں، اور نہ کسی مذہب میں خوف و دہشت کا عنصر اس قدر قلیل پایا جاتا ہے، جتنا اس میں، اس مذہب میں خدا کا تقدس بس اسی درجہ کا تھا جتنا کسی بزرگ شخص کا ہوتا ہے اور اسے چند معمولی مراسم کے ساتھ یاد کرنا اس کی عظمت و تمجید کے لئے بالکل کافی تھا"[1]

لیکن یہ حقیقت قطعاً قابلِ استعجاب نہیں، مغرب کی مادہ پرست اور خوگرِ محسوسات

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ از لیکی ترجمہ مولانا عبدالماجد دریابادی ص ۲۴۹-۲۷۶

فطرت و مزاج کے علاوہ یونانیوں کا فلسفۂ الٰہیات اور اس کے عقائد کی ساخت کچھ ایسی ہی واقع ہوئی تھی کہ خشوع و خضوع انابت اور رجوع الی اللہ کی کیفیت اُن میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی ذات باری کے تمام صفات ہر قسم کے اختیار، فعل و تصرف اور خلق و امر کی نفی کرنے اور اس کو بالکل بے صفت اور معطل قرار دینے اور اس کائنات کی پیدائش و انتظام کو اپنے خود تراشیدہ اور مفروضہ عقل فعّال کی طرف منسوب اور اس سے وابستہ کرنے کا طبعی اور منطقی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ زندگی میں خدا کی کوئی ضرورت اور اس سے کوئی تعلق اور دلچسپی باقی نہ رہ جائے، نہ اس سے کوئی امید ہو اور نہ اس کا کوئی خوف، نہ دل میں اس کی ہیبت ہو اور نہ محبت اور نہ ضرورت و مصیبت کے وقت اس سے دعا و التجا ہو، اس لئے کہ وہ اس فلسفہ کے مطابق ایک بالکل معزول و معطل ہستی ہے جس کو عالم میں تصرف کرنے کا نہ کوئی اختیار ہے نہ طاقت، وہ عقل اول پیدا کر کے عالم سے بالکل بے تعلق و کنارہ کش ہو گیا، اس لئے اس عقیدہ کے ماننے والوں کی زندگی عملاً ایسی گزرتی ہے اور گزرنی چاہئے کہ گویا خدا نہیں ہے، اور منکرینِ خدا کی زندگی سے سوائے اس تاریخی بیان کے کہ خدا نے عقلِ اوّل کو پیدا کیا ہے اور کسی حیثیت سے ممتاز نہیں پس جب ہم یہ سنتے ہیں کہ یونانیوں میں خشوع اور خضوع کی کمی تھی، اور ان کی عبادات اور مذہبی اعمال ایک قالب بے روح سے زیادہ نہ تھے اور وہ یہ کہ خدا کی بزرگوں سے زیادہ تعظیم نہیں کرتے تھے تو ہم کو ذرا بھی تعجب نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ تاریخ میں آدمی سیکڑوں صنّاعوں اور موجدوں کا تذکرہ پڑھتا ہے، لیکن کبھی ان کی طرف سے اس کے دل میں خشوع اور خضوع اور ان سے بندگی کا ربط نہیں پیدا ہوتا، بندگی کا تعلق تو اس وقت پیدا ہوتا جب خدا کو اس کائنات میں متصرّف اور کارفرما اور اپنے کو اس کا محتاج سمجھتے۔

دنیوی زندگی کے انتہائی شوق و محبت، اس کی قدر و قیمت میں افراط و غلو، مجسموں اور

تصاویر کے شغف، سرود و موسیقی کے انہماک، فنونِ لطیفہ کی قدردانی، اور غیر محدود شخصی آزادی پر مبالغہ آمیز زور دینے سے یونانی اخلاق و معاشرت پر بُرا اثر پڑا، اخلاقی ابتری اور ہر نظام کے خلاف بغاوت و احتجاج روزمرہ کا فیشن بن گیا، خواہشات نفس کی پیروی زندگی سے زیادہ سے زیادہ تمتّع اور لطف اندوزی اور بوالہوسی، روشن خیالی اور آزادی کا نشان سمجھا جانے لگا سقراط ایک جمہوری نوجوان کی سیرت اور طرز زندگی کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ بیسویں صدی کے روشن خیال اور زندہ دل نوجوان کا سراپا اس سے ذرا مختلف نہیں معلوم ہوتا۔

"اگر اس سے کہا جاتا ہے کہ انسان کے سارے شوق اور خواہشات یکساں قابلِ احترام اور تعمیل کے لائق نہیں بعض خواہشات پسندیدہ اور لائق احترام ہیں اور ان کی تکمیل و تعمیل میں کوئی مضائقہ نہیں اور بعض ناروا اور ناپسندیدہ' ان سے اجتناب ہی بہتر ہے اور ان پر پابندی اور بندش عائد کرنا ضروری ہے وہ شخص اس صحیح قانون کو قبول نہیں کرتا اور اس کے سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا جب اُس کے سامنے یہ معقول باتیں پیش کی جاتی ہیں تو وہ تمسخر کے ساتھ اپنا سر ہلاتا ہے اور بڑے زور کے ساتھ یہ تقریر کرتا ہے کہ انسان کی تمام خواہشات اور اس کے سارے شوق یکساں قابلِ احترام ہیں، اسی کے مطابق وہ اپنی زندگی بھی گزارتا ہے اور اپنے تمام خواہشاتِ نفس کی تسکین اور اپنے ہر شوق کی تکمیل کرتا رہتا ہے اور جس وقت اس کا جس بات کا جی چاہتا ہے گزرتا ہے کبھی وہ مدہوش و بدمست نغمہ و سرود میں مشغول ملے گا، اور کبھی اس کو خیال آجائے گا تو برت رکھ کر صرف پانی پینے پر اکتفا کرے گا کبھی فوجی تربیت اور قواعد سیکھتا ہوا نظر آئے گا کبھی بالکل بیکار اور سست دکھائی دے گا اور ہر چیز کو بالائے طاق رکھ دے گا، کبھی فلسفیانہ زندگی بسر کرنے لگے گا، دوسرے وقت میں سیاسی زندگی میں شریک ہو جائے گا،

اور وقت کے تقاضہ کے مطابق تقریر کرتا ہوا سنا جائے گا کبھی فوجی لوگوں کی تعریف کرنے لگے گا اور ان کی طرف اُس کا میلان پیدا ہو جائے گا کبھی کامیاب تاجر پر رشک کر کے تجارت شروع کر دے گا غرض اس کی زندگی کا کوئی نظام اور ضابطہ نہیں لُطف یہ ہے کہ وہ اس زندگی کو بہت پُر لطف اور خوشگوار اور آزاد سمجھتا ہے اور اخیر تک اسی طرز پر زندگی گزارتا ہے[1]"

مغربی فطرت اور مزاج کا ایک خاصّہ وطن پرستی ہے ایشیا کے مقابلہ میں وطنیت کا جذبہ یورپ میں زیادہ قوی اور عام ہے اس میں کچھ جغرافیائی حیثیت کا بھی دخل ہے ایشیا میں طبعی علاقے زیادہ وسیع مختلف قسم کی آب و ہوا، پہاڑ اور انسانوں کی مختلف قسموں پر مشتمل ہیں، وہ زیادہ زرخیز ہیں اور زندگی کے وسائل کی ان میں فراوانی ہے اس بنا پر بر اعظم ایشیا میں مملکت کا میلان فطری طور پر وسعت اور عمومیت کی طرف ہے اور اس کی سرزمین میں دنیا کی وسیع ترین سلطنتیں قائم ہوئیں اس کے برخلاف یورپ میں زندگی کی کش مکش تنازع للبقا شدید اور مسلسل طریقہ پر پائی جاتی ہے اس کی آبادی گنجان، علاقے تنگ، اور وسائل معیشت محدود ہیں، پہاڑوں اور دریاؤں کی طبعی سرحدوں نے مغربی اقوام کو مستقل تنگ فطری دائروں میں محصور کر دیا ہے خصوصاً یورپ کا وسطی مغربی اور جنوبی حصہ وسیع ریاستوں کے نشو و نما کے لئے موزوں نہیں، اس لئے قدیم یورپ میں بھی سیاسی تصوّر شہری ریاستوں سے آگے نہیں بڑھ سکا جن کا رقبہ چند میل سے زیادہ وسیع نہیں ہوتا تھا لیکن وہ بالکل خود مختار ہوتی تھیں، اس کا سب سے بڑا نمونہ یونان میں ملتا ہے جہاں قدیم ترین عہد سے بیسوں چھوٹے چھوٹے خود مختار شہروں کا تذکرہ ملتا ہے۔

اس بنا پر یہ بات قابل استعجاب نہیں کہ یونانی، وطنیت پر مستحکم ایمان رکھتے تھے لیکن

---

[1] "ریاست" از افلاطون۔

تسلیم کرتا ہے کہ یونان میں وطنیت ہی کا غلبہ تھا، اور جہانیت یا آفاقیت جس کے متعلق کبھی سقراط اور انکساغورس نے اظہار خیال کیا ہے کوئی مقبول خیال اور مذہب نہیں تھا اور اس کے حامی یونان میں نہیں تھے' ارسطو کا سارا نظامِ اخلاق یونانی اور غیر یونانی کی تفریق پر مبنی ہے' اجماعِ حکماء سے فضائلِ اخلاق کی جو فہرست تیار کی گئی تھی' اس کا عنوان اوّلین حبِّ وطنی تھا، ارسطو اس حد تک پہونچ گیا تھا کہ یونانیوں کے لئے غیر ملکیوں کے ساتھ وہی برتاؤ واجب ہے جو وہ حیوانات کے ساتھ کرتے ہیں' اس طرز خیال کا یونانی حلقوں میں اتنا اثر اور غلبہ ہو گیا تھا کہ جب ایک فلاسفر نے یہ کہا کہ میری ہمدردیوں کا حلقہ صرف میرے ذاتی وطن تک محدود نہیں بلکہ سارے یونان پر محیط ہے تو لوگ حیرت و استعجاب کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگے[1]

رومی تہذیب

یونانیوں کے جانشین رومی ہوئے اور قوتِ مملکت کی تنظیم سلطنت کی وسعت اور عسکری صفات میں ان سے فوقیت لے گئے، لیکن علم و فلسفہ ادب و شاعری، تہذیب و شائستگی اور تمدن میں وہ یونانیوں کے درجہ کو نہیں پہونچ سکے' ان چیزوں میں یونانیوں کا سکہ تمام دنیا پر اور خود فاتح رومیوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا، رومی ابھی اپنے عسکری دور میں تھے اس لئے انھوں نے طبعی طور پر ذہنی کمالات اور لطافت و نفاست کی باتوں میں یونانیوں ہی کو اپنا امام تسلیم کیا اور انھیں کے علوم فلسفہ اور خیالات کی خوشہ چینی کی لیکی لکھتا ہے کہ "یونانی اپنا گرانقدر علم و ادب صدہا سال سے رکھتے آئے تھے' دراں حالیکہ روما دورِ عسکریت میں تھا جو ادب کا شائبہ تک نہیں رکھتا تھا، بلکہ جس کی زبان تک ادائے مطلب و خیالاتِ عالیہ کی ترجمانی پر قاصر تھی'

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ ص ۱۶۳، ۱۸۶

روما کی اس علمی پستی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ یونانی تمدن سے مغلوب ہو جائے، اور ہر شعبۂ علم میں اس سے مرعوب رہے، چنانچہ ہمیں معلوم ہے کہ قدیم ترین رومی مورخین یونانی ہی زبان میں تصنیف کرتے تھے، اور یہ دستور عرصۂ دراز تک قائم رہا اور اکیلی تصانیف اور تالیف پر کیا موقوف ہے، اطوار و خصال، طرزِ معاشرت، جذبات و احساسات غرض ہر شعبۂ حیات میں یونانی تمدن رومی تمدن پر غالب آگیا، رومی بلا تکلف یونانیوں کی تقلید کرتے تھے، اور اس تقلید پر فخر کرتے تھے۔[1]

اس طرح علم و ادب اور عادات و اخلاق کے ذریعہ یونانی قوم کا فلسفہ اور کلچر بلکہ یونانی نفسیات رومیوں میں منتقل ہو گئی، اور ان کے رگ و پے میں پیوستہ ہو گئی، یوں بھی رومی اپنی مغربی فطرت و مزاج کی وجہ سے فطری خصوصیات میں کچھ زیادہ مختلف نہ تھے، زندگی کے بہت سے پہلوؤں میں دونوں کے درمیان بڑی حد تک مشابہت تھی، محسوسات پر رومی بھی یقین کرنے کے عادی تھے، زندگی کی قدر و قیمت میں یہاں بھی اتنا ہی غلو اور افراط تھا، دینی عقائد و حقائق کے بارہ میں یہ بھی بہت ضعیف الایمان اور آزاد خیال تھے، مذہبی نظام اور مذہبی اعمال و رسوم کا کوئی خاص احترام اور وقار نہ تھا، قومیت اور وطنیت میں یہاں بھی شدت اور مبالغہ پایا جاتا تھا، مزید یہ کہ طاقت کا احترام عبادت اور تقدیس کے درجہ کو پہونچا ہوا تھا۔

رومی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رومی اپنے مذہب و عقائد میں راسخ الایمان نہ تھے اور درحقیقت وہ اس بارہ میں معذور بھی ہیں اس لئے کہ جو مشرکانہ اور وہم پرستانہ مذہب روم میں رائج تھا، اس کا مقتضا یہ تھا کہ رومی علم میں جس قدر ترقی کرتے جائیں اور ان کے دماغ روشن ہو جائیں اتنی ہی اس مذہب کی بے توقیری اور اس کی عظمت میں کمی واقع ہو جائے اور یہ تو گویا انھوں نے پہلے ہی دن سے طے کر لیا تھا کہ دیوتاؤں کو سیاست و امور دنیا سے کوئی تعلق

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ صے ۱۸۷

نہیں، سسرو (CICERO) بیان کرتا ہے کہ تھیٹر میں جب اس مضمون کے اشعار پڑھے جاتے تھے کہ دیوتاؤں کو دنیوی معاملات سے کوئی سروکار نہیں تو لوگ انھیں نہایت ذوق و شوق سے سنتے[1] ___ سینٹ آگسٹائن (S. AUGASTINE) وغیرہ حیرت کے ساتھ کہتے ہیں کہ "یہ رومن بُت پرست مندروں میں تو دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے اور تھیٹروں میں ان کے ساتھ تمسخر کرتے تھے[2]" رومی مذہب کی گرفت اپنے پیروؤں پر اتنی ڈھیلی ہوگئی تھی اور جذبۂ مذہبی اتنا سرد پڑ چکا تھا کہ لوگ بعض اوقات دیوتاؤں کے ساتھ بے ادبی اور اشتعال میں آکر گستاخی کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے، لیکی لکھتا ہے کہ مذہب کا اخلاقی اثر تقریباً بالکل فنا ہوگیا، جذبۂ تقدس تقریباً مٹ گیا اور اس کے مظاہر ہر شخص کو نظر آنے لگے چنانچہ جب اغسطس (AUGUSTUS) کا بیڑہ غرق ہوگیا تو اس نے غصہ میں آکر نیچوں (NEPTUNE) (سمندر کے دیوتا) کے بُت کو مسمار کر دیا جب جرمنیکس (JERMANICUS) کا انتقال ہوا تو لوگوں نے دیوتاؤں کے قربان گاہوں پر خوب پتھراؤ کیا[3]"

رومی قوم کے اخلاق، سیاست اور معاشرت میں مذہب کا کوئی اثر اور ان کے احساس اور میلانات پر اس کا کوئی اقتدار و نگرانی باقی نہیں رہی تھی مذہب میں کوئی گہرائی اور قوت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ دل کی گہرائی سے اُبھرتا اور روح پر حکومت کرتا، وہ محض ایک رسم و رواج بن کر رہ گیا تھا، سیاست و مصلحت کا تقاضا تھا کہ خواہ وہ برائے نام ہی رہے لیکن کسی نہ کسی شکل میں باقی رہے لیکی لکھتا ہے "رومی مذہب کی اصل بنا خود غرضی پر تھی اس کا مطمح نظر اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ افراد مرفہ الحال رہیں اور مصیبتوں اور مصائب سے محفوظ رہیں چنانچہ اسی کا اثر تھا کہ روم میں گو صدہا ہیرو و جانباز پیدا ہوئے لیکن نفس کش زاہد ایک بھی نہ اٹھا، یہاں ایثار کی جو بہتر سے بہتر مثالیں ملتی ہیں وہ بھی مذہب کے اثر سے

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ ص۱۳۷ [2] ایضاً ص۱۳۸ [3] ایضاً ص۱۳۷

آزاد اور وطن پرستی پر مبنی تھیں[۱]!

رومیوں کا ایک بڑا امتیاز و خصوصیت ان کی شاہنشاہیت پسندی اور استعماری روح اور زندگی کا خالص مادّہ پرستانہ نقطۂ نگاہ ہے، یہی وہ ترکہ ہے جو موجودہ یورپ کو اپنے رومی مورثوں سے ملا ہے، جرمن نومسلم عالم محمد اسد صاحب نے اپنی کتاب (ISLAM AT THE CROSS ROADS) میں اس کا بڑی خوبی سے تذکرہ کیا ہے، وہ کہتے ہیں :-

"رومی شہنشاہی پر جو خاص خیال حاوی تھا وہ محض ملک گیری کا خیال اور مادرِ وطن کے لئے دوسری قوموں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا اور لوٹ کھسوٹ کرنا تھا، رومی رؤساء و امراء اور اونچے طبقہ کے لوگ اپنے لئے فارغ البالی اور امارت کی زندگی کا سامان حاصل کرنے کے لئے کسی ظلم و بے دردی کو عیب نہیں سمجھتے تھے، باقی وہ رومی انصاف جس کا بڑا شہرہ ہے، وہ محض رومیوں کے لئے تھا، یہ مخصوص سیرت اور کیریکٹر زندگی اور تمدن کے محض مادی تصور ہی پر قائم ہو سکتا تھا، اگرچہ ان کی مادّیت میں کچھ آراستگی اور لطافتِ ذوق پیدا ہو گئی تھی لیکن تمام روحانی قدروں سے وہ بالکل بیگانہ تھی (رومیوں نے کبھی بھی سنجیدگی اور واقعیت کے ساتھ دینداری انیسار نہیں کی تھی، ان کے تقلیدی دیوتا محض یونانی حکایات و خرافات کی پھیکی نقل تھے، انھوں نے محض اپنی اجتماعی شیرازہ بندی اور قومی وحدت کے خیال سے ان ارواح کو تسلیم کر لیا تھا، وہ ان دیوتاؤں کو اپنی عملی زندگی میں دخل دینے کی اجازت نہیں دیتے تھے، ان کا کام صرف اتنا تھا کہ جب ان سے فرمائش کی جائے تو اپنے مجاوروں کی زبانی پیشین گوئیاں کر دیں لیکن ان کو انھوں نے یہ حق کبھی نہیں دیا تھا کہ وہ لوگوں پر اخلاقی قوانین نافذ کریں[۲]!"

---

[۱] تاریخ اخلاق یورپ ص۱۳۶ [۲] ایضاً ص۳۸-۳۹

جمہوری دور کے آخر میں روم میں اخلاقی انحطاط اور حیوانی ہوس رانی اور تعیش کا ایسا سیلاب آیا کہ رومی اس میں بالکل ڈوب گئے اور وہ اخلاقی نظام وضوابط جو رومی قوم کی ابتدائی خصوصیت تھی خس وخاشاک کی طرح بہہ گئے، اجتماع اور معاشرت کی عمارت میں ایسا تزلزل آیا کہ قریب تھا کہ وہ زمین پر آرہے' ڈاکٹر ڈریپر نے اپنی مشہور کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" میں اس کی قلمی تصویر کھینچی ہے' وہ لکھتا ہے:-

"جب جنگی قوت اور سیاسی اثر کے لحاظ سے سلطنت وہ انتہائے ترقی پر فائز ہوگئی تو مذہبی اور عمرانی پہلو سے اس کی اخلاقی حالت فساد کے درجۂ اخیر کو پہونچ چکی تھی' اہل روما کی عیش پرستی وعشرت پسندی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی' ان کا اصول یہ تھا کہ انسان کو چاہئے کہ زندگی کو ایک سلسلۃ العیش بنادے' پاک بازی حفظ نفس کے خوانِ نعمت پر بمنزلہ نمکدان ہے' اور اعتدال سلسلۂ حفظ نفس کی درازی کا محض ایک ذریعہ ہے' ان کے دسترخوان سونے چاندی کے باسنوں سے جن پر جواہرات کی پچی کاری ہوتی تھی جھلکتے ہوئے نظر آتے تھے' ان کے ملازم زرق برق پوشاکیں پہنے ان کی خدمت کے لئے کمربستہ کھڑے رہتے تھے' ماہرویانِ روما جو عام طور پر عصمت کی طلائی زنجیر کی قید سے آزاد تھیں' ان کی مستی انگیز صحبتوں کا لطف دوبالا کرنے کے لئے محو ناز رہتی تھیں' عالی شان حماموں، دل کشا تماشہ گاہوں اور جوش آفریں دنگلوں سے جن میں پہلوان کبھی ایک دوسرے سے اور کبھی وحشی درندوں سے اس وقت تک مصروف زور آزمائی رہتے تھے' جب تک کہ حریفوں میں سے ایک ہمیشہ کے لئے خاک و خون میں سو نہ جائے' اہل روما کے سامان تعیش پر مزید اضافہ ہوتا تھا' دنیا کے ان فاتحوں کو تجربہ کے بعد یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ عبادت اور پرستش کے لائق

اگر کوئی شئے ہے تو وہ قوت ہے اس لئے کہ اسی قوت کی بدولت تمام اس سرمایہ کا حاصل کرنا ممکن ہے جو محنت اور تجارت کی مسلسل جانکاہیوں اور عرق ریزیوں سے پیدا ہوا ہے، مال اور املاک کی ضبطی، صوبہ جات کے محاصل کی تشخیص زور بازو کی بدولت جنگ میں کامیاب ہونے کا نتیجہ ہے اور فرمانروائے دولت روما اس زور و قوت کا نشان یا علامت ہے، غرض روما کے نظام تمدن میں جاہ و جلال کی ایک جھلک تو نظر آتی تھی لیکن یہ جھلک اس نمائشی ملمع کی چمک کے مشابہ تھی جو یونان عہد قدیم کی تہذیب پر چڑھ گیا تھا۔"[1]

عیسائیوں کی آمد اور رومیوں کا قبول مسیحیت

ایک بڑا انقلاب انگیز واقعہ جس کی اہمیت کو کوئی مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا، عیسائیت کا بُت پرست روما کے تخت سلطنت پر فائز ہو جانا ہے، یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ قسطنطین جس نے مسیحیت قبول کر لی تھی ۳۰۵ء میں شہنشاہان روما کے تخت پر بیٹھا اور اس طرح سے مسیحیت نے قدیم بُت پرستی پر فتح پائی اور دفعۃً اس کو ایسی وسیع سلطنت اور غیر محدود اختیار واقتدار حاصل ہو گیا جس کا وہ خواب نہیں دیکھ سکتی تھی، چونکہ قسطنطین کو عیسائیوں کی سرفروشی فداکاری اور زبردست قربانیوں سے تخت سلطنت ہاتھ آیا تھا، اس لئے اس نے عیسائیوں کو اس کا پورا صلہ دیا اور سلطنت میں پورے طور پر شریک کیا۔

مسیحیت میں بت پرستی کی آمیزش

لیکن حقیقۃً مذہب عیسوی کے لئے یہ ایک بڑا نامبارک واقعہ تھا اس نے عظیم الشان

---

[1] معرکۂ مذہب و سائنس مترجمۂ مولوی ظفر علی خاں ص ۴۹-۵۰

سلطنت تو حاصل کرلی لیکن بڑی قیمتی مذہبی متاع کھودی، عیسائی میدان جنگ میں تو فتحیاب ہوئے لیکن مذاہب و ادیان کے معرکہ میں انھوں نے شکست کھائی رومی بُت پرستوں اور خود عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کے دین کو مسخ کرکے رکھ دیا، اس میں سب سے بڑا ہاتھ خود مسیحیت کے محافظ ناموس اور علم بردار اعظم قسطنطین کا ہے، ڈریپر لکھتا ہے:۔

"فاتح اور کامیاب جماعت کے ساتھ جو کوئی شریک ہوا اسے بڑے بڑے عہدے اور مرتبے ملنے لگے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا دار لوگ جنھیں مذہب کی خس برابر بھی پروا نہ تھی مسیحیت کے سب سے زیادہ جوشیلے حامی ہوگئے چونکہ وہ بظاہر عیسائی لیکن بباطن مشرک و بُت پرست تھے لہٰذا ان کے اثر کی وجہ سے عیسائیت میں بت پرستی و شرک کے عناصر کی آمیزش شروع ہوگئی قسطنطین نے کہ وہ بھی انھیں کا ہم مشرب تھا کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جس سے ان کے اس منافقانہ طرز عمل کا سدباب ہو قسطنطین کی ساری عمر سیاہ کاریوں میں گزری اور کہیں آخری وقت (۳۳۷ء) میں جاکر اس نے ان مذہبی مراسم کی پابندی کی جن پر عمل کرنے کی کلیسا ہدایت کرتا ہے۔[1]

اگرچہ عیسائی جماعت اس قدر قوی ہوچکی تھی کہ جس شخص کو اس نے اپنے گون کا سمجھا اسے تخت پر بٹھا دیا لیکن یہ قدرت اُسے پھر بھی حاصل ہوئی تھی کہ اپنے حریف یعنی بُت پرستی کا استیصالِ کلی کرسکے، دونوں کی باہمی کش مکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے اُصول شیر وشکر ہوگئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہوگیا جس میں بُت پرستی و عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں، عیسائیت اور اسلام میں اس بارہ میں یہ بڑا فرق ہے کہ اسلام نے اپنے مدِمقابل کو مطلقاً نیست و نابود کردیا اور اپنے عقائد کو

[1] معرکۂ مذہب و سائنس ص۵۳-۵۴

بلا کسی آمیزش کے شائع کیا۔

اس شہنشاہ کو جو محض دنیا کا بندہ تھا، اور جس کے مذہبی اعتقادات خس سے بھی کم وقعت رکھتے تھے، اپنا ذاتی فائدہ سلطنت کی بہبودی اور دونوں مخالف جماعتوں یعنی عیسائیوں اور بُت پرستوں کی بھلائی اس میں نظر آئی کہ جہاں تک ہو سکے ان میں یگانگت وارتباط پیدا کیا جائے اور راسخ الاعتقاد عیسائیوں تک کو اس حکمتِ عملی سے چنداں اختلاف نہ تھا اس لئے کہ شاید یہ سمجھتے تھے کہ نئی تعلیم کی شاخ میں اگر پُرانے عقائد کا پیوند لگا دیا گیا تو مذہبِ جدید کو بہت جلد ترقی ہو جائے گی اور آخر کار نجاستوں کی آمیزش سے پاک ہو کر سچا مذہب باقی رہ جائے گا۔"[1]

بُت پرستی اور مسیحیت کا یہ معجون مرکب جس سے مسیحی مذہب کی رُوح اور اس کا حُسن نکل چکا تھا، اس لائق نہ تھا کہ رومیوں کی برسرِ انحطاط سیرت واخلاق کو سنبھال سکے اور ان میں پاک صاف مذہبی زندگی کی رُوح پھونک سکے، اور رومیوں کی تاریخ میں اور بالواسطہ دنیا کی تاریخ میں ایک نئے تابناک عہد کا آغاز کر سکے، اس کے برخلاف اس نے رہبانیت کی بدعت نکالی جو شاید انسانیت وتمدن کے حق میں بُت پرست روما کی حیوانیت سے زیادہ وبالِ جان تھی یورپ کی مادّہ پرستی اور لادینیت میں اس مردم آزار اور آدم بیزار دشمنِ فطرت رہبانیت کو بہت کچھ دخل ہے اس لئے کچھ تفصیل کے ساتھ اس کے تذکرہ کی ضرورت ہے۔

جنونِ رہبانیت

رہبانیت میں اتنا غُلو اور افراط پیدا ہو گیا تھا کہ اس زمانہ میں اس کا قیاس کرنا بھی

---

[1] معرکۂ مذہب وسائنس ص ۶۳

مشکل ہے"تاریخ اخلاق یورپ" سے اس کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

راہبوں اور زاہدوں کی مجموعی تعداد مؤرخین کے اختلافِ بیان کی وجہ سے قطعی طور پر نہیں بتائی جاسکتی تاہم ان کی کثرت اور تحریک رہبانیت کی اشاعت و مقبولیت کا اندازہ اعدادِ ذیل سے ہوسکتا ہے، سینٹ جروم کے زمانہ میں ایسٹر کی تقریب پر تقریباً پچاس ہزار راہبوں کا مجمع ہوتا تھا، چوتھی صدی میں صرف ایک راہب کی ماتحتی میں پانچ ہزار راہب تھے، سینٹ سراپین کی ماتحتی میں دس ہزار راہب تھے اور چوتھی صدی کے خاتمہ پر تو یہ حالت ہوگئی تھی کہ جتنی خود مصر کے شہریوں کی آبادی تھی تقریباً اسی قدر ان زاہدوں اور راہبوں کی تھی، دو چار سال نہیں کوئی پورے دو سو سال تک جسم کُشی منتہائے اخلاق سمجھی جاتی رہی، مؤرخین نے اس کی بڑی لرزہ خیز مثالیں پیش کی ہیں، سینٹ میکیریس اسکندری کی بابت مشہور ہے کہ وہ چھ ماہ تک برابر ایک دلدل میں سویا کئے تاکہ ان کے برہنہ جسم کو زہریلی مکھیاں ڈسیں، نیز یہ کہ یہ ہمیشہ ایک من لوہے کا وزن اپنے اوپر لادے رہتے تھے، ان کے مرید سینٹ یوسیبس تقریباً دو من لوہے کا وزن لادے رہتے تھے، اور تین سال تک ایک خشک کنویں کے اندر مقیم رہے، ایک مشہور راہب یوحنا کے متعلق منقول ہے کہ وہ متصل تین سال تک کھڑے ہوئے عبادت کرتے رہے ایک مدت میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ بیٹھے نہ لیٹے، جب بہت تھک جاتے تو چٹان پر اپنے جسم کو سہارا دے لیتے، بعض زاہد لباس کسی قسم کا نہیں استعمال کرتے تھے، ستر پوشی کا کام اپنے جسم کے بڑے بالوں سے لیتے تھے اور چوپایوں کی طرح ہاتھ پیر کے بل چلتے تھے، راہبوں کے مسکن علی العموم اس وقت مکانات نہیں ہوتے تھے، بلکہ وحشی درندوں کے غار، خشک کنویں یا قبرستان ہوتے تھے، اہلِ زہد کا ایک طائفہ صرف گھاس کھاتا تھا، جسم کی طہارت روح کی پاکیزگی کے منافی سمجھی جاتی تھی، اور جو زاہد مرتبۂ زہد میں جتنی زیادہ ترقی کرتے جاتے تھے اسی قدر

وہ مجسمۂ عفونت و غلاظت ہوتے، سینٹ اتھینیس نہایت فخر سے بیان کرتا ہے کہ سینٹ انتونی باہیں کبرسنی کبھی مدت العمر اپنے پیر دھونے کے عصیاں کا مرتکب نہیں ہوا، سینٹ ابراہام نے پنجاہ سالہ مسیحی زندگی میں اپنے چہرہ یا پیر پر پانی کی چھینٹ نہ پڑنے دی، راہب الگزنڈر بڑے تأسف اور تحیر سے فرماتے ہیں کہ ایک وہ زمانہ تھا جب ہمارے اسلاف منہ دھونا حرام جانتے تھے اور ایک ہم لوگ ہیں کہ حمام جایا کرتے ہیں، راہب معلموں کا بھیس بدلے ہوئے پھرتے تھے اور بچوں کو پھسلا پھسلا کر اپنے حلقہ میں شامل کرتے تھے، والدین کا اپنی اولاد پر کوئی اختیار نہیں رہ گیا تھا، جو اولاد انھیں چھوڑ کر تارک الدنیا ہو جاتی تھی اس کے نام پر پبلک میں ہر طرف واہ واہ ہوتی تھی، پہلے جو اثر و اقتدار بزرگ خاندان یا والد کو حاصل ہوتا تھا، وہ اب پادریوں اور راہبوں کی طرف منتقل ہو گیا، پادری رہبانیت کے لئے لڑکوں کا اغوا کرتے تھے، سینٹ ایمبروز میں اس قسم کے اغوا کی قوت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ اُسے دیکھ کر مائیں اپنے بچوں کو گھر کے اندر بند کر دیتی تھیں، تحریک رہبانیت کا اخلاقی نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے کمالات مردانگی و جوانمردی سے متعلق ہیں، وہ سب یکسر معیوب قرار پا گئے مثلاً زندہ دلی، خوش طبعی، صاف گوئی، فیاضی، شجاعت، جرأت کہ عابدانِ مرتاض کبھی اُن کے قریب بھی ہو کر نہیں گزرے تھے، دوسرا اہم نتیجہ رہبانی طرز معاشرت کا یہ ہوا کہ خانگی زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور دلوں سے اعزا کا احترام و ادب کافور ہو گیا، اس زمانہ میں ماں باپ کے ساتھ احسان فراموشی اور اعزا کے ساتھ قساوتِ قلبی کی جس کثرت سے نظیریں ملتی ہیں اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، یہ زاہدانِ صحرا اور عابدانِ مرتاض اپنی ماؤں کی دل شکنی کرتے تھے، بیویوں کے حقوق کی پامالی کرتے تھے اور اپنی اولاد کو یہ دغا دیتے تھے کہ انھیں بے دلی و وارث محض دوسروں کے ٹکڑوں کے رحم پر چھوڑ دیتے تھے، ان کا مقصودِ زندگی

تمام تر یہ ہوتا تھا کہ خود انھیں نجات اخروی حاصل ہو، انھیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ان کے متعلقین و منوسلین جئیں یا مریں لیکی نے اس سلسلہ میں جو واقعات لکھے ہیں ان کو پڑھ کر آج بھی آنسو نکل آتے ہیں، عورتوں کے سایہ سے وہ بھاگتے تھے، ان کا سایہ پڑ جانے سے اور راستہ گلی میں اتفاقاً سامنا ہو جانے سے وہ سمجھتے تھے کہ ساری عمر کی زہد و ریاضت کی کمائی خاک میں مل جاتی ہے اپنی ماؤں، بیویوں اور حقیقی بہنوں سے بات کرنا بھی وہ معصیت کبیرہ سمجھتے تھے، لیکی نے اس سلسلہ کے جو واقعات لکھے ہیں ان کو پڑھ کر کبھی ہنسی آتی ہے کبھی رونا۔

فطرت دشمنی کا اثر اخلاق و تمدن پر

یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہوگا کہ اس انتہا پسند رہبانیت نے رومیوں کی مادیت کے غلو اور شدت میں اور ان کی بہیمانہ خواہشات پرستی میں کچھ اعتدال و تخفیف پیدا کر دی ہوگی، ایسا عموماً نہیں ہوتا یہ بات فطرتِ انسانی کے خلاف ہے، اور مذاہب و اخلاق کا تجربہ بھی اس کے برخلاف ہے، دراصل جو چیز سرکش مادیت میں اعتدال پیدا کر کے اس کو ایک معتدل زندگی میں تبدیل کر سکتی ہے، وہ صرف ایسا روحانی دینی و اخلاقی حکیمانہ نظام ہے جو انسان کی فطرتِ سلیم کے عین مطابق ہو اور اس بات کے درپے نہ ہو کہ وہ فطرت کو بالکل تبدیل کر دے، اس کا مقصد اس کا ازالہ (مٹا دینا) نہ ہو بلکہ اِمالہ (پھیر دینا) ہو، وہ اس کا رُخ شر سے خیر کی طرف تبدیل کر دے، اسلام کا طرز عمل اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ مبارک یہی ہے عرب بہادر و جنگجو تھے، آپ نے ان کی شجاعت کو سرد نہیں کیا بلکہ صرف قبائلی خانہ جنگی اور جاہلی جذبۂ انتقام سے اس کو موڑ کر جہاد فی سبیل اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کی طرف پھیر دیا عرب فیاض اور عالی حوصلہ تھے لیکن ان کی فیاضی اور عالی حوصلگی فخر و ناموری میں صرف ہوتی تھی،

آپ نے اس کو راہِ خدا میں خرچ کرنے پر لگا دیا، غرض یہ کہ آپ نے ان کے جاہلی خصائص واخلاق کو اسلامی سانچہ میں ڈھال دیا اور ان کو مفید اور کارآمد بنا دیا، آپ نے جاہلیت کے بجائے اسلام کا پورا انظام اور ہر چیز کا بدل (اور نعم البدل) عطا فرمایا، طبائع اور نفوس کو تازگی اور تفریح کے مواقع بھی عطا فرمائے اس لئے کہ بقول ایک جلیل القدر عالم (شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ) کے "انسانی طبیعتیں ہمیشہ کسی چیز سے اسی وقت دست بردار ہوتی ہیں، جب ان کو اس کا بدل ملتا ہو، انسان فطرتاً کچھ کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور اس کی فطرت کا تقاضا عمل اور مشغولیت ہے کلیۃً بیکار اور معطّل ہو جانا اس کی فطرت کے خلاف ہے[1]، انبیاء کرام تبدیلِ فطرت کے لئے نہیں بلکہ تکمیلِ فطرت کے لئے مبعوث ہوتے ہیں[2]" حدیث وسیرت میں اس کی متعدد نظیریں ملیں گی، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس وقت اہل مدینہ کے دو تہوار تھے جن میں وہ تفریح کرتے تھے آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیسے دو دن ہیں لوگوں نے کہا کہ ہم ایامِ جاہلیت میں ان میں تفریح کرتے تھے، فرمایا اللہ تعالےٰ نے تم کو اس سے بہتر دو دن عطا فرمائے ہیں عید الاضحیٰ وعید الفطر[3]، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ عید کے دن ایک مرتبہ میرے پاس انصار کی دو لڑکیاں وہ گیتیں گا رہی تھیں جو بعاث کی جنگ میں کہی گئی تھیں اور وہ کچھ گانے والی نہ تھیں، اتنے میں حضرت ابو بکرؓ تشریف لائے فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر میں شیطان کی گیتیں ہو رہی ہیں؟ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابو بکرؓ ہر قوم کی ایک عید ہے اور یہ ہماری عید ہے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ابو بکرؓ جانے دو یہ عید کے دن ہیں[4]۔

اس کے برخلاف رومی عیسائیت نے بیکار فطرت کو تبدیل اور فنا کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور

---

[1] کتاب اقتضاء الصراط المستقیم صفحہ ۱۴۲ [2] کتاب النبوات از امام ابن تیمیہؒ۔ [3] ابو داؤد، احمد و نسائی [4] بخاری و مسلم۔

ایسا نظام پیش کیا جس کی فطرت متحمل نہیں ہو سکی، اس نے انسان کی طاقت سے زیادہ انسان پر بوجھ ڈالا، روم کی سابقہ انتہائی مادیت کے خلاف ایک ردِ عمل کے طور پر لوگوں نے طوعاً و کرہاً اس کو برداشت کیا، لیکن جلد ہی اس سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور دبی ہوئی مظلوم فطرت نے سخت انتقام لیا، اپنی اس غالی رہبانیت، فطرت کے حقائق سے چشم پوشی اور ناعاقبت اندیشی سے مسیحیت لوگوں کے اخلاق و عادات اور ہلاکت کے غار میں گرتے ہوئے تمدن کا ہاتھ نہ پکڑ سکی، حالت یہ تھی کہ عیسائی ممالک میں بیک وقت معصیت و آزادی اور زہد و رہبانیت کی دو متقابل تحریکیں دوش بدوش چل رہی تھیں بلکہ شاید زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ رہبانیت تو صحراؤں میں گوشہ نشین تھی اور شہری زندگی پر اس کا کوئی اقتدار نہ تھا، اور اس کے برخلاف فسق و فجور کی تحریک شہروں کے اندر اپنے پورے جوش و تلاطم پر تھی، لیکی "مسیحی دنیا کے اخلاقی انحطاط کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے:۔

"اخلاق میں رکاکت و پستی حد درجہ سرایت کر گئی تھی، دربار کی عیش پرستیاں ارکان دربار کی غلام طینتی اور ملبوسات و زیورات کی تزئین و آرائش اپنے شباب پر تھی، دنیا اس وقت انتہائی رہبانیت اور انتہائی بدکاری کے تھپیڑوں کے درمیان جھونکے کھا رہی تھی، بلکہ بعض شہر جن میں سب سے زیادہ کثیر التعداد زہاد و راہبین پیدا ہوئے تھے، وہ وہی تھے، جن میں عیش پرستی اور بد چلنی کی سب سے زیادہ گرم بازاری تھی، غرض بدکاری اور توہم پرستی کا ایسا اجتماع ہو گیا تھا جو انسان کی شرافت و عظمت کا قطعی دشمن ہے، رائے جمہور اس قدر ضعیف ہو گئی تھی کہ لوگوں کو بدنامی و رسوائی کا مطلق خوف نہیں باقی رہا تھا، البتہ ضمیر کو مذہب کا دھڑکا ہو سکتا تھا، لیکن اسے بھی اس اعتقاد نے مٹا دیا تھا کہ دعاؤں وغیرہ کے ذریعہ سے سارے گناہ معاف

ہو سکتے ہیں، مکاری، دغابازی دروغ گوئی کی وہ گرم بازاری تھی، جو قیاصرہ کے زمانہ میں بھی نہ تھی، البتہ ظلم وتشدد، شقاوت و بے حیائی اتنی نہ تھی لیکن اس کے ساتھ حریتِ فکر آزاد خیالی و جوش قومیت میں بھی کمی تھی۔"[1]

اربابِ کلیسا کی عیش پرستی اور دنیا داری

رہبانیت اور مذہب کا یہ سلبی نظام خلافِ فطرت ضرور تھا، لیکن نئے مذہب کے اثرات اور اس کے روحانی اقتدار نے فطرت کو دبا رکھا تھا، لیکن تھوڑے دنوں کے بعد خود مذہبی مرکزوں اور حلقوں میں وہ تمام عیوب اور عیش پرستی شروع ہو گئی جس کے خلاف رہبانیت کی تحریک شروع کی گئی تھی، یہاں تک کہ وہ اخلاقی انحطاط و پستی، اور اپنے تنعّم و عیش پرستی میں خالص دنیادار حلقوں سے بھی کہیں آگے بڑھ گئے، حکومت کو مجبوراً ان مذہبی دعوتوں کا سلسلہ بند کرنا پڑا جن کا مقصد مسیحیوں میں اُخوت و محبت پیدا کرنا تھا، اسی طرح سے شہداء و اولیاء کے عُرس اور ان کی برسیاں ممنوع قرار دی گئیں کیونکہ یہ خالص مذہبی تقریبات فسق و بے حیائی کا اڈا بن گئی تھیں، بڑے بڑے پادریوں پر بڑے بڑے اخلاقی جرائم کا الزام تھا، سینٹ جروم کا مقولہ ہے کہ اہل کلیسا کے تعیّش کے سامنے امراء اور دولتمندوں کی عیش و عشرت بھی شرماتی ہے، خود پوپ اخلاقی انحطاط میں مبتلا تھے، اور دولت کی ہوس اور مال کا عشق تو ان پر اتنا غالب تھا کہ منصب اور عہدے معمولی سامانِ تجارت کی طرح بکتے تھے، اور کبھی کبھی ان کا نیلام ہوتا تھا، جنت کے قبالے جائداد کی معمولی دستاویزوں کی طرح، مغفرت کے پروانے، نقص قانون کے اجازت نامے اور نجات کے سرٹیفکیٹ بے تکلف بکتے تھے، مذہبی عہدہ دار سخت راشی و سود خوار تھے

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ جلد دوم صفحہ ۱۰۲

فضول خرچی اور اسراف کا حال یہ تھا کہ پاپائے انوسینٹ ہشتم نے پاپائی کا تاج رہن رکھا اور پاپائے لیو دہم کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے تین پاپاؤں کی آمدنی اڑا ڈالی یعنی سابق پوپ نے جو دولت چھوڑی تھی پہلے وہ خرچ کی اس کے بعد اپنی دولت جب یہ بھی کافی نہ ہوئی تو اپنے جانشین کی آمدنی کو پہلے سے وصول کر کے صرف کر ڈالا بیان کیا جاتا ہے کہ مملکت فرانس کی پوری آمدنی بھی ان پاپاؤں کے اخراجات کے لئے کافی نہ ہوتی تھی۔[1]

غرض یہ کہ کلیسا کی تاریخ اور ارباب کلیسا کی سیرت قرآن کی اس آیت کی پوری پوری تفسیر تھی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ	مسلمانو! یہودیوں اور عیسائیوں کے
الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ	علماء اور مشائخ میں ایک بڑی تعداد
أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ	ایسے لوگوں کی ہے جو لوگوں کا مال ناحق
عَن سَبِيلِ اللَّهِ۔	ناروا کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے انھیں
(التوبۃ ـ ۳۴)	روکتے ہیں۔

حکومت و کلیسا کی کشمکش

گیارھویں صدی عیسوی میں حکومت و کلیسا کی کشمکش شروع ہوئی اور اس نے بڑی شدت اختیار کر لی، ابتدا میں پوپ کو اس جنگ میں فتح ہوئی اور پوپ کا اقتدار و اعزاز اتنا بڑھ گیا کہ شہنشاہ ہنری چہارم ۱۰۷۷ء میں اس بات پر مجبور ہوا کہ کانوسا کے قلعہ میں پوپ کے حضور میں حاضر ہو، چنانچہ وہ نہایت ذلت کے ساتھ حاضر ہوا، پوپ نے بڑی مشکل سے لوگوں کی

---

[1] معرکۂ مذہب و سائنس۔

سفارش پر اپنے سامنے کھڑے ہونے کی اجازت دی اور شہنشاہ ننگے پاؤں اُون پہنے ہوئے آیا، پوپ کے ہاتھ پر توبہ کی اور پوپ نے اس کی غلطی معاف کی، اس کے بعد حکومت و کلیسا کی آویزش میں کبھی پوپ کو فتح اور کبھی شکست ہوئی یہاں تک کہ انجام کار حکومت کے مقابلہ میں کلیسا کو دبنا پڑا، اِس پوری مدتِ کشمکش میں لوگ مذہب و سیاست اور کلیسا و ریاست کی دُہری غلامی میں گرفتار تھے۔

اقتدار کا غلط استعمال اور یورپ کے تمدّن پر بُرا اثر

پوپ قرونِ وسطیٰ میں بڑے وسیع اقتدار اور ایسی عظیم الشان طاقت کے مالک تھے جو شاہانِ روما کو بھی حاصل نہ تھی، ان کے لئے یہ بہت آسانی سے ممکن تھا کہ وہ دین کے زیرِ سایہ یورپ کو علم اور تمدن میں ترقی دیتے، ڈریپر لکھتا ہے کہ اگر پاپایانِ روما اپنی ہوس رانیوں اور دنیا پرستیوں میں مبتلا نہ ہوتے تو وہ اس بات پر قادر تھے کہ ان کے ایک اشارہ پر تمام برِاعظم بالاتفاق ایسی ترقی کرتا کہ دنیا دنگ رہ جاتی، ان کے نائب بے روک ٹوک ہر ملک میں جاسکتے تھے، اور آئرلینڈ سے لے کر بوہیمیا اور اٹلی سے چل کر اسکاٹ لینڈ تک بلاتکلف آپس میں بات چیت کرسکتے تھے، ایک زبان ہونے کی وجہ سے وہ بین الاقوامی امور کے نظم و نسق میں دخیل ہوگئے اور ہر ملک میں انھیں ایسے ہوشیار اور معاملہ فہم حلیف ہاتھ آگئے تھے، جو ایک ہی زبان بولتے تھے، اور عام امور میں ان کا ہاتھ بٹانے کے لئے تیار تھے۔

لیکن مسیحیت اور مسیحی اقوام کی بدقسمتی تھی کہ اربابِ کلیسا نے اس زبردست طاقت کا ناجائز استعمال کیا، انھوں نے اس سے اپنے شخصی اثر و اقتدار کے لئے فائدہ اٹھایا اور یورپ بدستور پستی، جہالت و خرافات کی تاریکیوں میں پڑا رہا، اور تمدن اور شہریت کو ترقی ہونے کے بجائے سخت تنزل ہوا، برِاعظم یورپ کی آبادی ہزار سال میں بھی اور ملک انگلستان کی آبادی پانچ سو سال میں بھی دوچند نہ ہوسکی، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں بڑا دخل اس بات کو ہے کہ پادری اور راہب تجرّد کی زندگی کی بڑی

تبلیغ کرتے تھے، اس کے ساتھ کلیسا نے ہمیشہ اس کا اہتمام کیا کہ جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو طبیب یا اس کے پیشہ سے مانوس نہ ہونے دیا جائے اس لئے کہ اس کا خانقاہوں کی آمدنی پر جو دعا و تبرکات کے ذریعہ ہوتی تھی اثر پڑتا تھا اور طبیب اس منفعت میں کلیسا کے رقیب بن سکتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک زبردست وبائیں اور امراض پھیلے اور موت کی گرم بازاری ہوئی، انیئس سلوئیس نے ۱۴۳۰ء میں جزائر برطانیہ کی جو سیاحت کی ہے اور اپنے سفر کے حالات لکھے ہیں، اس سے اس ملک کا تمدنی انحطاط افلاس اور فاقہ زدگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتب مقدسہ میں الحاق و تحریف اور اس کے نتائج

لیکن اہل دین کی سب سے خطرناک غلطی جس سے انھوں نے اس مذہب کو جس کے وہ نمائندے تھے، اور خود اپنے کو سخت ترین نقصان پہونچایا، یہ تھی کہ انھوں نے اپنی مقدس دینی کتابوں میں ان تاریخی، جغرافیائی اور طبعی نظریات اور مشہورات کو داخل کر دیا جو اس زمانہ کی تحقیقات اور مسلمات تھے، اور انسانی علم ان کے زمانہ تک اسی حد تک پہونچا تھا، لیکن وہ انسانی علم کی حد نہ تھی اور اگر اس زمانہ میں وہ حد سمجھ لی گئی تھی تو وہ دراصل آخری حد نہ تھی، اس لئے کہ انسان کا علم تدریجی ترقی پذیر، اور مسافر ہے جس کا قیام عارضی ہے، اس پر کوئی پائدار عمارت نہیں قائم کی جاسکتی، وہ بعض اوقات ریت کی طرح کھسک جاتا ہے، اور عمارت منہدم ہو جاتی ہے، ارباب کلیسا نے غالباً خوش نیتی سے ایسا کیا تھا، اُن کا مقصد شاید یہ تھا کہ اس سے ان آسمانی کتابوں کی عظمت و شان اور مقبولیت میں اضافہ ہوگا، لیکن آگے چل کر یہی چیز ان کے لئے وبال جان اور مذہب و عقلیت کے اس نامبارک معرکہ کا سبب ہوئی جس میں مذہب (وہ مذہب جس میں انسانی علم کی آمیزش تھی) نے شکست کھائی اور یورپ میں اہل مذہب کو ایسا زوال ہوا جس کے بعد پھر عروج نہ ہو سکا،

اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہوئی کہ یورپ لادینی ہو گیا۔

اہل مذہب نے صرف اسی الحاق اور تحریف پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان تمام جغرافیائی، تاریخی اور طبعی معلومات کو جو لوگوں میں زبان زد اور مشہور تھے یا کتب مقدسہ کے بعض شارحین و مفسرین نے ان کا تذکرہ کیا تھا، دینی تقدس کا جامہ پہنا دیا اور ان کو مذہبی رنگ دے کر ان مسیحی تعلیمات و اصول میں شامل کر لیا جن پر اعتقاد رکھنا ایک مسیحی کے لئے ضروری ہے اس موضوع پر انھوں نے کتابیں تصنیف کیں اور اس جغرافیہ کو جس کی کوئی آسمانی سند نہ تھی جغرافیہ مسیحی CHRISTIAN TOPOGRAPHY کا نام دیا اور اس کے تسلیم کرنے پر اس قدر اصرار کیا کہ جن لوگوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا ان کی تکفیر کی۔

مذہب و عقلیت کی کشمکش اور ارباب کلیسا کے مظالم

اتفاق سے یہ وہ زمانہ تھا کہ یورپ میں عقلیت کا کوہ آتش فشاں پھٹ چکا تھا، علماء طبیعیات اور محققین تقلید کی زنجیریں توڑ چکے تھے انھوں نے ان بے اصل نظریات کی تردید کی جو جغرافیہ اور تاریخ اور طبیعیات سے متعلق ان مذہبی کتابوں میں پائے جاتے تھے، اور بڑی جسارت اور آزادی کے ساتھ ان کی علمی تنقید کی اور بے سمجھے ان پر ایمان لانے سے صاف انکار کر دیا اس کے ساتھ انھوں نے اپنے علمی اکتشافات اور تجربوں کا بھی اعلان کر دیا، اب کیا تھا مذہبی حلقوں میں قیامت برپا ہو گئی، ارباب کلیسا نے (جو اقتدار اور طاقت کے مالک تھے) ان کی تکفیر کی اور دین مسیحی کے لئے ان کے خون بہانے اور ان کے مال و متاع ضبط کر لینے کی اجازت دی، احتساب کی عدالتیں قائم ہوئیں، جو بقول پوپ کے "ان ملاحدہ اور مرتدین کو سزا دیں جو شہروں، گھروں، تہ خانوں، جنگلوں، غاروں اور کھیتوں میں پھیلے ہوئے ہیں" ان عدالتوں نے اپنا فریضہ پوری سرگرمی اور مستعدی سے

انجام دیا، اس کے جاسوس برّاعظم کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے اور اس بارہ میں محکمۂ احتساب نے تفتیش اور تجسّس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، ایک عیسائی عالم کہتا ہے کہ "ناممکن ہے کہ کوئی شخص عیسائی بھی ہو اور وہ بستر پر جان دے" اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس محکمہ نے جن لوگوں کو سزا دی ان کی تعداد تین لاکھ سے کم نہیں، جن میں بتیس ہزار کو زندہ جلایا گیا، انھیں زندہ جلائے جانے والوں میں ہیئت و طبیعیات کا مشہور عالم برونو BRUNOE بھی ہے جس کا سب سے بڑا جرم کلیسا کے نزدیک یہ تھا کہ وہ اس کرۂ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل تھا، محکمۂ احتساب کے حکام نے اسے اس سفارش کے ساتھ دنیوی حکام کے سپرد کیا کہ اسے نہایت نرمی سے سزا دی جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ اس کے خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرنے پائے اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے، اسی طرح مشہور طبیعی عالم گلیلیو (GALILIO) کو اس بنا پر موت کی سزا دی گئی کہ وہ آفتاب کے گرد زمین کے گھومنے کا قائل تھا۔

اہلِ تجدّد کی مذہب کے خلاف بغاوت اور بیزاری

آخر کار روشن خیالوں اور ترقی پسندوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انھوں نے مذہب و قدامت کے نمائندوں کے خلاف علمِ جنگ بلند کر دیا، وہ مذہبی گروہ کے اس تشدّد و جمود اور محکمۂ احتساب کے ان مظالم سے ایسے بیزار اور مشتعل ہوئے کہ ان تمام عقائد، علم، اخلاق و آداب سے نفرت ہو گئی جن کی نسبت اس گروہ کی طرف کی جاتی ہے یا اس سے ان کا تعلق ثابت ہوتا ہے، ان کے دل میں ابتداءً مسیحی مذہب کے خلاف اور رفتہ رفتہ مطلق مذہب کے خلاف عداوت کا جذبہ پیدا ہو گیا اور وہ جنگ جو ابتداءً علوم و عقلیت کے علم برداروں اور مذہب مسیحی (درحقیقت سینٹ پال کے مذہب) کے نمائندوں کے درمیان تھی، بعد میں علم و دین کی باہمی جنگ کی صورت

اس نے اختیار کر لی، روشن خیالی اور عقلیت کے علم برداروں نے بطورِ خود یہ طے کر لیا کہ علم و مذہب ایک دوسرے کے ضد اور مقابل واقع ہوئے ہیں جو کبھی جمع نہیں ہو سکتے اور دونوں ایک دوسرے کے رقیب اور حریف ہیں، جن میں کبھی صلح نہیں ہو سکتی اس لئے علم و عقلیت کے ساتھ وفاداری کے لئے یہ ضروری ہے کہ مذہب سے منہ موڑ لیا جائے ان کے سامنے جب دین و مذہب کا نام آتا تو دفعتاً نمائندگانِ مذہب اور اربابِ کلیسا کے لرزہ خیز مظالم کی یاد تازہ ہو جاتی اور ان بے گناہ علماء اور محققین کی صورتیں ان کی آنکھوں میں پھر جاتیں جنھوں نے انتہائی مظلومیت اور بے بسی کی حالت میں ان جلّادوں کے ہاتھوں پُر اذیت موت پائی مذہبی گروہ کے نام سے ان کی نگاہوں کے سامنے پُر غضب چہرے چڑھی ہوئی تیوریاں، شرر فشاں آنکھیں، تنگ سینے اور پادریوں کے بھدّے دماغ ہی آتے، چنانچہ مذہب سے وحشت اور نفرت کو انھوں نے ایک اصولِ زندگی کے طور پر طے کر لیا اور آنے والی نسلوں کے لئے بھی نفرت و کراہیت کا یہی ترکہ اور سرمایہ چھوڑا۔

روشن خیالوں کی عجلت پسندی، اور جمود و تعصّب

ان روشن خیالوں، اور تجدد پسندوں میں اتنا صبر و سکون مطالعہ اور غور کی قوت اور عقل و اجتہاد کی قابلیت نہ تھی کہ وہ اصل دین اور اس کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والوں کے درمیان امتیاز کر سکیں اور یہ سمجھ سکیں کہ ان واقعات میں دین کہاں تک ذمہ دار ہے اور کہاں تک اربابِ کلیسا کا جمود، جہالت، استبداد اور غلط نمائندگی اس کی ذمہ دار ہے، اور اگر دوسری شکل ہے تو دین کو اس کی سزا دینا اور اس سے بے تعلقی اختیار کر لینا کہاں تک حق بجانب ہے، لیکن غصّہ اور اہلِ مذہب کی عداوت اور عجلت پسندی نے اس بارہ میں ان کو غور کرنے کا موقع نہ دیا اور جیسے کہ دنیا میں عموماً بغاوت اور احتجاج کے موقع پر ہوتا ہے انھوں نے دین کے ساتھ کوئی رواداری اور مفاہمت پسند نہیں کی۔

ان میں اتنی طلبِ صادق اور اپنی قوم کی خیر خواہی فراخ حوصلگی بھی نہ تھی کہ وہ دینِ اسلام کا مطالعہ کرتے جو ان کی بہت سی معاصر قوموں کا دین تھا اور جو نہایت آسانی کے ساتھ اس مخصوص مذہبِ عقلیت کی اس غیر ضروری کشمکش سے نجات دیتا جو معقول و مستحسن امور کا مطالبہ کرتا، غیر معقول اور ناپسندیدہ چیزوں سے روکتا، دنیا کی بے ضرر اور پاک لذتوں اور فوائد کی ان کو اجازت دیتا، مضر اور قابلِ نفرت اشیاء کو ممنوع قرار دیتا اور ان بے جا زنجیروں اور بیڑیوں کو کاٹ دیتا جو تحریف شدہ مذاہب اور تشدد پسند اہلِ مذہب اور اہلِ حکومت نے ان کے جسم میں ڈال رکھی تھیں۔

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ	(محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ان کو
عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ	نیکی کا حکم دیتے ہیں برائی سے روکتے ہیں پسندیدہ
وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ	چیزیں حلال کرتے ہیں گندی چیزیں حرام
عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي	ٹھہراتے ہیں اس بوجھ سے نجات دلاتے ہیں
كَانَتْ عَلَيْهِمْ.	جس کے تلے وہ دبے ہوئے ہیں ان پھندوں
(الاعراف۔۱۵۷)	سے نکالتے ہیں جو ان پر پڑے ہوئے ہیں۔

لیکن قومی عصبیت اور ان دیواروں کی وجہ سے جو صلیبی جنگوں نے عیسوی مغرب اور اسلامی مشرق کے درمیان اور اربابِ کلیسا کی افترا پردازیوں نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف کھڑی کر دی تھیں، نیز مطالعہ و تحقیق کی محنت برداشت نہ کرنے اور موت کے بعد کی زندگی اور نجاتِ اُخروی سے آزاد و بے فکر ہونے کی وجہ سے انھوں نے اسلام کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

اس میں کچھ دخل مسلمانوں کی تبلیغی کوتاہیوں کو بھی ہے کہ انھوں نے صدیوں یورپ جیسے اہم براعظم میں اسلام کی نشر و اشاعت اور اس کے تعارف کی طرف کوئی توجہ نہیں کی حالانکہ اسلامی حکومت کے عروج اور یورپ کی سلطنتوں سے معاصرانہ اور مساویانہ تعلقات ہونے کی

وجہ سے ان کو اس کے مواقع حاصل تھے۔

غرض اہل یورپ ایسے نازک موقع پر اسلام کی رہنمائی اور اس کی مسیحائی سے محروم رہے۔

یورپ کی مادّیت

بہر حال جس کا خطرہ تھا وہ پیش آگیا اور یورپ کا رُخ ایک مکمّل اور وسیع مادّیت کی طرف ہوگیا خیالات، نقطۂ نظر نفسیات و ذہنیت اخلاق و اجتماع، علم و ادب، حکومت و سیاست کی غرض زندگی کے تمام شعبوں میں مادّیت غالب آگئی، اگرچہ یہ تدریجی طور پر ہوا اور ابتدا میں اس کی رفتار سُست تھی، لیکن قوت و عزم کے ساتھ یورپ نے مادّیت کی طرف حرکت کرنی شروع کی، علماء فلسفہ و علوم طبیعیات نے کائنات میں اس طرز پر غور اور بحث کرنی شروع کی کہ گویا نہ اس کا کوئی خالق ہے نہ منتظم و حاکم اور طبیعات اور مادہ کے ماورا کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو اس عالم میں تصرف اور اس کا نظم و نسق کرتی ہے، وہ عالم طبیعی اور اس کے ظواہر و آثار کی تشریح و توجیہ خالص میکانیکی طریقہ پر کرنے لگے اور اس کا نام علمی اور تحقیقی طرز قرار پایا، اور ہر ایسا بحث و نظر کا طریقہ جس کی بنیاد خدا کے وجود اور اس کے یقین پر ہو، تقلیدی اور غیر علمی طریقہ کہا جانے لگا اور اس کا مذاق اڑایا جانے لگا، اس راستہ کی منزل یہ تھی کہ انھوں نے چلتے چلتے حرکت اور مادہ کے علاوہ ہر چیز کا انکار کر دیا اور ہر اس چیز کے ماننے سے عذر کیا جو حواس اور تجربہ کے اندر نہ آسکے اور جس کا وزن شمار و پیمائش نہ ہو سکے اس کا طبعی اور منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کا وجود اور تمام حقائق مابعد الطبیعیات ایسے مفروضات بن گئے جن کی گویا عقل و علم سے کوئی تائید نہیں ہوتی۔

ان لوگوں نے ایک زمانۂ دراز تک خدا کا انکار نہیں کیا اور مذہب سے صاف صاف اعلان جنگ بھی نہیں کیا اور فی الواقع سب کے سب اس کے منکر بھی نہ تھے لیکن جو طریق فکر اور بحث و نظر یہ جو پوزیشن

انھوں نے اختیار کی تھی وہ ایسے دین کے ساتھ جمع ہی نہیں ہو سکتی تھی جس کی پوری عمارت ایمان بالغیب اور وحی و نبوت کی بنیاد پر ہے اور جو حیات اُخروی پر اس قدر زور دیتا ہے ان میں کوئی چیز بھی حواس و تجربہ کے تحت میں نہیں آتی اور وزن و شمار اور پیمائش سے اس کی تصدیق نہیں کی جا سکتی اس لئے روز بروز ان کو دینی عقائد میں اشتباہ اور ان کے ماننے میں تذبذب پیدا ہو گیا۔

یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے بعد کے لوگ مدت دراز تک مادی نقطۂ نگاہ مادی زندگی اور مسیحی اعمال و رسوم کو جمع کرنے کی کوشش کرتے رہے، مذہبی تقلید سے وہ ابھی پورے طور پر آزاد نہیں ہوئے تھے اور عیسوی دنیا میں مذہبی ماحول ابھی باقی تھا، اخلاق اور اجتماعی مصالح کا بھی تقاضا تھا کہ خواہ برائے نام لیکن مذہبی نظام ضرور برقرار رہنا چاہئے جو قوم کے افراد کے درمیان ربط قائم رکھے اور ملک کو اجتماعی انتشار اور اخلاقی ابتری سے محفوظ رکھے، لیکن مادی تہذیب کی رفتار اتنی تیز تھی کہ مذہب اور اس کے رسوم اس کا ساتھ نہ دے سکے، مادیت اور روحانی مذہب کے جمع کرنے میں خاصی تکلیف تکلف اور تضییع اوقات تھا، اس نے کچھ مدت کے بعد اس تکلف کو برطرف کیا اور صاف صاف لادینیت اور مادہ پرستی اختیار کر لی، اسی زمانہ میں یورپ کے ہر گوشہ میں بہت بڑی تعداد میں ایسے مصنف ادیب، معلم اجتماعی اور سیاسی پیدا ہوئے جنھوں نے مادیت کا صور پھونکا اور اہلِ ملک کے دل و دماغ میں مادہ پرستی کے بیج بو دیئے، علماء اخلاق، اخلاق کی مادی تشریح کرتے تھے کبھی فلسفۂ افادیت کی اشاعت کرتے اور کبھی لذتیت کی، میکاویلی (MACHIAVELLI) (۱۴۶۹-۱۵۲۷ء) جیسے اہلِ سیاست نے دین و سیاست کی تفریق کی دعوت پہلے ہی دے دی تھی اور اخلاق کی دو قسمیں قرار دی تھیں پبلک اور پرائیوٹ، اور طے کر دیا تھا کہ اگر مذہب کی ضرورت ہی ہے تو وہ محض انسان کا ایک پرائیوٹ معاملہ ہے جس کو امورِ سیاست میں دخل نہیں دینا چاہئے حکومت ہر چیز پر

مقدّم اور ہر شئے سے بیش قیمت ہے مذہب عیسوی کا تعلق دوسری زندگی سے ہے ہماری دنیاوی زندگی سے اس کو کوئی سروکار نہیں مذہبی اور نیکو کار انسانوں کا وجود حکومت کے لئے کچھ مفید نہیں اس لئے کہ وہ دین کے احکام کے پابند ہوتے ہیں اور ضرورت کے وقت اخلاقی اصول کو نظر انداز نہیں کرسکتے، بادشاہوں اور حکام کو لومڑیوں کے صفات اختیار کرنے چاہئیں اور اگر حکومت کا فائدہ ہوتا ہو اور کوئی سیاسی مصلحت مقتضی ہو تو عہد شکنی، دروغ گوئی، فریب دہی خیانت اور نفاق میں پس وپیش نہیں کرنا چاہیئے یہ دعوت وتبلیغ پورے طور پر مؤثر وکامیاب ہوئی اور وطنیت وقومیت (جو مذہب قدیم کی جگہ لے رہی تھی) نے بھی اس کی پوری امداد کی۔

مصنفین اہلِ قلم اور اہلِ دماغ نے اپنی جادو بیانی، سحر طرازی اور خطابت وشاعری سے قدیم اخلاق اور اجتماعی نظامات کے خلاف سارے ملک میں ایک بغاوت برپا کردی انھوں نے معصیت کو خوش نما اور دلفریب بنا کر پیش کیا طبیعتوں کو ہر قید وبندش فرد کو ہر ذمہ داری وجوابدہی سے آزاد ہونے کی اور مطلق آزادی ویے قیدی کی کھلی تبلیغ کی زندگی سے پورے پورے تمتّع مطالبات نفس کی پوری تکمیل اور لذّت پرستی کی علانیہ دعوت دی اور اس زندگی کی قیمت میں بڑے غلو اور مبالغہ سے کام لیا، نقد لذت اور ظاہر ومحسوس مادّی نفع کے سوا ہر چیز کا انکار وتحقیر کی۔

اس طرح سے انیسویں اور بیسویں صدی کی مغربی زندگی کی بُت پرست یونان اور روما کی جاہلی زندگی کا مرقّع بن گئی یہ گویا اس کا نیا اڈیشن تھا جو انیسویں صدی میں نئے اہتمام کے ساتھ تیار کیا گیا، یونان اور روما کے جن نقوش کو مشرقی عیسویت نے مدھم کردیا تھا، انیسویں صدی کے نقاشوں نے ان کو پھر اُجاگر کردیا، اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے آج کی مغربی قومیں انھیں یونانی رومی اور مغربی اقوام کی جائز وارث اور خلف الرشید ہیں موجودہ مغربی تہذیب

اور قدیم یونانی اور رومی تہذیب میں قریبی مماثلت پائی جاتی ہے یورپ کی موجودہ مذہبی زندگی بھی روحانیت اور باطنی کیفیت سے اسی طرح عاری ہے جیسے یونانیوں کی مذہبیت تھی، مذہبی کمزوری خشوع اور خضوع اور مذہبی سنجیدگی کی کمی زندگی میں لہو و لعب کی کثرت کا بھی وہی حال ہے جو یونان میں تھا، اور یہ نتیجہ ہے علماء طبیعیات و حکمت کے ان نظریات اور تحقیقات کا جنھوں نے یورپ میں پوری مقبولیت حاصل کرلی اور دین و مذہب کی پوری پوری جگہ لے لی ہے' اسی طرح زندگی کی ہوس، لذت طلبی اور ذواقی اور دنیا میں شوق گل چینی کی بھی بعینہ وہی کیفیت ہے جو سقراط نے اپنے زمانہ کے جمہوری نوجوان کی بیان کی ہے' نیز مذہبی شک' تذبذب' دینی نظام اور مذہبی فرائض و رسوم کی بے وقعتی میں بھی یورپ' یونان و روما سے پیچھے نہیں ہے۔

مسیحیت یا مادہ پرستی؟

حقیقت یہ ہے کہ یورپ کا موجودہ مذہب جس کی دلوں اور روح پر حکومت ہے وہ عیسائیت نہیں بلکہ مادّہ پرستی ہے' مغربی نفسیات اور مغربی زندگی سے اس کی قدم قدم پر تصدیق ہوتی ہے۔

(ISLAM AT THE CROSS ROADS) کا مصنف لکھتا ہے:۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ میں اس وقت بھی ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جو دینی طریق پر سوچتے ہیں' اور مذہبی احساس رکھتے ہیں' اور اپنے عقائد کو اپنی تہذیب کی روح کے ساتھ منطبق کرنے میں امکانی کوشش کرتے ہیں' لیکن یہ مستثنیٰ مثالیں ہیں' یورپ کا عام اور متوسط آدمی وہ جمہوری ہو یا فاشستی' سرمایہ دار ہو یا اشتراکی ہاتھ سے کام کرنے والا ہو یا دماغی محنت کرنے والا، وہ ایک ہی مذہب جانتا ہے' وہ کیا ہے؟ مادّی ترقی کی پرستش اور یہ عقیدہ کہ اس زندگی کی غرض و غایت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس کو

زیادہ سے زیادہ آسان اور پُر راحت اور آزاد اور بے قید بنائے' اس مذہب کے گرجے اور عبادت گاہیں زبردست کارخانے ہیں، تھیٹر و تفریح گاہیں، کیمیاوی دارالصنعت' ناچ گھر اور بجلی کے مرکز، اس مذہب کے پروہت بینکوں کے افسران ہیں' انجینئر' اداکار عورتیں (ایکٹریسیں) فلم اسٹار اور تجارت و صنعت کی بڑی بڑی مرکزی شخصیتیں اور ریکارڈ قائم کرنے والے ہوا باز ہیں' طاقت و لذّت کی اس ہوس اور چھوڑپن کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ حریف گروہ سامانِ جنگ سے لیس اور جنگی تیاریوں سے مکمل تیار کھڑے ہیں' اور ایک دوسرے کو تباہ کر دینے کے لئے پر تول رہے ہیں' اگر ان کی خواہشات اور مصالح میں تصادم ہو گیا، اور جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے انسانوں کا ایک ایسا ٹائپ پیدا ہوا ہے جس کا عقیدہ ہے کہ نیکی اور اخلاق نام ہے عملی فائدہ کا اس کے نزدیک معیار محض مادّی کامیابی ہے[1]۔

مغربی تہذیب صاف صاف پُرزور طریقہ پر خدا کا انکار نہیں کرتی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے ذہنی نظام میں اللہ کی کوئی جگہ نہیں اور اس کے ماننے میں وہ کوئی فائدہ محسوس کرتی ہے' اور نہ اس کی ضرورت سمجھتی ہے[2]۔

پروفیسر جوڈ (JOAD) جو لندن یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ و علم النفس کے صدر ہیں' بنی کتاب (GUIDE TO MODERN WICKEDNESS) میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتے ہیں:۔

"میں نے بیسؔ طلبا اور طالبات کی جو سب کے سب بیسؔ سے کچھ اوپر عمر کے تھے ایک جماعت سے سوال کیا کہ ان میں سے کتنے کسی معنی میں عیسائی ہیں؟ صرف تینؔ نے اس سوال کا اثبات میں جواب دیا اور عیسائی ہونے کا اقرار کیا، ساتؔ نے کہا کہ انھوں نے اس مسئلہ

---

[1] ISLAM AT THE CROSS ROADS. (FIFTH EDITION) P.50

[2] ایضاً P.40

پرکبھی غور نہیں کیا، باقی دس نے صاف صاف کہا کہ وہ کھلے طور پر مسیحیت کے خلاف ہیں، میرا خیال ہے کہ مسیحیت کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کا یہ تناسب اس ملک میں کوئی استثنائی اور غیر معمولی مثال نہیں، ہاں البتہ اگر یہ سوال پچاس سال یا بیس سال اُدھر کیا جاتا تو اس کے جوابات ان جوابات سے مختلف ہوتے اس بنا پر بہت تھوڑے لوگ ہوں گے جو کینن بیری CANON BARRY کے اس بارہ میں ہم خیال ہوں کہ ایک بڑے پیمانہ پر مسیحی بیداری اور ترقی دنیا کو نجات دے سکتی ہے، میری رائے میں ان کے اس دعوے کو حق بجانب ثابت کرنے والی کوئی چیز نہیں، ہاں یہ الگ بات ہے کہ یہ ان کی خواہش ہو ایسا بہت ہوتا ہے کہ خواہشات خیالات پیدا کر دیتی ہیں لیکن وہ دلائل اور ثبوت نہیں پیدا کر سکتی، اس ملک کے حالات و آثار صاف بتلا رہے ہیں کہ مسیحی کلیسا آئندہ صدی میں اپنی عمر پوری کر دے گا، ایک روزانہ اخبار کے اقتباس ذیل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

ستتر برس کے ایک بوڑھے نے ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے جس سے وہ کتاب مقدس کے پُرانے نسخوں کو بندوقوں کی ڈاٹ مصنوعی ریشم، گتا پارچہ اور نوٹوں میں تبدیل کر سکے گا، یہ مشین کارڈف فیکٹری CARDIF FACTORY اور آٹھ دوسرے کارخانوں میں لگا دی گئی ہے اور کتاب مقدس کے نسخوں سے جنگی سامان تیار ہو رہا ہے موجد نے اس مشین سے بڑی دولت پیدا کی ہے۔

پس سن لیں وہ لوگ جن کو اللہ نے کان دیئے ہیں!![1]

---

[1] (GUIDE TO MODERN WICKEDNESS P. 11 & 115)

زر پرستی

یہی مصنف اپنی دوسری کتاب PHILOSOPHY FOR OUR TIMES میں لکھتا ہے:۔

"صدیوں سے انگلستان کے تخیل پر دولت اندوزی کا اصول غالب ہے، حصول دولت کی خواہش پچھلے دو سو سال سے دیگر جملہ محرکاتِ عمل سے زیادہ کام کرتی رہی ہے کیونکہ دولت حصولِ ملکیت کا ذریعہ ہے اور ذاتی ملکیت کی بہتات اور شان و عظمت ہی سے انسان کی قابلیت کا اندازہ کیا جاتا ہے، سیاسیات، ادب، سنیما، ریڈیو اور کبھی کبھی گرجاؤں کے منبروں سے سال بسال اپنے پڑھنے سننے والوں کو یہی تعلیم دی جاتی رہی ہے کہ مہذب قوم وہی ہے جس میں جذبۂ حصول انتہائی طور پر ترقی کر چکا ہے۔

یہ دولت پرستی ہمارے مذہبی عقائد سے متصادم ہے کیونکہ مذہب یقین دلاتا ہے کہ غریبی اچھی اور دولت مندی بُری ہی نہیں بلکہ دولت مند کو نیک بننے کا اتنا ہی کم امکان ہے جتنا کہ غریب کو زیادہ ہے اگرچہ تقاضائے دانش و تعلیم مذہب متفقہ طور پر یہی سکھاتے ہیں کہ خدا پرستی اور حصول جنت غریبی کے ساتھ ہے تاہم لوگوں نے تعلیمِ مذہب کو سچا سمجھ کر اس پر عامل ہونے کا کوئی رجحان ظاہر نہیں کیا اور موجودہ حصولِ دولت کو مستقل حصولِ راحت آسمانی پر بخوشی ترجیح دیتے رہے ہیں، غالباً ان کا یہ خیال رہا ہے کہ بستر مرگ پر توبہ کر کے وہ آخرت میں اتنا ہی فائدہ حاصل کر سکیں گے جتنا کہ یہاں اس دنیا کی مخزونہ دولت سے' ان کے اس تخیل کو (SAMUEL BUTLER) نے اپنی کتابوں میں یوں ظاہر کیا ہے کہ بد شعار مصنفین کہتے ہیں کہ ہم خدا اور دولت کی ساتھ ساتھ پرستش نہیں کر سکتے ہم تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ آسان نہیں لیکن قابلِ حصول چیزیں

آسان ہوتی ہی کب ہیں۔؟

ہمارے اصول کچھ ہی کیوں نہ ہوں، واقعہ یہ ہے کہ عملاً ہم تبلر کے پکے مقلد ہیں، ہم دولت کے اتنے ہی دلدادہ ہیں اور ہمارا یہ اعتقاد کہ دولت ہی فرد و سلطنت کی عظمت کا باعث ہوتی ہے اس قدر راسخ ہے کہ اس سے دنیا کے دو محرک اصول قائم کئے گئے ہیں جو کہ اعلیٰ تاریخی اہمیت رکھتے ہیں، ان میں سے ایک عدم مداخلت کا معاشی اصول ہے جو کہ انیسویں صدی پر غالب رہا، اس اصول کا دعویٰ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے عمل کو زیادہ سے زیادہ مالی فائدہ پر منحصر رکھتا ہے گویا ان کا مذہب لذتیت یہ ہے کہ عمل کا محرک لذت جذبات دلی نہیں بلکہ لذتِ تقاضائے دولت ہے۔

دوسرا اصول جو کہ بیسویں صدی میں غالب نظر آتا ہے، مارکس کا اصول معاشی تقدیر و تنظیم ہے یہ اصول بتلاتا ہے کہ انسان کا معاشی نظام ہمیشہ ان کی مالی ضروریات پر مبنی ہوتا ہے اور یہی نظام اُن کے ادب، اخلاقیات، مذہب منطق، نیز نظامِ حکومت کا خالق ہوتا ہے، ان دونوں اصولوں کی مقبولیت کا انحصار اسی قدر و منزلت پر ہے جو کہ ہمارے مرد و عورت نمایاں طور پر دولت کے انفرادی اور سیاسی معیارِ حسن پر رکھتے ہیں۔[۱]

یہی مصنف اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"جو نظریۂ حیات اس زمانہ پر مستولی اور غالب ہے وہ اقتصادی نظریہ اور ہر مسئلہ اور معاملہ کو پیٹ اور جیب کے نقطۂ نظر سے دیکھنا اور جانچنا ہے۔"[۲]

مسٹر جان گنتھر ممتاز امریکی اخبار نویس نے اپنی کتاب INSIDE EUROPE میں اس زر پرستی کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:۔

لے PHILOSOPHY FOR OUR TIMES P.P. 338-40

لے GUIDE TO MODERN WICKEDNESS P. 114, 115

"انگریز ہفتہ میں چھ روز پرستش تو بینک آف انگلینڈ میں کرتا رہتا ہے صرف ساتویں روز کلیسائے انگلستان کا رخ کرتا ہے۔"

خدا فراموشی وخود فراموشی

ان لوگوں سے جو کسی دوسری زندگی پر ایمان اور لذت وتمتع یا شخصی وقومی سربلندی کے علاوہ کسی مقصد عالی پر یقین نہیں رکھتے اور اللہ سے ان کو کچھ یوں ہی سا برائے نام تعلق ہے' اس کی توقع کرنا کہاں تک صحیح ہوگا کہ ان میں کسی مصیبت یا خطرہ کے موقع پر تضرع اور رجوع الی اللہ کی کیفیت پیدا ہوگی' قرآن مشرکین کے متعلق کہتا ہے کہ "وہ خطرہ اور مصیبت کے وقت خدا ہی کو پکارتے ہیں اور ان کو ایسے موقع پر صرف خدا ہی یاد آتا ہے" لیکن یورپ کے مادہ پرست مادیت میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں اور ظاہری اسباب وعلل ان پر اتنے غالب آ گئے ہیں' ان کی زندگی میں خدا سے اتنا استغنا اور دلوں میں اتنی سختی اور بے حسی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ قرآن مجید کی ان آیتوں کا مصداق بن گئے ہیں :-

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ	اور ہم تم سے پہلے بہت سی امتوں پر رسول
فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ	بھیجے تھے پھر ہم نے ان کو سختی اور تکلیف میں
لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ○ فَلَوْلَآ	گرفتار کیا تاکہ وہ (خدا کے حضور میں) گڑگڑائیں
اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ	پھر کیوں نہ گڑگڑائے جب ان پر ہمارا عذاب آیا
قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ	لیکن (الٹے) ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان
مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (الانعام ۔۴۲، ۴۳)	نے ان کے کام کو آراستہ کر کے دکھایا۔
وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا	اور ہم نے پکڑا تھا ان کو آفت میں پھر نہ عاجزی
اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ○ (المؤمنون ۔۷۶)	کی اپنے رب کے آگے اور نہ گڑگڑائے۔

چنانچہ آپ کو جنگ کے سخت ترین مواقع اور نازک ترین گھڑیوں میں بھی خدا کی طرف توجہ، انابت کی کیفیت، دل کی شکستگی اور شان عجز و بندگی نظر نہ آئے گی، اور نہ قوم کے اخلاق واعمال اور تفریحات ودلچسپیوں میں کوئی فرق نظر آئے گا، مغرب کے مفکرین اہل قلم اور رہنما اسی پر فخر کرتے ہیں، اور اس کا نام ان کے یہاں استقلال نفس، قوت قلب اور قومی عزت نفس و خودداری ہے، مشرقی خدا پرست اور مسلمان کے نقطۂ نظر سے یہی قساوت قلب، غفلت، لہو ولعب میں انہماک اور بدہوشی و خود فراموشی ہے۔

"لندن کی ایک رات" کے عنوان کے تحت لندن میں بسنے والے ایک ہندوستانی ۱۹۴۰ء کے ہوائی حملوں کے زمانہ کی آپ بیتی سناتے ہیں:۔

"اس رات ہم سب دوست احباب کئی دن اور کئی رات کے متواتر حملوں سے تنگ آکر ایک نہایت پرتکلف ملی جلی ہندوستانی، انگریزی دعوت کے انتظام میں مصروف تھے، مالکِ مکان نے اپنا باورچی خانہ اور اس کا سب سامان ہمارے حوالہ کر دیا تھا اور اوپر کا بڑا کمرہ بھی ناچ کے لئے خالی کر دیا تھا، کوئی پچیس عورتیں اور مرد سب نے مل کر اپنے ہاتھ سے کھانا پکایا، کھا پی کر ہم لوگ ناچ رہے تھے کہ یکایک خطرہ کا سائرن بجا، پہلے تو ایک دم سب خاموش ہو گئے، مگر ناچ بند کئے بغیر ایک بولا، کیا صلاح ہے؟ ایک لڑکی نے جواب دیا ناچتے رہیں گے چنانچہ ہم سب ناچتے رہے، اور گانوں اور قہقہوں سے سارا مکان تو کیا سارا محلہ گونجنے لگا۔"[1]

اس اقتباس سے کچھ اوپر کی سطریں یہ ہیں:۔

"تھوڑے دن کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ روز شام کے وقت سات آٹھ بجے سائرن بجتا، دشمن کے ہوائی جہاز کی گھر گھر سنائی دینے لگتی، سرچ لائٹ کا جلتا ہوا اجال

---

[1] ہوائی حملہ ص۱۷ مصنفہ آغا اشرف دہلوی ایم اے۔

آسمان پر بجھ جاتا تو میں دغنے لگتیں اور زمین و آسمان ہل جاتے اس وقت اگر سنیما ہوتا تو تصویر کا سلسلہ تھوڑی دیر کے لئے بند ہو جاتا، اور پردہ پر یہ لفظ آجاتے "ابھی ہوائی حملہ شروع ہوا ہے مگر یہ تصویر جاری رہے گی جو لوگ پناہ خانہ میں جانا چاہیں ان کا راستہ نیچے "بائیں طرف کو ہے" مگر سب بیٹھے رہتے اور تصویر پھر جاری ہو جاتی[1]"!

اس تفریحی انہماک اور خود فراموشی کی مثال قدیم یونان و روما ہی میں مل سکتی ہے، تاریخ کی روایت ہے کہ پامپی آئی، کا کوہ آتش فشاں جب پھٹا ہے، اور آسمان سے آگ کے شعلے اور انگارے، زمین سے زلزلہ آیا ہے تو دن کا وقت تھا، اور لوگ ایمفی تھیٹر میں (اس عظیم الشان منڈوے میں جو بیک وقت بیس ہزار انسانوں کا جلسہ گاہ تھا) بیٹھے ہوئے درندوں کو زندہ انسانی جسموں کو اپنے پنجوں اور دانتوں سے نوچتے اور چیرتے پھاڑتے دیکھ رہے تھے، اس ظالمانہ لہو ولعب کی عین مشغولیت میں زلزلہ آیا اور آگ آسمان سے برسنا شروع ہوئی کچھ جہاں بیٹھے لیٹے تھے، وہیں جل کر اور بھسم ہو کر رہ گئے، کچھ باہر نکلے تو اندھیرا گھپ، جسم سے جسم، سر سے سر ٹکرائے، کتنے یوں ختم ہوئے کچھ خوش نصیب تھے جنھوں نے کشتیوں اور جہازوں میں بھاگ بھاگ کر جان بچائی، شہر اٹھارہ سو [۱۸۰۰] برس تک دنیا کے نقشہ سے غائب ہو گیا، انیسویں صدی کے وسط میں پتہ چلا کہ معدوم نہیں ہوا ہے صرف گرد خاکستر سے پٹ گیا ہے، کھدائی شروع ہوئی اور برسوں کے بعد شہر عبرت کا عجائب خانہ بنا ہوا اسی طرح جوں کا توں نکل آیا:۔

اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰىٓ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ	کیا بستیوں والے اس بات سے نڈر ہیں کہ ان پر
بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ○	ہمارا عذاب آپہنچے دن چڑھے جب وہ
(الاعراف ـ ۹۸)	کھیل میں مشغول ہوں۔

---

[1] ہوائی حملہ صـ

خدا شناس، خدا پرست انسانوں کا طرزِ عمل اور سیرت و اخلاق جنگوں اور خطرات کے موقع پر اس طرزِ عمل سے جس قدر مختلف اور مباین ہے اس کا اندازہ کچھ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ	اے ایمان والو! جب تمہارا دشمن سے سامنا
فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا	ہو تو ثابت قدم رہو اور اس موقع پر اللہ کو
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (الانفال۔۴۵)	زیادہ سے زیادہ یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔

صحابۂ کرام بیان کرتے ہیں کہ جب کوئی پریشان کن امر پیش آتا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فوراً نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے، بدر کے معرکہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صفیں برابر کیں، اور عریش میں تشریف لا کر اللہ سے مناجات اور گریہ وزاری شروع کر دی، آپ فرماتے جاتے تھے کہ:

"اے اللہ اگر یہ جماعت آج ہلاک ہو گئی تو تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہ جائے گا۔"

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

مغربی مزاج ایک مشرقی کی نظر میں

پس مادیت طبعی تاریخی اور علمی اسباب کی بنا پر تاریخ کے قدیم ترین عہد سے مغربی تہذیب اور مغربی زندگی کی روح اور اس کا مزاج بن گئی ہے، مغرب کے اس امتیاز کی طرف مغرب و مشرق کے متعدد علماء نے توجہ دلائی ہے، علماء مشرق میں سے صاحبِ نظر اور صاحبِ فراست سیاح عبدالرحمٰن کواکبی (م ۱۳۲۰ھ) نے اس صدی کی ابتدا میں اپنی کتاب "طبائع الاستبداد" میں اس حقیقت کا ذکر کیا ہے:۔

"مغربی اپنی زندگی میں مادہ پرست، طبیعت کا مضبوط اور معاملہ کا سخت ہوتا ہے، اس کی طبیعت خود غرض، کینہ ور اور انتقامی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بلند اصولی

اور شریفانہ جذبات میں سے اب اس کے پاس کچھ باقی نہیں رہا، جو مشرق کی مسیحیت نے اس کو عطا کئے تھے' ایک جرمن ہی کو لو، مزاج کا خشک' اور طبیعت کا اکھڑ، اس کے نزدیک ایک کمزور انسان زندہ رہنے کا مستحق ہی نہیں' اس کے نزدیک ہر قسم کی برتری قوت ہی میں پائی جاتی ہے اور قوتوں کا مرکز مال ہے' وہ علم کا ضرور قدردان ہے' لیکن مال ہی کے خاطر، وہ عزت کا بھی شائق ہے لیکن مال ہی کی غرض سے' لاطینی اور اطالوی کی فطرت میں خود پسندی اور رشک عقلی ہے' اس کے نزدیک عقل نام ہے آزادی اور بے قیدی کا، زندگی کہتے ہیں بے حیائی کو، عزت نام ہے زینت ولباس اور لوگوں پر غالب آجانے کا!"

مغربی فطرت ونفسیات کی یہ صحیح تفسیر وتحلیل ہے' مرحوم کواکبی نے ان دونوں قوموں کو محض نمونے کے طور پر انتخاب کیا، ورنہ جزئی' قومی خصائص کے علاوہ مادہ پرستی' دولت کے عشق، خودغرضی اور معاملہ کی شدت میں مغرب کی ساری قومیں شریک ہیں۔

روحانیت میں مادّیت

یہ مادہ پرستانہ روح یورپ کے تمام سیاسی اجتماعی اور اخلاقی قدیم وجدید نظامات میں جاری وساری نظر آئے گی حتیٰ کہ اس روحانی تحریک کی جس سے یورپ کو بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے' روح بھی مادیت ہی ہے' وہ بھی دوسری صنعتوں اور فنوں کی طرح ایک سائنس اور آرٹ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عالمِ روحانیت کے عجائبات کی سیر کی جائے اس کے اسرار معلوم کئے جائیں، مُردوں کی روحوں سے بات چیت کی جائے اور تفریح وتسکینِ نفس کا سامان بہم پہونچایا جائے، مشرق کی اسلامی روحانیت وتصوف کے برخلاف اس کو تزکیۂ نفس، اصلاحِ قلب، خشیتِ الٰہی، عملِ صالح، مجاہدۂ نفس

اور موت کے بعد کی زندگی اور اس کی تیاری سے کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح سے وہ کام جس میں یورپ میں لوگ اپنی جانیں دیتے ہیں محض مادی اغراض کے لئے ہوتے ہیں، اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو کسی نہ کسی مادی غرض و غایت پر وہ مبنی اور منتہی ہوتے ہیں، مثلاً شہرت، تاریخ میں ذکر، جذبۂ مسابقت، قومی و وطنی اعزاز و فخر، ان میں کہیں خدا کی رضا مطلوب نہیں ہوتی، اس کے برخلاف مسلمان ہر کام میں خدا کی خوشنودی کا طالب ہوتا ہے اور خالص اس کی رضا کے لئے عمل کرنا چاہتا ہے جو چیزیں مغرب میں عین مقصود ہیں وہ یہاں قابلِ احتراز اور لائق اجتناب ہیں جو چیز مغرب میں فخر و ناز کی ہے مسلمان کے لئے ننگ و عار ہے۔ ع

انچہ فخر تست آں ننگ من است

قرآن مجید کی آیت ہے:۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا	کہو ہم تمہیں خبر دیں کون لوگ اپنے کاموں
الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ	میں سب سے زیادہ نامراد ہوئے وہ جن کی ساری
الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ	کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں اور وہ
صُنْعًا أُولٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِاٰيٰتِ	اس دھوکہ میں پڑے ہیں کہ وہ خوب کام انجام دے
رَبِّهِمْ وَلِقَائِهٖ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ	رہے ہیں وہی ہیں جو اپنے پروردگار کی آیتوں سے
فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا	اور اس کے حضور میں حاضر ہونے سے منکر ہوئے
(الکہف۔۱۰۳۔۱۰۵)	پس ان کے سارے کام اکارت گئے اور اس لئے
	قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن تسلیم
	نہ کریں گے۔
وَقَدِمْنَا إِلٰى مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ	اور دنیا میں جو یہ لوگ عمل کر گئے ہیں ان کا

فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ٥ طرف ہم متوجہ ہوں گے اور ان کو اس طرح رائیگاں
(الفرقان - ۲۳) کردیں گے جیسے بکھری ہوئی دھول۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص بہادری کی بنا پر لڑتا ہے ایک شخص غیرت و جوش میں آکر، اور ایک شخص لوگوں کو دکھانے کے لئے، ان میں سے کون سا اللہ کے راستہ میں شمار ہوگا، آپؐ نے فرمایا صرف وہ جنگ جو اس غرض سے کی جائے کہ اللہ کی بات اونچی ہو وہی فی سبیل اللہ ہے۔ اس اصول و حقیقت کے جو لوگ قائل تھے ان کو اپنے کاموں اور نیکیوں کے چھپانے کا بڑا اہتمام رہتا تھا اور اس پر بھی ہر وقت ریا کا کھٹکا لگا رہتا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک خاص دعا کے الفاظ ہیں اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ عَمَلِی كُلَّهٗ صَالِحًا وَّاجْعَلْهُ كُلَّهٗ لِوَجْهِكَ خَالِصًا وَّلَا تَجْعَلْ لِغَيْرِكَ فِيْهِ شَيْئًا" یعنی اے اللہ میرے تمام اعمال کو صالح بنا اور ان کو خالص اپنی ذات ہی کے لئے رکھ اور اپنے سوا کسی کا اس میں حصہ نہ بنا۔

اقتصادی وحدۃ الوجود

مادّی نقطۂ نظر اور مادی طریق فکر یورپ میں استغراق و فنا کے ایسے درجہ کو پہونچ گیا ہے کہ مغربی اشخاص اور اہل فکر ماسوا کو بالکل بھول گئے، فلسفۂ اشتراکیت کا امام کارل مارکس (KARLMARX) (۱۸۱۸ - ۱۸۸۳ء) اس مادی استغراق اور فنا کی بہترین مثال ہے اس کے نزدیک پوری انسانی تاریخ (سوائے اس زمانہ کے جب زندگی عالم طفولیت میں تھی) معاشرتی طبقوں کی باہمی جنگ کی داستان ہے، وہ اقتصادی پہلو کے علاوہ انسانی زندگی کے تمام دوسرے پہلوؤں کی اہمیت اور اثر کا منکر ہے وہ دین، اخلاق، روح، قلب حتیٰ کہ عقل کو کوئی وزن نہیں دیتا اور اس کے نزدیک ان میں سے کسی کو بھی انسان کی تاریخ میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں تاریخ کی تمام جنگیں بغاوتیں

وانقلابات محض ایک انتقام تھا، جو چھوٹا اور خالی پیٹ ایک بڑے اور بھرے ہوئے پیٹ سے لینا چاہتا تھا، وہ محض ایک جدّ وجہد تھی، جو اقتصادی نظام کی تشکیل جدید اور صنعتی پیداوار کے طریقوں کی تنظیم جدید کے سلسلہ میں پیش آئی، اور اس بنا پر یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ مذہبی جنگیں بھی اس کے نزدیک اقتصادی طبقات کی باہمی کش مکش کا نتیجہ تھیں ایک جماعت دولت کے ذرائع اور پیداوار کے طریقوں پر قابض ہوگئی تھی، اور دوسری اس میں شرکت کرنا اور اپنا واجبی حصہ لینا چاہتی تھی یا ان کی از سرِ نو تشکیل و تنظیم کرنا چاہتی تھی، پہلی جماعت کے مدافعت کرنے پر وہ جنگیں، شورشیں اور انقلاب واقع ہوئے جن کو تاریخ مختلف ناموں سے یاد کرتی ہے، یہ یک طرفہ فلسفہ کسی مذہبی جہاد، کسی دینی اصلاح، کسی روحانی جدّ وجہد کو اس کلیہ سے مستثنیٰ کرنے کے لئے تیار نہیں، یہ ہے مغرب کا مادّی تصوّف اور یورپ کا اقتصادی فلسفۂ وحدۃ الوجود۔

یورپ کا نعرہ "لاموجود إلّا البطن والمعدۃ"

چونکہ مشرقیوں پر روحانیت اور خدا شناسی اور خدا طلبی کا غلبہ تھا، اس لئے اس سلسلہ میں جن لوگوں پر استغراق طاری ہوا اور مغلوب الحال ہوئے انھوں نے اللہ کے سوا ہر شئے کے وجود کی نفی کی اور غلبۂ حال میں "لاموجود الّا اللہ" کا نعرہ بلند کیا، یورپ کے مفکرین پر چونکہ مادیت کا غلبہ تھا، اور اس میں ان کو درجۂ استغراق و فنا حاصل تھا، اس لئے اپنے غلبۂ حال میں انھوں نے اقتصادی پہلو کے علاوہ ہر چیز کی نفی کی اور "لاموجود الّا البطن والمعدۃ" کی آواز بلند کی، مشرق کے صوفی انسان کو سایۂ ربّانی سمجھتے تھے، اور بعض مغلوب الحال "أنا الحق" پکار اٹھتے تھے، مغرب کے مادہ (یا معدہ) پرست، انسان کو صرف ایک وجود حیوانی سمجھتے ہیں، اور آج ہر طرف سے "أنا الحیوان" کی صدائیں آرہی ہیں۔

ڈارون کے نظریۂ ارتقا کا اثر

یہ محض خیال آرائی نہیں ہے انیسویں صدی عیسوی سے یورپ میں ایسے نظریات اور علمی تحقیقات پیش آئے جن سے انسان اور اس کے مسائل زندگی کے متعلق حیوانی نقطۂ نگاہ کی تائید اور تقویت ہوئی ڈارون نے ۱۸۵۹ء میں اپنی کتاب اصل الانواع (ORIGIN OF SPECIES) میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انسان دراصل ایک ترقی یافتہ جانور ہے جو اپنے ہزاروں سال کے نوعی سفر میں منزل بمنزل درجہ بدرجہ (AMOEBA) سے بندر اور بندر سے انسانی شکل کو پہونچا' اس کتاب نے سارے یورپ کو اپنی طرف متوجہ کرلیا اور وقت کا سب سے بڑا موضوع بحث اور موضوع سخن بن گیا، اس نظریۂ ارتقا نے انسانی مسائل پر غور کرنے کا رُخ بدل دیا، اور حیوانات کی تاریخ نشأ وارتقا اور ان کے عادات واطوار وخصائص سے خاص دلچسپی پیدا کردی، اس نظریہ نے یہ اعتقاد پیدا کردیا کہ کائنات بغیر کسی غیر طبیعی طاقت کی مداخلت کے چل رہی ہے اور طبیعی قوانین کے علاوہ اس کی کوئی عِلّت نہیں۔

مبادی اور نتائج اور ذہنی واخلاقی' اور عملی اثرات میں یہ نظریہ دین سے تناقض رکھتا ہے بلکہ یہ ایک مستقل دین ہے' جو کسی اور دین کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا، اہل مذہب کی مخالفت اور ان کے خطرات اس بارہ میں حق بجانب تھے' پروفیسر جوڈ لکھتا ہے :-

"اس پریشانی اور استعجاب کا اندازہ لگانا ہمارے لئے اس وقت مشکل ہے جو ہمارے اسلاف کو ڈارون کی کتاب کے شائع ہونے پر پیش آیا، ان شہادتوں سے جن پر اس کے نتائجِ تحقیق مبنی تھے' ڈارون نے ثابت کیا (یا خیال کیا جاتا ہے کہ ثابت کیا) کہ کرۂ ارض پر زندگی کا ارتقا امیبا AMOEBA اور جیلی فش (JELLYFISH) کے ابتدائی ظہور سے

اس کی انتہائی شکلوں تک مسلسل رہا ہے، ہم زندگی کے ترقی یافتہ ترین اور آخری شکل ہیں۔
اس کے برعکس وکٹوریہ کے زمانہ کے لوگوں کو بتایا گیا تھا کہ انسان بجائے خود ایک خاص مخلوق ہے اور اس نے درحقیقت فرشتہ کے درجہ سے تنزل کیا ہے لیکن ڈاروِن کے نزدیک انسان ایک ترقی یافتہ بندر ہے اس زمانہ کے لوگوں کو یہ بڑا شاق گزرا کہ انسان ایک زوال پذیر فرشتہ کے بجائے ایک ترقی یافتہ بندر ثابت ہو، ان کو یہ نظریہ بالکل پسند نہیں آیا اور انھوں نے انسان کو اس مخمصے سے نجات دینے اور اس عار کو دور کرنے کی مختلف کوششیں کیں۔[1]

علمی اور تحقیقی طور پر مختلف نقائص اور خلا موجود ہونے کے باوجود عوام اور لوگوں کی اکثریت نے سمجھے اور بے سمجھے اس نظریہ کو قبول کر لیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذہن پہلے سے اس کے لئے تیار تھے، لوگوں کو اس میں ایک خوبی یہ بھی نظر آئی کہ وہ مذہب اور اہلِ مذہب کا حریف تھا، اہلِ مذہب کے لئے خیالات اور ذوق کے اس بہتے ہوئے دھارے اور رسائل و مطبوعات کے اس سیلاب کا مقابلہ ناممکن ہو گیا اور بالآخر کلیسا نے اس جنگ میں ہتھیار ڈال دیئے۔

خیالات، تہذیب، ادب، سیاست، غرض زندگی کے تمام شعبوں میں اس نظریہ نے بڑا گہرا اور وسیع اثر ڈالا عہدِ فطرت کی طرف بازگشت کا خیال عریانی کا ذوق اور بہت سے اعمال و اخلاق اسی خیال کا نتیجہ ہیں کہ انسان دراصل ایک ترقی یافتہ بندر ہے اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ بقول مسٹر شیپرڈ "انگلستان میں ایک نئی نسل پیدا ہو رہی ہے جو انسانوں کی خانگی زندگی کے مفہوم ہی سے ناآشنا ہے، وہ صرف حیوانات کے گلہ کی زندگی ہی سے واقف ہے۔"

وطنیت و قومیت کا نشو و نما

اوپر گزر چکا ہے کہ وطنیت و قومیت کا جذبہ، قومی فخر، اور جغرافیائی تقسیم کا زیادہ لحاظ

---

[1] (GUIDE TO MODREN WICKEDNESS) P. 235-36

مغربی فطرت کا خاصہ ہے جو مغربی نسل میں برابر منتقل ہوتا رہا ہے مسیحیت جب یورپ میں پہنچی تو اگرچہ وہ اپنی اصل شکل میں نہ تھی' اور اس میں کمزوری پیدا ہو چکی تھی لیکن اس میں بہرحال حضرت مسیح کی تعلیمات کا اثر اور آسمانی مذاہب کی خصوصیات تھیں' مذہب خواہ کتنا بگڑ جائے' نسل و وطن کی بنا پر انسانوں کے درمیان تفریق کا قائل نہیں ہو سکتا، اس لئے اس نے یورپ کی منتشر قوموں کو رومی کلیسا کے ماتحت دین کے جھنڈے کے نیچے جمع کر دیا اور عیسوی دنیا کو ایک خاندان بنا دیا تاریخ اخلاقیات کے مصنف کے بقول حب وطن اور قومی عصبیت عام خلائق دوستی میں منتقل ہو گئی' اور اس ذہنی تبدیلی کا اندازہ مسیحی علماء کے اقوال سے ہوتا ہے مثلاً ٹرٹولین کہتا ہے کہ ہم ایک جمہوریت کو جانتے ہیں' اور وہ عالم ہے' اور ریجن کہتا ہے کہ ہمارا ایک وطن ہے جس کی بنا لفظ خدا سے پڑی ہے۔

لیکن جب لوتھر (MARTIN LUTHER) (۱۴۸۳ء، ۱۵۴۶ء) نے اپنی مشہور دینی اصلاحی تحریک کا علم بلند کیا اور رومی کلیسا کی مخالفت میں جرمن قوم سے مدد ملی اور بالآخر رومی کلیسا کو اس مقابلہ میں شکست ہوئی' تو قومیں جس ہار میں گندھی ہوئی تھیں اس کی لڑی ٹوٹ گئی اور وہ منتشر و متفرق ہو گئیں' وہ روز بروز اندرونی طور پر خود مختار ہوتی گئیں' یورپ میں مسیحیت کے زوال کے ساتھ ساتھ قومیت و وطنیت کا عروج ہوتا گیا گویا کہ دین و مذہب اور قومیت و وطنیت ترازو کے دو پلڑے تھے کہ جس قدر ایک نیچا ہوتا تھا، اسی قدر دوسرا اونچا ہوتا تھا اور یہ معلوم ہی ہے کہ دین کا پلڑا ہلکا ہی ہوتا چلا گیا، اس لئے اس کے حریف یعنی قومیت و وطنیت کا پلڑا بھاری ہوتا گیا۔ مشہور انگریز فاضل لارڈ لوتھین (LORD LOTHIAN) نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"جب لوتھر کی تحریک نے (جس کو دینی اصلاح کی تحریک کہا جاتا ہے) یورپ کی

ثقافتی (کلچرل) اور دینی وحدت کا خاتمہ کر دیا تو برِ اعظم مختلف قومی حکومتوں میں منقسم ہو گیا جن کے جھگڑے اور مقابلے دنیا کے امن کے لئے ایک دائمی اور مستقل خطرہ بن گئے۔"

دینی انحطاط اور دینی اصول و اخلاق کے زوال کی وجہ سے قومیت اور وطنیت کے طرزِ خیال کو جو فروغ ہوا اس کی طرف بھی فاضل موصوف نے متوجہ کیا ہے:-

"دین جو انسان کا ضروری رہنما، اخلاقی مقصد کے حصول اور انسانی زندگی کی عزت اور معنویت کا واحد ذریعہ ہے اس کے اقتدار کے زوال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی دنیا ایسے سیاسی مذاہب و خیالات کی گرویدہ ہو گئی جن کی بنیاد نسل اور طبقات کے اختلاف پر ہے علوم طبعی کے اثر سے اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ مادی ترقی ہی اعلیٰ مقصد ہے اس وجہ سے زندگی کی مشکلات اور اس کی الجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ یورپ کے لئے اپنی روح اور زندگی کے درمیان ایسی تطبیق دینا مشکل ہو گیا جو اس کو اس عصر کی سب سے بڑی مصیبت قومیت سے نجات دے سکے۔"

مغرب کا تکبّر اور مشرق کے خلاف تعصّب

مذہبی نظام کی شکست اور جذبۂ قومیت کے فروغ کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ پورا یورپ پورے مشرق کے مقابلہ میں ایک حریف کیمپ بن گیا اس نے مغرب و مشرق آرین نسل اور دوسری نسلوں کے درمیان ایک خطِ فاصل کھینچ لیا اور یہ طے کر لیا کہ اس خط کے اندر جتنی قومیں، تہذیبیں اور علم و ادب واقع ہیں ان کو دنیا کی تمام قوموں، تہذیبوں اور علم و ادب پر برتری اور فوقیت حاصل ہے ان کو حکومت کرنا، باقی رہنا اور پھولنا پھلنا چاہیئے اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کو مغلوب و محکوم رہنا چاہیئے اور زندگی و ترقی کا کوئی حق نہیں بعینہٖ یہی طرزِ خیال اپنے زمانہ میں یونانیوں اور

رومیوں کا تھا، وہ دنیا میں صرف اپنے کو مہذب شمار کرتے تھے اور باہر کی ہر چیز کو خصوصاً جو چیز بحر اٹلانٹک کے مشرق میں واقع ہو بربری کے نام سے پکارتے تھے۔

قومیت کی حد بندیاں

یورپ کی قوموں اور سلطنتوں نے اپنے کو ایک مستقل دنیا فرض کر لیا ہے قدرت نے پہاڑوں اور دریاؤں کے جو طبعی حدود قائم کر دیئے ہیں اور خود انھوں نے اپنے گرد سیاسی مقصد اور استعمار کے جو چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچ لئے ہیں ان کے نزدیک ان کے باہر دنیا اور انسان کا وجود نہیں پایا جاتا ان کو ان گھروندوں کے باہر کسی چیز کا احترام اور قدر نہیں انھوں نے خود اپنے کو ایک مستقل معبود بنا لیا ہے اور عبادت و تقدیس کا جتنا تعلق عبد و معبود کے درمیان ہونا چاہئے انھوں نے اس خود ساختہ معبود کے ساتھ قائم کر لیا، اسی کے لئے ان کی قربانیاں ہیں اسی کے راستہ میں جنگ ہے اسی کی خاطر جینا اور مرنا ہے اس پر چڑھاوے کے لئے بے تکلف صدہا انسانوں کا خون بہایا جاتا ہے اس دین قومیت کا عقیدۂ اولین یہ ہے کہ قوم ہر چیز پر مقدم اور ہر چیز سے بالا و برتر ہے اس قوم سے افضل، زیادہ شریف، زیادہ ذکی، زیادہ طاقتور، حکومت و سیادت، قوموں کی نگرانی و اتالیقی اور دنیا کی حفاظت کی اہل سطح زمین پر کوئی دوسری قوم نہیں پائی جاتی اس کے دریاؤں کا پانی امرت اس کی مٹی سونا، اور اس کے کانٹے پھول ہیں یہ دین قومیت کسی انسان کو کسی ملک میں رہنے کی اس وقت تک اجازت نہیں دیتا جب تک وہ اس پر ایمان نہ لائے۔

قوم پرستی کا تخم ایک ہی طرح کے برگ و بار لاتا ہے یہ ممکن نہیں کہ کوئی قوم قوم پرستی پر ایمان رکھتی ہو اور دست درازی نہ کرتی ہو یا نہ کرنا چاہتی ہو اور اپنے سوا دوسروں کی تحقیر و تنقیص سے پاک ہو جیسے کہ یہ ممکن نہیں کہ انسان شراب کے جام پر جام چڑھائے اور نہ وہ بہکے نہ اسے نشہ آئے ۔

در میان قعر دریا تختہ بندم کردۂ
بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

خصوصاً جب کہ علم، ادب، شعر، فلسفہ، تاریخ، یہاں تک کہ علوم طبعیہ اس نشۂ قومیت کو اور تیز اور اس شراب کو دو آتشہ بناتے رہتے ہیں اور ہر طرح سے قوم میں نسلی غرور و تعلّی اور اپنے ماضی پر فخر و تکبر کی پرورش ہوتی رہتی ہے اور کسی قسم کی اخلاقی اور مذہبی رکاوٹ نہیں ہوتی اور رہنمائی ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، جو قومی شوکت و عظمت کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتے۔

قوم پرستی کے عناصر نفرت اور خوف

نفرت اور خوف قوم پرستانہ زندگی کے ضروری عناصر ہیں جن کے بغیر اس میں جان نہیں آتی، قوم پرستی کا جوش اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا اور اگر پیدا ہو جائے تو باقی نہیں رہتا جب تک کہ قوم کے لئے کوئی چیز نفرت کرنے کے لئے اور کچھ ڈرنے کے لئے نہ ہو، چنانچہ قومی رہنما نفرت اور خوف کے ذریعہ سے اس کے جذبات برانگیختہ کرتے رہتے ہیں اور اس کی اس دکھتی رگ کو دبا کر اس میں ہیجان واشتعال اور جوش و خروش پیدا کر دیتے ہیں، وہ نفرت اور خوف کی آگ بجھنے نہیں دیتے بلکہ رائی کا پہاڑ بنا کر چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بڑھا کر اور کسی نہ کسی حقیقی یا فرضی حریف کو سامنے لا کر قوم کے جذبۂ نفرت و خوف کو زندہ اور متحرک رکھتے ہیں، اور اسی میں اپنی حکومت یا قیادت کی زندگی اور اپنی بقا سمجھتے ہیں، پروفیسر جوڈ نے اس کی جو فلسفیانہ اور نفسیاتی تحلیل و توجیہ کی ہے ــــ وہ حسب ذیل ہے:۔

"وہ مشترک جذبات جن کو آسانی سے برانگیختہ کیا جا سکتا ہے اور جو جمہور کی بڑی بڑی جماعتوں کو حرکت میں لا سکتے ہیں وہ رحم، فیاضی اور محبت کے جذبات نہیں بلکہ نفرت اور خوف کے جذبات ہیں، جو لوگ کسی قوم پر کسی مقصد کے لئے حکمرانی کرنا چاہتے ہیں،

وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک اس کے لئے کوئی ایسی چیز تلاش نہ کرلیں جس سے وہ نفرت کرے، اور اس کے لئے کوئی ایسی شخصیت یا قوم نہ پیدا کرلیں جس سے وہ ڈرے، میں بھی اگر قوموں کو متحد کرنا چاہوں تو مجھے چاہئے کہ میں ان کے لئے کسی اور سیارہ پر کوئی دشمن ایجاد کروں، مثلاً چاند پر جس سے یہ سب قومیں ڈریں، اس بنا پر قطعاً حیرت کی بات نہیں کہ اس زمانہ کی قومی حکومتیں اپنی ہمسایہ قوموں کے ساتھ معاملہ کرنے میں نفرت اور خوف ہی کے جذبات کے زیر اثر ہیں انھیں جذبات پر ان سلطنتوں پر حکمرانی کرنے والوں کی زندگی موقوف ہے، اور انھیں جذبات پر قومی اتحاد کی بنیاد ہے[1]۔"

واقعہ یہ ہے کہ خالص قوم پرستانہ ذہن اور اس کا طریقۂ کار (TECHNIQUE) یہی ہے کہ نفرت اور خوف کو قائم رکھا جائے، انھیں دو جذبات پر گزشتہ و موجودہ قوم پرست حکومتوں کی بنیاد رہی ہے، اور انھیں دونوں جذبات نے اُن بڑی بڑی جنگوں کو پیدا کیا ہے جن کی داستان تاریخ میں نظر آتی ہے، اور جن کے آثار دنیا میں ابھی موجود ہیں، اسلام اس قوم پرستی کو (جو اپنی قوم کی جا و بے جا پاسداری اور دوسروں سے نفرت اور خوف کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی اور جس میں اصول و صداقت کا سوال نہیں) "عصبیت" اور "حمیتِ جاہلیت" قرار دیتا ہے اور ہر ایسی امداد و حمایت و جوش و حمیت اور جنگ و جدال کو حرام قرار دیتا ہے جس کی بنیاد محض قومی یا جماعتی عصبیت پر ہو، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف ارشاد فرمایا:۔

لیس منا من دعا الی عصبیۃ،	وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو کسی جتھہ بندی
ولیس منا من قاتل علی عصبیۃ	کی دعوت دے، وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے
ولیس منا من مات علی عصبیۃ[2]	جو کسی جتھہ بندی اور پاسداری کے لئے

---

[1] GUIDE TO MODERN WICKEDNESS P. 150-51

[2] ابوداؤد۔

جنگ کرے، وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے

جو جتھہ بندی کی حالت میں مرے۔

جو شخص اس قوم پرستی اور جاہلی عصبیت کی جنگ میں مارا جائے اس کی موت "جاہلی" (غیر اسلامی) قرار دی گئی ہے، اور ایک حدیث میں اس کو امت سے خارج تبلایا گیا ہے:۔

من قاتل تحت رأیۃ عمیۃ یغضب بعصبیۃ او یدعوا الیٰ عصبیۃ او ینصر عصبیۃ فقتل فقتلتہ جاھلیۃ۔[1]	جو شخص کسی اندھا دھند جھنڈے کے نیچے کسی جتھہ بندی کے جوش حمایت میں یا کسی جتھہ بندی کی دعوت میں یا کسی جتھہ بندی کی امداد میں جنگ کرے گا اور مارا جائے گا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔
ومن قتل تحت رأیۃ عمیۃ یغضب للعصبیۃ ویقاتل للعصبیۃ فلیس من أمتی۔[2]	جو کسی ادھا دھند جھنڈے کے نیچے کسی پاسداری کے جوش میں یا پاسداری کی جنگ میں مارا جائے گا تو وہ میری امت میں سے نہیں ہے۔

اسلام نے عالم انسانی کو دو ہی حصوں میں تقسیم کیا ہے خدا کے پیرو اور حق کے حامی شیطان کے پیرو اور باطل کے حامی، اس نے صرف شیطان کے پیرؤوں، باطل کے حامیوں زمین میں فساد کرنے والوں اور ظلم و سرکشی اور فسق و فجور پھیلانے والوں سے نفرت رکھنے اور ان کے خلاف جنگ کرنے کا حکم دیا ہے خواہ وہ کسی نسل اور وطن سے تعلق رکھتے ہوں، نفرت اور جنگ کے لئے اس کے یہاں تقسیم قومی و نسلی بنیادوں اور ملکوں اور شہروں کے حدود پر نہیں ہے بلکہ اصول عقائد و اعمال اور خدا سے وفاداری اور بغاوت اور انسانیت کے لئے نفع و مضرت کی بنیاد پر ہے۔

---

[1] مسلم ونسائی [2] مسلم

قومی عظمت وتکبّر

قوم پرستوں کا قاعدہ ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی کمزور قوموں میں بھی قوم پرستی کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں اس کے ادب زبان اور تہذیب کے حق میں قصیدہ خوانی اور اس کے عہد ماضی کی عظمت وشوکت میں مبالغہ آرائی کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ قومیں قوم پرستی کے جذبات سے مغلوب اور نشۂ قومیت سے سرشار ہو جاتی ہیں ان میں اپنے اوپر غلط اعتماد اور فخر وتکبر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ بیرونی دنیا سے قطع تعلق کرکے قومیت کے چھوٹے چھوٹے دائروں میں محدود ومحصور ہو جاتی ہیں ان کو کسی بین الاقوامی طاقت کسی عالمگیر رشتہ کی پروا نہیں ہوتی اور وہ اپنے وسائل اور طاقت پر پورا اعتماد کرتی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ چند گھنٹوں میں کسی بڑی طاقت کا لقمہ بن جاتی ہیں اور دنیا دور سے اس کا تماشہ دیکھتی رہتی ہے اور سوائے زبانی ہمدردی کے ان کو وقت پر کوئی مدد نہیں ملتی، قومیت کے حصار کو قائم کرکے اور اپنے کو دنیا سے علحدہ اور ممتاز قرار دے کر وہ گویا بڑی طاقتوں کو شکار کی دعوت دیتی ہیں، وسط یورپ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا اس جنگ میں جو کچھ انجام ہوا وہ دنیا کو معلوم ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ اسلامی ممالک جو عالمگیر دعوت وتحریک رکھتے ہیں اور جن کے پاس ایسی طاقت ہے جو (اگر ان میں اس سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ہو) یورپ کے قومی ووطنی اور سیاسی فلسفوں اور دعوتوں سے زیادہ طاقتور وسیع اور عمومی دعوت وتحریک ہے ان کا رجحان بھی محدود قومیتوں کی طرف ہے حالانکہ وہ اپنے وسائل، سامان جنگ اور تعداد کے لحاظ سے یورپ کی ریاستوں سے کچھ زیادہ بہتر حالت میں نہیں ہیں اس لئے یہ توقع کرنا خوش فہمی سے خالی نہ ہوگا کہ وہ اپنے ان محدود وسائل اور قومیت ووطنیت کے حدود کے اندر کسی خطرہ کا زیادہ دنوں تک مقابلہ

کر سکیں گے۔

قوم پرست حکومتوں کا معیارِ عزت و عظمت

قوم پرست حکومتوں کا معیارِ عزت و عظمت یہ ہے کہ زمین کے بڑے بڑے رقبہ پر ان کا تسلّط و اقتدار ہو، ملک کے حدود وسیع اور ذرائع آمدنی وافر ہوں، اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کرنے اور ہمسایہ قوموں یا حریف سلطنتوں کو خوف زدہ کرنے کا ان کے پاس پورا سامان ہو، ملک کے افراد میں قومی برتری، نسلی تفوّق، اپنی قدیم تہذیب اور ادب و زبان اور تاریخ ماضی پر فخر و مباہات کا جذبہ پایا جاتا ہو اور دوسری معاصر قوموں کی کمزوری اور تہذیبی و ادبی بے مائیگی پر ایمان راسخ ہو، وہ ملک و سلطنت کی عزت و عظمت کی خاطر بڑے بڑے مجرمانہ و وحشیانہ اعمال کا بے تکلف ارتکاب کر سکتے ہوں، اور اپنی قوم اور اس کے افراد کو حقیر سے حقیر فائدہ پہونچانے کے لئے بڑی سے بڑی حق تلفی اور ناانصافی میں ان کو باک نہ ہو ایسی حکومت کا اخلاقی معیار خواہ کتنا پست ہو اس کے شہری، اخلاقی شعور، انسانیت کے احترام اصول کی پابندی سے خواہ کتنے ہی بیگانہ ہوں، اور وہ حکومت اور اس کے ذمہ دار اخلاقی حدود و قیود سے کتنے ہی آزاد ہوں وہ حکومت عزت و عظمت کے بلند معیار پر فائز اور دنیا کی ایک خاص قابلِ احترام اور لائق تقدیس حکومت ہے، پروفیسر جوڈ نے صحیح لکھا ہے کہ:۔

"قومی عظمت کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ قوم کے پاس ایسی طاقت ہو جس سے وہ بوقت ضرورت اپنی خواہش و ارادہ کو دوسروں پر مسلط کر سکے، یہ قومی عظمت ان قوموں کے نزدیک آئیڈیل کا درجہ رکھتی ہے، اس کی نامعقولیت اسی سے ظاہر ہے کہ یہ معیار اخلاقی صفات کے بالکل ضد ہے اگر کوئی ملک ایسا ہے جو صرف سچ ہی بولتا ہے،

وعدے وفا کرتا ہے' اور کمزوروں کے ساتھ انسانیت کا سلوک کرتا ہے تو ان قوموں کے نزدیک اس کی عزت کی سطح پست ہے مسٹر بلیڈون کے بقول عزت نام ہے اس قوت کا جس سے قوم خاص شرف واعتبار کی مالک ہو اور نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرے اور ظاہر ہے کہ ایسی قوت جس سے قوم کو ایسا اعزاز وامتیاز حاصل ہو موقوف ہے آتش فشاں گولوں اور بموں پر' ان نوجوانوں کی وفاداری اور وطن دوستی پر جن کا شہروں پر ان گولوں اور بموں کو پھینکنا محبوب شغلہ ہے پس جس عزت کے لئے کسی قوم کی تعریف کی جاتی ہے' وہ ان صفات واخلاق کے بالکل ضد واقع ہوئی ہے جن کی بنیاد پر فرد کی تعریف کی جاتی ہے' میرے نزدیک تو قوم کو اسی قدر وحشی اور غیر مہذب سمجھنا چاہئے جس قدر وہ ایسی عزت کی مالک ہو' فریب دہی' دغا بازی اور ظلم سے عزت حاصل کرنا کسی انسان اور قوم کے لئے قطعاً باعث عزت نہیں ہے۔"[1]

ہدایت یا تجارت

لادینی حکومتیں دراصل ایک ترقی یافتہ منظم اور محفوظ تجارتی ادارے ہیں' یہ حکومتیں بنیادی و اصولی طور پر نفع پہونچانے کے لئے نہیں بلکہ نفع اٹھانے کے لئے قائم ہوتی ہیں' وہ سرے سے کوئی اخلاقی پیغام اور اصلاحی مقصد نہیں رکھتیں' نہ ان کے پیش نظر ملک یا قوم کی اخلاقی و روحانی ترقی' انسانوں کی ہدایت اور انسانیت کی حقیقی خدمت و بہبود ہوتی ہے' قدرتی طور پر ان کی اصل توجہ آمدنی کے ابواب' نفع اٹھانے کی تدابیر اور سرکاری محاصل و مطالبات کی طرف ہوتی ہے' اس غرض کے لئے وہ بے تکلف اخلاق و شرافت کے اصول کو نظر انداز کر دیتی اور

---

[1] GUIDE TO MODERN WICKEDNESS PP. 152-53

اخلاقی تعلیمات و مصالح کو پس پشت ڈال دیتی ہیں' جہاں کہیں اخلاقیات و مالیات کا تصادم ہوتا ہے' وہاں وہ ہمیشہ مالیات کو ترجیح دیتی ہیں' ہر مسئلہ میں ان کا نقطۂ نظر معاشی و اقتصادی ہوتا ہے' اس طرز کی حکومتیں بداخلاقی و بے حیائی کی بہت سی قسموں کو کچھ قانونی قیود کے ساتھ (جو جرائم کا سدباب نہیں کرتی بلکہ ان کو صرف نظم و ضابطہ میں لے آتے ہیں) جائز قرار دیتی ہیں' عصمت فروشی کا پیشہ ان کی حکومت میں قانوناً جائز ہوتا ہے' وہ خود وسیع پیمانہ پر اور منظم طریقہ پر سودی کاروبار کرتی ہیں' مہذّب ناموں سے جوے کی اجازت ہوتی ہے' ناموں کی تبدیلی اور بعض ایسے قیود کے ساتھ جو حکومت کے مفاد کو محفوظ رکھتے ہیں' بہت سے اخلاقی جرائم جائز ہوتے ہیں' شراب کی نہ صرف اجازت ہوتی ہے بلکہ حکومت بعض اوقات اس کی تجارت اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے' اور اس کے خلاف جدّوجہد کرنے والے کو سزا دیتی ہے' سینما اور فلم سازی کی صنعت جو اپنی موجودہ روح اور شکل میں اُمّ الجرائم اور قوم میں بداخلاقی کا رجحان اور شہوانی میلان پیدا کرنے کی سب سے بڑھ کر ذمہ دار ہے' حکومت کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ سمجھی جاتی ہے' اور اس کے اخلاقی نقصانات کو جانتے اور دیکھتے ہوئے بھی حکومت اس کو روک نہیں سکتی' ریڈیو کا سرکاری محکمہ قوم کی اخلاقی رہنمائی اور تربیت کے بجائے داروغۂ ارباب نشاط کی خدمت انجام دیتا ہے' اور قوم میں سنجیدگی اور صحیح ذوق پیدا کرنے کے بجائے اس کے فاسد ذوق اور سطحی رجحانات کا ساتھ دیتا ہے بلکہ اپنے پروگرام سے تفریحی رجحان پیدا کرتا ہے' اور تعلیم و تربیت کا ذریعہ بننے کے بجائے آلۂ تفریح بن کر رہ جاتا ہے' قانون مطابع اور حکومت کا محکمۂ احتساب جہاں سیاسیات و انتظامیات میں نہایت ذکی الحس خورد بین اور سخت گیر ہوتا ہے' اور کسی ادنیٰ تنقید کو بھی بعض اوقات گوارا نہیں کرتا' وہاں اخلاقیات کے بارہ میں نہایت فراخ دل' فیّاض اور بے نیاز واقع ہوتا ہے' غیر ذمہ دار اخبار نویس اور فحش نگار ادیب اور افسانہ نگار اپنے حقیر مادی فوائد کے لئے قوم میں اخلاقی طاعون

پھیلاتے ہیں لیکن جب تک پانی سر سے نہ گزر جائے حکومت کی مشین متحرک نہیں ہوتی، اس طرزِ حکومت میں اخلاق کے ساتھ قوم کی صحت بھی محفوظ نہیں رہتی، بعض تجارتی ادارے اپنے مضرِ صحت مصنوعات سے اہل ملک کی صحت کو مسلسل نقصان پہونچاتے رہتے ہیں، اور نسلوں کو کمزور و بیمار بناتے رہتے ہیں لیکن حکام کو رشوت دے کر یا حکومتی و قومی اداروں کو گرانقدر مالی امداد پہونچا کر حکومت کے عتاب و احتساب سے بچتے رہتے ہیں، یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ حکومت کا نقطۂ نظر اور اس کا فکری محور اُصول و اخلاق، ہدایت و اصلاح نہیں بلکہ مالی منفعت اور ظاہری خوشحالی ہے۔

اس طرزِ سیاست کا لازمی نتیجہ ہے کہ اہل ملک کے اخلاق روز بروز پست ہوتے چلے جائیں اور ایک خطرناک اخلاقی انحطاط اور اخلاقی امراض رونما ہوں، اور پوری قوم میں اور اس کے ہر طبقہ میں تاجرانہ ذہنیت اور نفع اندوزی اور موقع پرستی کی ذہنیت پیدا ہو جائے اور ایک عام لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو، ہر شخص دوسرے کو زیادہ سے زیادہ لوٹنے کی کوشش کرے اور اُصول و اخلاق کا مسئلہ بالکل نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

اس کے برخلاف جو حکومتیں منہاج نبوت پر قائم ہوتی ہیں، ان کی بنیاد تجارت کے بجائے ہدایت پر ہوتی ہے، خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے ایک عامل سے (جس نے ان کے طرزِ حکومت کی وجہ سے آمدنی کی تخفیف اور حکومت کے مالی نقصان کی شکایت کی تھی) فرمایا "کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے تحصیلدار اور محصّل بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے" اس ایک مختصر سے جملہ میں دینی حکومت کا پورا اصول سیاست اور طرزِ حکمرانی آگیا۔

دینی حکومت کی بڑی توجہ جمہور کے مذہب و اخلاق اور ان کے اُخروی نفع و ضرر کی طرف ہوتی ہے، اس کا اصل کام خراج اور محاصل کی تحصیل و صول اور آمدنی کا اضافہ

نہیں ہے، یہ سب چیزیں بالکل ضمنی اور ثانوی ہیں اور محض اصلاحی و دینی مقاصد کی تکمیل اور انتظامِ حکومت کے آلۂ کار کے طور پر ہیں، وہ تمام سیاسی و مالی امور میں دینی نقطۂ نظر سے غور کرتی ہے، دینی اور اخلاقی اُصول و مبادی کو مادی فوائد و مصالح پر مقدم رکھتی ہے اس کے حدود حکومت میں سود، جوا، شراب، زنا، فسق و فجور، بے حیائی کی قسمیں اور اس کے تمام محرکات و ترغیبات اور ایسے مالی معاملات جن سے انفرادی نفع اور اجتماعی مضرت ہو، ممنوع اور خلاف قانون ہوتے ہیں، اگرچہ اس کی وجہ سے عظیم الشان مالی خسارہ برداشت کرنا پڑے اور حکومت کو وسیع آمدنی سے محروم ہونا پڑے، وہ مختلف قسم کی اصلاحات نافذ کرتی ہے، اس کو صرف قوم کے افعال و اعمال ہی سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ اس کے رجحانات اور ذہنیت پر بھی اس کی نگاہ ہوتی ہے، اس لئے کہ اخلاقی رجحانات ہی افعال و اعمال کو وجود میں لاتے ہیں، اگر اخلاقی رجحان درست نہ ہو تو اعمال و افعال کی اصلاح اور جرائم اور بداخلاقیوں کا سدِباب کسی طرح ممکن نہیں، اس لئے وہ ان تمام چیزوں پر پابندی عائد کرتی ہے جو قوم میں بداخلاقی، قانون شکنی اور نفس پرستی اور عشرت پسندی کا رجحان پیدا کرتی ہیں اور ان تمام اشخاص کو مجرم اور ملک کا دشمن گردانتی ہے، جو لوگوں میں بے حیائی اور معصیت پسندی پیدا کرتے ہیں، خواہ وہ اہل فن ہو یا تاجر یا اہل حرفہ، اس کو قیامِ امن و انتظامِ سلطنت کے ساتھ ساتھ اخلاقی نگرانی اور تہذیب نفس کا بھی پورا پورا اہتمام ہوتا ہے، اس لئے کہ اس کی حیثیت صرف پولیس اور چوکیدار کی نہیں ہوتی بلکہ ایک شفیق مربی اور اتالیق کی بھی ہوتی ہے۔

اس نوع کی حکومت کا طبعی نتیجہ وہی ہے جو قرآن مجید میں مہاجرین اولین کے تذکرہ میں ایک پیشین گوئی کے طور پر ذکر کیا گیا ہے:۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ — یہ (مظلوم) مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے

اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (الحج - ۴۱)	زمین میں انھیں صاحبِ اقتدار کر دیا یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نماز کا نظم قائم کریں گے زکوٰۃ کی ادائیگی میں سرگرم ہوں گے نیکیوں کا حکم دیں گے اور برائیاں روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

تجارت وصنعت کا اخلاق کے ساتھ عدم تعاون

افزائشِ دولت کے بُحرانی عہد میں یا لارڈ میکالے کے پُر معنی الفاظ میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولتمند بن جانے کا شوق رکھنے والے لوگوں کے اقتدار میں ایک زبردست تجارتی مقابلہ جاری ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تفریحی صنعتوں آرائش کے سامان اور لباس و زینت کے انواع و اقسام کا ایک سیلاب ہر روز کارخانوں اور صنعت گاہوں سے شہروں پر اُمنڈ آتا ہے بازار نئی تراش خراش کے لباس، نئی نئی قطع کے جوتوں اور جوتیوں سے اور دوسرے سامانِ آرائش سے جگمگاتے رہتے ہیں پھر فوراً یہ چیزیں پُرانی اور فرسودہ قرار پا جاتی ہیں اور برائے نام ترمیم کے ساتھ نیا سامان ان کی جگہ لیتا ہے زینت حسن و ترقی کا معیار روزانہ بدلتا ہے اور برابر بڑھ رہا ہے اس میں بڑا دخل کارخانوں کی اس بے ضرورت تفریحی پیداوار اور اس مسابقت و رقابت کو ہے جو تجارتی مرکزوں اور صنعت گاہوں میں کام کر رہی ہے اور جو لوگوں کے اخلاق و معاشرت نیز قوت خرید سے بالکل بے نیاز ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زندگی روز بروز گراں، معیار زندگی ہر گزرے ہوئے دن سے بلند، زندگی کے مطالبات اور فرضی لوازمِ زندگی روز افزوں اور ان کی تکمیل کے لئے بڑی سی بڑی آمدنی ناکافی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قناعت ایک لفظ

بے معنی بنتا جارہا ہے، سکون واطمینانِ قلب خواب و خیال ہوگیا ہے، ہر شخص اپنے سامنے اپنے سے بلند معیارِ زندگی رکھتا ہے، اور وہاں تک پہونچنا اپنا سب سے بڑا فرض سمجھتا ہے، ماحول بھی اس سے اسی کا مطالبہ اور اسی کی توقع کرتا ہے، اور اس کے بغیر اس کو ذلیل سمجھتا ہے، ایک مدت اسی جد و جہد میں گزرتی ہے، جب وہ بامِ مقصود تک پہونچنے لگتا ہے تو وہ اور بلند ہو جاتا ہے، اور ایک دوسرا بلند معیارِ زندگی سامنے آجاتا ہے، اس طرح زندگی ایک غیر مختتم جد و جہد اور ایک ایسا ریس کا میدان ہے جس کا سرا اور کوئی انتہا نہیں، اس کا نفسیاتی اثر یہ ہے کہ زندگی میں تلخی اور کوفت بہت بڑھ گئی ہے، اور جو گھر آسانی کے ساتھ جنت کا نمونہ ہو سکتے تھے، اور جن میں زندگی کے فطری و حقیقی لوازم سب پائے جاتے ہیں، کسی نہ کسی موہوم اور خیالی چیز کی کمی کی وجہ سے دوزخ کا نمونہ ہیں، جہاں حقیقی عیش اور قلبی سکون عنقا ہے۔

ایک مسلمان عالم نے رومی و ایرانی تمدن کا جو نقشہ کھینچا ہے اور جو کتاب کے ابتدائی صفحات میں گزر چکا ہے، اس کو سامنے رکھ کر دیکھئے، موجودہ تمدن کا نقشہ اس سے ذرا بھی مختلف ہے! اس کا اخلاقی اثر یہ ہے کہ اخلاقی حدود و ضوابط برقرار نہیں رہے، محدود آمدنی میں غیر محدود مطالبات و تقاضوں اور فرمائشوں کی تکمیل رشوت اور غیر قانونی وسائل آمدنی کے بغیر ممکن نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ رشوت (مختلف ناموں کے ساتھ) مجرمانہ داد و ستد، اور مخفی ذرائع آمدنی کا بازار گرم ہے، اور ان سے زندگی میں جو مشکلات اور نظام میں جو ابتری پیدا ہو سکتی ہے، وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔

یہ نتیجہ عموماً زندگی کے فطری اور حقیقی ضروریات کے تقاضے کا نہیں بلکہ فرضی اور غیر حقیقی ضروریات کے مطالبہ کا ہے، اس کی بندش محض قانونی گرفت اور استیصالِ رشوت کی کوششوں سے ممکن نہیں، اس کا ذمہ دار وہ نظامِ زندگی ہے جو ایک مدت سے اخلاقی ہدایات سے محروم،

اُخروی جزا و سزا کے تصور سے عاری' اور وہ نظام تعلیم ہے جو اپنی یکسر مادہ پرستانہ ساخت کی وجہ سے اخلاقی حس اور ضمیر پیدا کرنے میں اتنا ہی ناکام ہے جتنا نجاری یا حدادی کا پیشہ یا مصوری اور موسیقی کا فن ہو سکتا ہے' اس کا ذمہ دار وہ نظامِ حکومت ہے' جو آمدنی اور پیداوار کے وسائل پر قابو رکھنا تو اپنا فرض سمجھتا ہے لیکن تجارت و صنعت اور اخلاق کے باہمی تعاون و توافق کو ضروری نہیں سمجھتا۔

سائنٹفک ترقی اور عہد جدید کے اکتشافات

عہد حاضر اپنے طبیعی تحقیقات اور علمی و صنعتی اکتشافات و اختراعات کے لحاظ سے انسانی تاریخ کا ممتاز ترین عہد ہے' اور اپنے اس امتیاز کی وجہ سے بجا طور پر اس کا مستحق ہے کہ اس کو اکتشاف و ایجاد اور برق و فولاد کے عہد کا لقب دیا جائے' یورپ کی امامت اس باب میں مسلّم ہے' اور اس کے محققین و موجدین کی ذہانت اور صنّاعی قطعاً محل بحث نہیں۔ لیکن ہم کو اس موقع پر ایک مخصوص تنقیدی نقطۂ نظر سے ان صنعتی کامیابیوں اور اکتشافات و ایجادات کا جائزہ لینا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ ان ایجادات کا مقصد کیا ہے' انھوں نے کس حد تک اپنے مقصد کو پورا کیا اور دنیا کے لئے یہ ایجادات خیر و برکت اور باعثِ راحت ثابت ہوئیں یا انھوں نے دنیا کی مشکلات و مصائب میں کچھ اضافہ ہی کیا۔

صنعتی اکتشافات کا مقصد اور اسلامی تعلیمات

ہمارے نزدیک ان علمی تحقیقات اور صنعتی اکتشافات کا صحیح مقصد یہ ہے کہ انسان کو زندگی کے فطری سفر میں اپنی لاعلمی اور کمزوری کی بنا پر جو رکاوٹیں اور موانع پیش آتے ہیں ان پر قابو حاصل کیا جائے اور صحیح مقاصد کے ماتحت (جن میں زمین میں سربلندی اور

فتنہ و فساد شامل نہیں) قدرت کی ان قوتوں اور دولتوں سے فائدہ اٹھایا جائے جو اس عالم میں بکھری ہوئی ہیں۔

مثال کے طور پر انسان زمانۂ قدیم میں پیدل چلتا تھا، پھر یہ بات اس کی سمجھ میں آئی کہ وہ جانوروں سے فائدہ اٹھائے، اس نے بیل گاڑیوں سے کام لیا، پھر اس نے اور سُرعت پیدا کرنی چاہی تو اس نے صبا رفتار گھوڑوں کے ذریعہ دنوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کی، انسان کی فطرت میں قناعت اور سکون نہیں، اور جذبۂ مسابقت بھی اس کو کسی ایک منزل پر ٹھہرنے نہیں دیتا، اس کی ضروریات بھی بڑھتی گئیں اور راحت و سُرعت کا معیار بھی بلند ہوتا گیا، اور بتدریج وہ سواریاں وجود میں آتی رہیں جن میں سے ہر ایک پہلے کے مقابلہ میں زیادہ تیز ہے، بحری سفر میں اس نے بادبانی کشتیوں سے دخانی جہازوں تک ترقی کی، حمل و نقل کے بری و فضائی آلات و وسائل بھی اس نقطہ تک پہونچ گئے جو زمانۂ سابق کے لوگوں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے، اگر صحیح مقاصد کے ماتحت ان سہولتوں سے فائدہ اٹھایا جائے، غیر ضروری مشقت اور وقت اور قوت کے غیر ضروری استعمال سے بچ کر ان کو اور کسی بہتر مصرف میں صرف کیا جائے تو یہ خدا کی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سفر کی اس راحت و سہولت اور سُرعت کو بطور انعام کے ذکر کیا ہے، اور انسانوں پر اپنا ایک بڑا احسان بتلایا ہے کہ وہ خدا کی دوسری مخلوقات کے ذریعہ سفر اور بار برداری کی بڑی بڑی مشقتوں سے بچ جاتے ہیں اور اس کو اپنی راحت و رحمت کی ایک نشانی اور دلیل کے طور پر پیش کیا ہے فرمایا:۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ	اس نے چارپائے پیدا کئے، ان میں تمہارے
وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَكُمْ	لئے گرم کرنے والی پوشش ہے نیز طرح طرح
فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ	کے فائدے اور بھی ہیں، ایسے جانور بھی ہیں

تَسْرَحُوْنَ ○ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً وَّيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

(النحل ۔ ۵ ۔ ۸)

جن کا تم گوشت کھاتے ہو اور ان میں تمہاری نگاہوں کے لئے خوشنمائی ہے جب تم شام کے وقت انہیں واپس لاتے ہو اور جب صبح کو چھوڑ دیتے ہو اور یہی جانور ہیں جو تمہارا بوجھ اٹھا کر ایسے شہروں تک لے جاتے ہیں کہ تم وہاں تک نہیں پہونچ سکتے تھے مگر بڑی ہی جانکاہی کے ساتھ بلاشبہ تمہارا پروردگار بڑا ہی شفقت رکھنے والا اور بڑا ہی رحمت رکھنے والا ہے اور گھوڑے خچر اور گدھے پیدا کر دیئے ہیں کہ تم ان سے سواری کا کام لو اور ویسے ان میں خوشنمائی اور رونق بھی ہے وہ اور بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کی تمہیں خبر نہیں۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ○

(بنی اسرائیل ۔ ۷۰)

اور البتہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور خشکی اور تری دونوں کی قوتیں اس کے تابع کر دیں کہ اسے اٹھائے پھرتی ہیں اور اچھی چیزیں اس کی روزی کے لئے مہیا کر دیں نیز جو مخلوقات ہم نے پیدا کی ہیں ان میں سے اکثر پر اسے برتری دی پوری برتری۔

وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا	اور جس نے سب چیز کے جوڑے بنائے اور
وَجَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْفُلْکِ وَالْاَنْعَامِ	تمہارے واسطے کشتیاں اور چوپائے بنائے
مَا تَرْکَبُوْنَ ۝ لِتَسْتَوٗا عَلٰی ظُهُوْرِهٖ	جن پر تم سوار ہوتے ہو تاکہ چڑھ کر بیٹھو
ثُمَّ تَذْکُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّکُمْ اِذَا اسْتَوَیْتُمْ	ان کی پیٹھ پر پھر اپنے رب کا احسان
عَلَیْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ	یاد کرو جب اس پر بیٹھ چکو اور کہو پاک
سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا کُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ	ذات ہے وہ جس نے اس کو ہمارے بس میں
وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝	کر دیا اور ہم اس کو قابو میں نہ لا سکتے تھے
(الزخرف۔۱۲۔۱۴)	اور ہم کو اپنے رب کی طرف پھر جانا ہے۔

حضرت سلیمانؑ پر اپنے احسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ غُدُوُّهَا	اور سلیمان کے لئے ہوا کو مسخر کیا صبح کی
شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ	منزل اس کی ایک مہینہ کی راہ اور شام کی
(سورۃ سبا۔۱۲)	منزل ایک مہینہ کی۔
فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّیْحَ تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖ	پھر ہم نے ہوا ان کے تابع کی ان کے حکم
رُخَآءً حَیْثُ اَصَابَ ۝ (سورۃ ص ۳۶)	سے چلتی نرم نرم جہاں پہونچنا چاہتے۔

لیکن ان نعمتوں اور سہولتوں سے فائدہ اٹھانے میں ایک خداشناس اور ناخداشناس کی نفسیات میں بڑا فرق ہے، مومن کو اس کی ہدایت ہے اور اس سے اس کی توقع کی گئی ہے کہ وہ ان نعمتوں سے مستفید ہونے کے وقت اس بات کو ملحوظ و مستحضر رکھے کہ یہ محض اللہ کا انعام اور اس کی بخشش ہے اس نے اس آزاد اور بے مہار جانور (یا بے حس و حرکت لوہے اور لکڑی کو) اس طرح اس کا تابع فرمان اور آلۂ کار بنا دیا کہ وہ اس کے حکم و ارادہ سے تجری

بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ" رواں دواں ہے اگر اس کی بخشی ہوئی عقل و تدبیر اور قوت
ولیاقت نہ ہوتی تو یہ اس کے بس کی بات نہ تھی" لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ
رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِىْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ[1]
اور عین اس حالتِ استفادہ میں یہ پیشِ نظر رہے کہ وہ قوت وقدرت کے باوجود اشیاء کے
اصل خالق اور عالم کے فرمانروا کے حضور میں حاضر ہونے پر مجبور ہے اور اس کو ایک دن اس کا
حساب دینا ہے کہ اس نے ان نعمتوں سے کیا فائدہ اٹھایا ان کو کہاں استعمال کیا اور ان کا
کیا حق ادا کیا، چنانچہ آیت کے آخر میں فرمایا" وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ[2]" مومن ان نعمتوں
کو محض اللہ کا فضل وانعام اور شکر و ناشکری کا امتحان سمجھتا ہے حضرت سلیمان علیہ السلام
کے الفاظ ہیں هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّىْ لِيَبْلُوَنِىْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا
يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّىْ غَنِىٌّ كَرِيْمٌ[3] یہ میرے رب کا احسان ہے تاکہ مجھے آزمائے
کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں جو کوئی شکر کرے گا، تو اپنے واسطے اور اگر کسی نے
ناشکری کی تو میرا رب تو بے نیاز و کریم ہے) مومن اور غیر مومن کا ایک فرق یہ ہے کہ مومن
ان آلات اور قوتوں کو ان کے محل پر استعمال کرتا ہے اور ان سے اللہ کے دین اور نظامِ حق
کی اعانت و نصرت کا کام لیتا ہے، جو ان اشیاء کی پیدائش کا اصل مقصد ہے فرمایا" وَاَنْزَلْنَا
الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ
اِنَّ اللّٰهَ قَوِىٌّ عَزِيْزٌ[4]" (اور ہم نے لوہا پیدا کیا جس میں بڑی قوت اور لوگوں کے لئے فوائد ہیں
(اور اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے) کہ اللہ ان لوگوں کو جان لے جو (اس کے ذریعہ) اللہ کی اور اس کے
پیغمبروں کی بن دیکھے مدد کرتے ہیں، اور بے شک اللہ (خود) قوی اور غالب ہے) خدا شناس خدا ترس
انسان خدا کی بخشی ہوئی طاقت اور انعام کو مجرموں کی مدد کا ذریعہ نہیں بناتا، حضرت موسیٰ نے فرمایا

"رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ فَلَنْ اَکُوْنَ ظَهِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ"[۱] (اے رب جیسا تو نے مجھ پر فضل کیا پھر میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ ہوں گا) پس صحیح دین ہی ہے جو خدا کی شناخت اور خدا کا خوف پیدا کرتا ہے جو تمام مخلوقات کے اصل خالق اور عالم کے اصل فرمانروا کی معرفت پیدا کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ انسان محض ان قوتوں اور دولتوں کا امین ہے اس کو اس کے حضور میں پیش ہونا ہے اور ان قوتوں اور دولتوں کے مصرف و استعمال کا جواب دینا ہے دین ہی ہے جو انسان کو طاقت کے نشہ میں متوالا اپنے اختیارات اور تصرّف کی قوت دیکھ کر بے خود اور مدہوش ہونے نہیں دیتا، دین ہی ہے، جو ان چیزوں کا جائز و صحیح محل استعمال اور مفید مصرف بتلاتا ہے، وہی ان چیزوں کو کارآمد، بنی نوع کے لئے مفید اور دنیا کے حق میں باعث خیر و برکت بناتا ہے دین ہی ہے جو انسان کی عقل اس کی قوت اور اس کے اخلاق کے درمیان توازن و تناسب قائم رکھتا ہے دین ہی ہے جو انسان کے ذاتی فوائد و مصالح کو اجتماعی فوائد و مصالح کے ساتھ مربوط و متناسب رکھتا ہے، دین ہی ہے جو انسان میں اپنی قوت و اختیارات کے مشاہدہ و احساس کے وقت ضبط و اعتدال اور فخر و استکبار کے بجائے عجز و نیاز اور بندگی کی شان پیدا کرتا ہے قرآن مجید نے دونوں طرح کے نمونے پیش کئے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے عین جاہ و جلال میں فرمایا:۔

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ	پروردگار! تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور
مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ	باتوں کا مطلب اور نتیجہ نکالنا تعلیم فرمایا اے
وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا	آسمان و زمین کے بنانے والے تو ہی میرا کارساز
وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ	ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ایسا کیجیو کہ
بِالصّٰلِحِیْنَ ○	دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت
(یوسف - ۱۰۱)	میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں۔

[۱] القصص - ۱۷

حضرت سلیمانؑ نے جب اپنی قوت وحشمت اور رعب و دبدبہ ملاحظہ فرمایا تو بے ساختہ ان کی زبان مبارک پر یہ الفاظ آئے:۔

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ	اے میرے رب مجھے توفیق دے کہ میں تیرے
الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ	احسان کا شکر کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے
وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ	ماں باپ پر کیا اور یہ کہ ایسے نیک کام کروں
بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ○	جو تجھے پسند ہوں اور مجھ کو اپنی مہربانی سے
(النمل - ۱۹)	اپنے نیک بندوں میں ملالے۔

اس کے برخلاف جو لوگ دین کی دولت سے محروم اور خدا کو بھولے ہوئے تھے، ان کو اپنی طاقت اور دولت پر ناز تھا، اور وہ اپنے سے بلند و بالا کسی ہستی کو نہیں سمجھتے تھے:۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ	اور قوم عاد کا قصہ یہ ہے کہ انھوں نے
بِغَیْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ	ملک میں ناحق تکبر کیا اور کہنے لگے کون ہے
مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ	ہم سے زیادہ طاقت میں کیا دیکھتے نہیں کہ
الَّذِیْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ	اللہ جس نے ان کو بنایا وہ ان سے زیادہ
قُوَّةً ؕ وَكَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ○	ہے طاقت میں اور وہ ہماری نشانیوں
(حٰمٓ السجدہ-۱۵)	کے منکر تھے۔

زمانۂ ماضی کے ایک بڑے دولتمند کا واقعہ سنایا ہے کہ اُس سے کچھ معقول لوگوں نے کہا کہ اپنی دولت پر زیادہ ناز نہ کرو، اپنے مال و دولت سے آخرت کا سامان کرو اور اللہ کے احسان کا بدلہ احسان سے دو اور زمین میں فتنہ و فساد برپا نہ کرو:۔

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ	جب اس سے اس کی قوم نے کہا اترامت اللہ کو

لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ٥ وَابْتَغِ فِيْمَآ	اترانے والے نہیں بھاتے اور جو تجھ کو اللہ
اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ	نے دیا ہے اس سے پچھلا گھر کمالے اور اپنا
نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ	حصہ دنیا سے نہ بھول (یعنی حصہ موافق
كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ	کھا پہن اور برت) اور بھلائی کر جیسے
الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ	اللہ نے بھلائی کی تجھ سے اور ملک میں خرابی
الْمُفْسِدِيْنَ ٥ (القصص۔۷۶،۷۷)	ڈالنا نہ چاہ اللہ کو فساد کرنے والے پسند نہیں۔

قارون نے اس کا جواب دیا کہ اس مال و دولت کے سلسلہ میں میں کسی کا شرمندۂ احسان و ممنون منت نہیں یہ محض میری عقل و دانائی اور علم و ہنر مندی کا ثمرہ ہے "قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ[1]" (کہا یہ تو مجھے اپنے ایک خاص علم کی بنا پر ملا ہے۔)

اپنی طاقت کے زعم و احساس اور اپنے اوپر کسی اور ہستی ...... اور بالاتر طاقت کے انکار کا نتیجہ وہ نشۂ قوت ہے جو انسان کو مجنوں بنا دیتا ہے، اور جس کو کوئی اخلاقی ہدایت و تعلیم، کوئی جذبۂ انسانیت اور کوئی مصلحت قابو میں نہیں رکھ سکتی، افراد اس کے آہنی پنجہ میں مجبور و بلا اختیار رہتے ہیں، اور کمزور قومیں اس کے پاؤں کے نیچے سبزہ کی طرح پامال ہوتی رہتی ہیں، قوم عاد سے اس کے پیغمبر نے کہا "وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ[2]" (اور جب تم کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو اس کو بڑی سختی سے پکڑتے ہو) سرکشی اور تکبر، فتنہ و فساد، مردم آزادی اور آدم کشی اس کا لازمی نتیجہ ہے "اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ[3]" (بے شک فرعون نے ملک میں سر اٹھایا اور اس کے رہنے والوں کو کئی گروہوں میں بانٹ دیا، ایک گروہ کو بالکل کمزور کرتا چلا جا رہا تھا ان کے لڑکوں کو ذبح کر ڈالتا تھا اور عورتوں کو زندہ رکھتا تھا،

[1] القصص۔ ۷۸، [2] الشعرآء۔ ۱۳۰ [3] القصص۔ ۴

بے شک وہ مفسدوں میں تھا۔

صحیح دین کے گہرے اثرات اور اخلاقی تربیت کے بغیر جب قوت، علم اور صنعت ترقی کرتی ہے تو اس کے طبعی نتائج وہی ہوتے ہیں، جو اوپر بیان کئے گئے۔

یورپ میں قوت واخلاق اور علم ودین کا عدم توازن

بد قسمتی سے یورپ میں قوت واخلاق اور علم ودین کا توازن صدیوں سے بگڑا ہوا ہے، نشأتِ جدیدہ کے بعد سے مادّی قوت اور ظاہری علم بڑی سُرعت سے ترقی کرتے رہے اور دین واخلاق میں تنزّل وانحطاط واقع ہوتا گیا، کچھ مدّت کے بعد ان دونوں میں کوئی تناسب باقی نہیں رہا اور ایک ایسی نسل پیدا ہوئی جس کے ترازو کا ایک پلڑا آسمان سے باتیں کرتا ہے، اور دوسرا تحت الثریٰ میں ہے یہ نسل ایک طرف اپنے صنعتی کمالات وعجائبات اور اپنے خوارق عادات کے لحاظ سے نیز مادہ اور طبعی قوتوں کی تسخیر میں مافوق البشر معلوم ہوتی ہے، اور دوسری طرف اپنے اخلاق واعمال، اپنے حرص وطمع، سنگدلی اور بے دردی میں اس کی سطح چوپایوں اور درندوں کی سطح سے بلند نہیں، اس کے پاس زندگی کے تو تمام وسائل ہیں، لیکن اس کو جینا نہیں آتا، اس کو زندگی کے انتہائی وتکمیلی علوم ومسائل معلوم ہیں لیکن وہ انسانی زندگی اور تمدن واخلاق کے بالکل ابتدائی اصول ومبادی سے ناواقف ہے، اس کی علمی وصنعتی بلند پروازیوں اور اخلاقی پستیوں میں قطعاً کوئی تناسب نہیں ہے، طبعی علوم نے جو زبردست طاقت اس کو بخشی ہے اس کے استعمال کا وہ سلیقہ نہیں رکھتی، پروفیسر جوڈ نے خوب کہا ہے کہ علوم طبعی نے ہم کو وہ قوت بخشی جو دیوتاؤں کے شایان شان تھی، لیکن ہم اس کو بچوں اور وحشیوں کے دماغ سے استعمال کر رہے ہیں، ایک دوسرے موقع پر لکھتا ہے:۔

"ہماری حیرت انگیز صنعتی فتوحات اور ہمارے شرمناک اخلاقی بچپن کے درمیان جو تفاوت ہے اس سے ہمارا ہر موڑ پر سابقہ پڑتا ہے ایک طرف ہماری صنعتی ترقیوں کا حال یہ ہے کہ ہم بیٹھے بیٹھے سمندر پار سے اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم کے لوگوں سے بے تکلف باتیں کر سکتے ہیں سمندر کے اوپر اور زمین کے نیچے دوڑتے پھرتے ہیں ریڈیو کے ذریعہ سیلون میں گھر بیٹھے لندن کے بڑے گھنٹے (BIG BEN) کی آواز سنا کرتے ہیں بچے ٹیلی فون کے ذریعہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں برقی تصویریں آنے لگیں بے آواز کے ٹائپ رائٹر چل گئے ہیں بغیر کسی درد و تکلیف کے دانت بھرے جا سکتے ہیں کھیتیاں بجلی سے پکائی جاتی ہیں ربر کی سڑکیں بنتی ہیں ایکسرے کے ذریعہ ہم اپنے جسم کے اندرونی حصہ کو جھانک کر دیکھ سکتے ہیں تصویریں بولتی اور گاتی ہیں لاسلکی کے ذریعہ مجرموں اور قاتلوں کا پتہ چلایا جاتا ہے برقی موجوں سے بالوں میں پیچ و خم پیدا کیا جاتا ہے آبدوز کشتیاں قطب شمالی تک اور ہوائی جہاز قطب جنوبی تک اڑ کر جاتے ہیں لیکن اس سب کے باوجود ہم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے بڑے بڑے شہروں میں کوئی ایسا میدان بنا دیں جس میں غریبوں کے بچے آرام و حفاظت کے ساتھ کھیلیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سالانہ دو ہزار (۲۰۰۰) بچوں کی جانیں ضائع ہوتی ہیں اور نوے ہزار (۹۰۰۰۰) زخمی ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں ایک ہندوستانی فلسفی سے اپنے تمدن کے عجائبات کی تعریف کر رہا تھا، اسی زمانہ میں ایک موٹر چلانے والے نے (PENDIN SANDS) میں تین (۳) یا چار (۴) سو میل کی مسافت ایک گھنٹہ میں طے کر کے ریکارڈ قائم کیا تھا یا کسی ہوائی

نے ماسکو سے نیویارک کی مسافت مجھے یاد نہیں بیس گھنٹہ میں یا پچاس گھنٹہ میں طے کی تھی، جب میں سب کہہ چکا تو ہندوستانی فلسفی نے کہا ہاں یہ صحیح ہے کہ تم ہوا میں چڑیوں کی طرح اڑتے اور پانی میں مچھلیوں کی طرح تیرتے ہو لیکن ابھی تک تم کو زمین پر انسانوں کی طرح چلنا نہیں آیا۔[له]

علم و صنعت اور اخلاق و انسانیت کے درمیان جو عظیم فاصلہ موجودہ مغربی تہذیب نے پیدا کر دیا ہے، اور موجودہ تہذیب اپنا مقصد پورا کرنے اور انسانیت کی صحیح خدمت انجام دینے میں جس طرح ناکام رہی ہے، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے دوسرا مغربی فاضل ڈاکٹر الکسس کیرل ALEXIS CARREL اپنی کتاب MAN THE UNKNOWN میں لکھتا ہے:۔

"موجودہ زندگی انسان کو ترغیب دیتی ہے کہ وہ دولت کو ہر ممکن ذریعہ سے حاصل کرے لیکن یہ ذرائع انسان کو دولت کے مقصد تک نہیں پہونچاتے، یہ انسان میں ایک دائمی ہیجان اور جنسی خواہشات کی تسکین کا ایک سطحی جذبہ پیدا کرتے ہیں، ان کے اثر سے انسان صبر و ضبط سے خالی ہو جاتا ہے اور ہر ایسے کام سے گریز کرنے لگتا ہے جو ذرا دشوار اور صبر آزما ہو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب جدید ایسے انسان پیدا ہی نہیں کر سکتی جن میں فنی تخلیق، ذکاوت اور جرأت ہو، ہر ملک کے صاحب اقتدار طبقہ میں جس کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے ذہنی اور اخلاقی قابلیت میں نمایاں انحطاط نظر آتا ہے، ہم محسوس کر رہے ہیں کہ تہذیب جدید نے ان بڑی بڑی امیدوں کو پورا نہیں کیا جو انسانیت نے اس سے وابستہ کی تھیں اور وہ ان لوگوں کو پیدا کرنے میں ناکام رہی جو ذہانت اور جرأت کے مالک ہوں اور

له GUIDE TO MODERN WICKDNESS PP. 262-63

تہذیب کو اس دشوار گزار راستہ پر سلامتی کے ساتھ لے جا سکیں جس پر آج وہ ٹھوکریں کھا رہی ہے' واقعہ یہ ہے کہ افراد انسانی نے اس تیزی کے ساتھ ترقی نہیں کی جس تیزی کے ساتھ ان اداروں (INSTITUTIONS) نے ترقی کی ہے جو انسانی دماغ کا نتیجہ ہیں' یہ دراصل سیاسی رہنماؤں کے ذہنی اور اخلاقی نقائص کا نتیجہ ہے' اور ان کی اس جہالت کا جس نے موجودہ اقوام کو خطرہ میں مبتلا کر دیا ہے' طبعی علوم اور صنعتی فنون نے انسان کے لئے جو ماحول تیار کیا ہے' وہ انسان کے مناسب حال نہیں ہے' اس لئے کہ وہ برجستہ ہے کسی سابق نقشہ یا غور و فکر پر مبنی نہیں اور اس میں انسان کی شخصیت کے ساتھ مطابقت کا لحاظ نہیں رکھا گیا' یہ ماحول جو محض ہماری ذہانت اور ایجادات کی تخلیق ہے ہمارے قد و قامت اور ہماری صورت کے مطابق نہیں ہم سر نہیں ہیں' ہم ایک روز افزوں اخلاقی اور عقلی انحطاط میں مبتلا ہیں جن قوموں میں صنعتی تمدن پھلا پھولا اور اپنے عروج کو پہونچا ہے وہ پہلے سے بہت کمزور ہیں اور وہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ وحشت و بربریت کی طرف بڑھ رہی ہیں' لیکن ان کو اس کا احساس نہیں' ان کو اس وقت اس باغی دشمنِ انسانیت ماحول سے کوئی قوت بچا نہیں سکتی جو طبعی علوم نے ان کے گرد حصار کی طرح کھینچ لیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری تہذیب نے پچھلی تہذیبوں کی طرح زندگی کے لئے ایسی شرطیں عائد کر دی ہیں جو (بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر) زندگی کو ناممکن العمل بنا دیں گی' ہم مادیت کا جتنا علم رکھتے ہیں اس کے مقابلہ میں زندگی کا علم اور یہ کہ انسان کو کس طرح زندگی گزارنی چاہئے بہت کم رکھتے ہیں اور ہمارا علم اس بارہ میں

ابھی تک بہت پیچھے ہے اور اس کم علمی کا نقصان ہم بھگت رہے ہیں۔

ایجادات واکتشافات میں جس تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے، طبیعی علوم فلکیات اور علم الکیمیا کے اکتشافات کو زیادہ اہمیت دینے سے کچھ فائدہ نہیں، راحت تعیش، جمال، جسامت اور تکلفاتِ زندگی میں اضافہ ترقی سے کیا فائدہ، جب ہمارا ضعف اس سے فائدہ نہ اٹھانے دے اور ہم اس کو صحیح راستہ پر نہ لگا سکیں ایسے نظام زندگی کو مستحکم سے مستحکم تر بنانے سے کیا فائدہ جس سے اخلاقی پہلو بالکل خارج کر دیا جائے اور عظیم قوموں کی بہترین صفات نکال دی جائیں، ہمارے لئے مناسب بات یہ تھی کہ تیز رفتار جہازوں، زیادہ آرام دہ موٹروں زیادہ ارزاں ریڈیو اور زیادہ عمدہ رسدگاہوں کے بجائے اپنے آپ کی طرف زیادہ توجہ کریں، میکانیکی طبیعی اور کیمیاوی علوم کے بس میں یہ نہیں ہے کہ وہ ہم کو ذہانت بخش دیں اور اخلاقی نظام، اعصابی توازن اور امن و سکون عطا کریں۔"

آلات و وسائل کا غلط استعمال

حقیقت یہ ہے کہ یہ مصنوعات، ایجادات اپنی جگہ پر بالکل معصوم اور غیر جانبدار ہیں وہ انسان کے ارادہ اور اس کے عقل و اخلاق کے تابع ہیں، وہ اپنی ذات سے نہ خیر ہیں نہ شر انسان ہی ان کو خیر اور شر بناتا ہے، بلکہ بعض بذاتِ خود خیر ہوتی ہیں لیکن انسان غلط استعمال اور اپنی طبیعت و تربیت کی خرابی سے ان کو شر بنا لیتا ہے اس لئے سب سے زیادہ اس کے دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ان آلات اور مصنوعات کے استعمال کرنے والے کس قسم کے اخلاق و سیرت اور کس قسم کے مقاصد رکھتے ہیں۔

مغربی قومیں مدت دراز سے یہ عقیدہ رکھتی ہیں کہ لذت و راحت، مادی انتفاع، سربلندی

اور غلبہ کے علاوہ دنیا میں کوئی اور قابل حصول مقصد نہیں ہے طبعی طور پر انھوں نے اپنی ساری قوت علم اور ذہانت کو ان مقاصد کے حصول میں صرف کیا اور ایسے آلات و وسائل ایجاد کئے جن سے یہ مقاصد زیادہ آسانی اور سرعت کے ساتھ حاصل ہو سکیں، رفتہ رفتہ وسائل خود مقاصد بن گئے، اور اختراع و ایجاد اپنی جگہ پر خود ایک بڑا مقصد قرار پاگیا، اور جس طرح بچوں کو کھلونوں سے دلچسپی ہوتی ہے اس طرح ان کو ایجادات و اختراعات سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے یورپ میں معیار بدلتے رہے ہیں کچھ مدت پہلے یہ خیال غالب تھا کہ تمدن نام ہے راحت کا اور راحت زندگی کا سب سے بڑا آئیڈیل تھا پھر مختلف محرکات و اسباب کی بنا پر اور کچھ حصول راحت کے لئے سرعت و تیز رفتاری کی کوشش کی گئی اور زندگی کے ہر شعبہ میں سرعت پیدا کرنے کا مقابلہ شروع ہوا، لوگ اس میں ایسے محو ہوئے کہ رفتہ رفتہ یہ سمجھنے لگے کہ تمدن نام ہی ہے سرعت کا، اب سرعت زندگی کا آئیڈیل بن گیا، پروفیسر جوڈ لکھتا ہے:۔

"ڈزریلی (DESRAILI) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی سوسائٹی کا اعتقاد تھا کہ "تمدن نام ہے راحت کا" لیکن جہاں تک ہمارے زمانہ کی سوسائٹی کا تعلق ہے واقعہ یہ ہے کہ ہمارا اعتقاد ہے کہ تمدن نام ہے سرعت کا، سرعت زمانہ موجودہ کے نوجوان کا دیوتا ہے، اس کے آستانہ پر وہ سکون، راحت، امن اور دوسروں کے ساتھ مہربانی کو بڑی بے دردی کے ساتھ بھینٹ چڑھا دیتا ہے"۔[1]

اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا مقاصد ہیں جن کے لئے یہ آلات و وسائل استعمال ہو رہے ہیں، ان سے کہاں تک فائدہ اٹھایا جا رہا ہے اور اس کو اپنے نوعِ انسانی کے لئے کس حد تک مفید و کارآمد بنایا جا رہا ہے، اور انسان کی حالت ان قوتوں اور وسائل کی موجودگی میں چند صدی

[1] GUIDE TO MODERN WICKEDNESS P. 241

پہلے کے لوگوں سے کہاں تک بہتر ہے اس کا جواب ایک مغربی عالم اور مصنف نقّاد کی زبان سے مناسب ہوگا، پروفیسر جوڈ لکھتا ہے :۔

"بلا شبہ ہم بڑی سرعت و تیز رفتاری سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کرسکتے ہیں، لیکن یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ جن مقامات کا ہم سفر کرتے ہیں وہ بہت کم اس قابل ہیں کہ ان کی طرف سفر کیا جائے، اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاحوں کے لئے زمین سمٹ گئی ہے اور اس کی طنابیں کھنچ گئی ہیں، قومیں ایک دوسرے کے قریب ہوگئی ہیں اور ان کے پاؤں ایک دوسرے کی دہلیز پر ہیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوموں کے آپس کے تعلقات پہلے سے زیادہ ناخوشگوار و ناشگفتہ ہیں، وہ وسائل جن سے ہم اپنے ہمسایہ قوموں سے براہ راست واقف ہوجاتے ہیں انھوں نے الٹا دنیا کو جنگ کی آگ میں جھونکا، ہم نے آواز پہونچانے کا آلہ ایجاد کیا اور اس کے ذریعہ اپنی ہمسایہ قوموں سے باخبر کیں لیکن اس کا انجام یہ ہے کہ آج ہر قوم ہوا کی پوری طاقت کے ساتھ اپنی ہمسایہ قوم کو چھیڑنے اور دق کرنے کا کام لے رہی ہے، وہ اس کوشش میں رہتی ہے کہ وہ دوسری قوم کو اپنے سیاسی نظام کی برتری کا قائل و معتقد بنا دے۔"[1]

ہوائی جہاز کو دیکھو جو فضائے آسمانی میں منڈلا رہا ہے، تمہیں خیال ہوگا کہ اس کے مُوجد اپنے علم و مہارت و صنعت کے لحاظ سے مافوق البشر ہستیاں تھیں اور جنھوں نے اس پر پہلے پہلے پرواز کی تھی، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی بلند ہمتی، عزم اور جُرأت بڑی قابل داد اور لائق تحسین ہے لیکن اب ذرا ان مقاصد کا جائزہ لو جن کے ماتحت یہ ہوائی جہاز استعمال ہوئے اور مستقبل میں بھی استعمال ہوں گے،

[1] GUIDE TO MODERN WICKEDNESS, P. 247

وہ مقاصد کیا ہیں؟ فضائے آسمانی سے بمباری انسانوں کے جسموں کی ٹکڑے ٹکڑے کرنا، زندوں کا گلا گھونٹنا، انسانی جسموں کو جلا دینا، زہریلی گیسوں کا پھینکنا اور ان کمزوروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا جن کے پاس اس مصیبت سے حفاظت کا کوئی سامان نہیں، یہ مقاصد یا تو احمقوں کے ہو سکتے ہیں یا شیاطین کے۔

دیکھنا ہے کہ مؤرخ اس کے متعلق کیا رائے قائم کرتا ہے کہ ہم دھاتوں اور سونے کو کس طرح استعمال کرتے تھے، وہ لکھے گا کہ ہم نے ایسی ترقی کر لی تھی کہ لاسلکی کے ذریعہ سونے کی اطلاعات دے سکیں، وہ ویسی تصویریں پیش کرے گا جو دکھائی دیں گی کہ بینک کے لوگ کس صفائی اور شائستگی کے ساتھ سونے کا وزن اور شمار کرتے تھے، وہ اس خارق عادت طریقہ کا ذکر کرے گا جس سے ہم روزانہ سونے کو ایک دارالسلطنت سے دوسرے دارالسلطنت کی طرف منتقل کرتے رہتے تھے اور کشش اجسام کے قانون کو توڑتے تھے، وہ قلم بند کرے گا کہ یہ نیم وحشی صنعتوں میں بڑے ماہر اور جری تھے لیکن اس بین الاقوامی تعاون میں ناکام تھے، جو سونے پر کنٹرول رکھے اور اس کو صحیح طور پر تقسیم کرے، ان کو صرف اتنی فکر تھی کہ وہ قیمتی دھاتوں کو امکانی سرعت کے ساتھ دفن کر دیں وہ سونے اور دھاتوں کو افریقہ میں زمین کے شکم سے بڑی مہارت کے ساتھ نکالتے تھے، اور لندن، نیویارک اور پیرس کے محافظ خانوں میں دفن کرتے تھے!

ایجادات و اکتشافات کی ہلاکت آفرینی

مختلف اسباب و حالات کی بنا پر جن کی کسی قدر توضیح گزشتہ صفحات میں ہو چکی ہے، مغربی قوموں میں خیر کی طرف میلان اور بھلائی کا رجحان بہت کم ہو گیا ہے اور اخلاق و تمدن

کے صحیح اصول و مبادی کا سر رشتہ ان کے ہاتھ سے مدت ہوئی چھوٹ گیا، غیر ذمہ دارادب نے دلوں میں کجی اور ملحدانہ فلسفہ نے طبیعتوں میں انحراف پیدا کر دیا اور ذوق فاسد ہو گئے اس بنا پر جس طرح سے سمّی اور وبائی امراض میں صالح سے صالح غذا مریض کے معدہ میں پہونچ کر مسموم اور فاسد ہو جاتی ہے، اسی طرح علوم اور صنعتیں ایجادات واکتشافات اور علمی ترقیاں یورپ میں خود اہل یورپ کے لئے اور عام انسانیت و تہذیب کے لئے وبال جان بن گئی ہیں، مسٹر ایڈن نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا:۔

"جب تک کچھ کیا جائے اور خبر لی جائے اس دنیا کے باشندے اس صدی کے پچھلے حصے میں غاروں میں زندگی گزارنے والے دنیا کے قدیم وحشیوں کا طرز زندگی اختیار کرلیں گے اور اسی وحشت و بربریت کا دور شروع ہو جائے گا جو ہزاروں سال پہلے دنیا میں قائم تھا کیسی عجیب بات ہے کہ تمام ممالک ایک ایسے ہتھیار سے بچنے کے لئے کروروں روپیہ صرف کر رہے ہیں جس سے ہیں تو سب کے سب خائف مگر اس کو قابو میں رکھنے پر راضی نہیں ہوتے ہیں، میں بعض اوقات تعجب سے سوچتا ہوں کہ اگر کسی دوسرے سیارہ سے کوئی سیاح اور زائر اس زمین پر آئے تو وہ ہماری اس دنیا کو دیکھ کر کیا کہے گا وہ دیکھے گا کہ ہم سب اپنی ہی بربادی اور ہلاکت کے وسائل تیار کر رہے ہیں، اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کو اس کے طریقہ کی اطلاع بھی دے رہے ہیں۔

جس وقت مسٹر ایڈن نے یہ الفاظ کہے تھے، اس وقت ان کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ اس جنگ کے دوران ہی میں خدا ناشناس انسانی حکمت و صنعت کی ہلاکت خیزی اور آدم کشی اس درجہ کو پہنچ جائے گی کہ خود سائنسداں بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔

کئی سال کی منظم جدّوجہد اور کروروں روپیہ کے صرف سے بالآخر امریکہ ذرّاتی بم (ATOMIC BOMB) کے ایجاد میں کامیاب ہو گیا جس پر اس جنگ کی شکست و فتح کا

انحصار تھا اور ۱۶ جولائی ۱۹۴۵ء کو ۵½ بجے اس قوت و وسعت کا پہلا امتحان کیا گیا۔

بے جان آہنی برج اور بے حس فضائے آسمانی کے بعد اس کا دوسرا تجربہ ذی روح دشمن پر کیا گیا جس کو ہیبت زدہ کر کے شکست دینے کے لئے مغرب کی حکمت و صنعت نے اپنی بہترین قابلیت صرف کی تھی، ۶ راگست ۱۹۴۵ء کو جاپان کا بد قسمت شہر ہیروشیما اس کا پہلا نشانہ بنا اس کے گرتے ہی یہ عظیم الشان شہر تودۂ خاک بن گیا نہ کوئی جاندار باقی رہا نہ بے جان، آن کی آن میں انسان حیوان، عمارتیں سب معدوم تھیں، دھماکے کی شدت ہوا کا دباؤ اور دھواں قیامت خیز تھا، گرد و غبار کا جھلستا، اُبلتا اور کھولتا ہوا میلوں اونچا ایک پہاڑ تھا، اور اس پہاڑ کے نیچے جہنم کی سی آگ تھی، جس نے ہر چیز کو خاکستر کر دیا، اس طیارہ کو جس نے بم گرایا تھا، اسے گراتے ہی جلد سے جلد اپنی سلامتی کے لئے وہاں سے بھاگنا پڑا ورنہ تباہ ہو جاتا، دھماکا اتنا مہیب تھا کہ بم گرانے والوں کا پتہ پانی تھا، حیرت ہیبت اور خوف کے عالم میں ہر ایک کی زبان سے "یا خدا" کی آوازیں نکل رہی تھیں، لیکن جب یہ یہاں سے واپس آئے تو اتحادی حلقوں میں نعرہ ہائے مسرت بلند ہو رہے تھے، اور ہر شخص شاد و مسرور تھا۔[1]

اسٹورٹ گلڈر (STUART GUILDER) اپنے ایک مضمون میں ایٹم بم کی خطرناک اور ہلاکت آفرینی کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"اگرچہ پوری جزوی تفصیلات کا علم نہ تھا لیکن بہرحال ایٹم بم بنانے والے سائنسداں اتنا ضرور جانتے تھے کہ وہ جس آلۂ حرب کو استعمال کرنے جا رہے ہیں اس کے ثانوی نتائج یہ ہوں گے کہ انسانیت فنا ہونے سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکے گی، اس کے ثانوی نتائج کی اگر تفصیل معلوم کرنی ہے تو شہر ہیروشیما کی وہ رپورٹیں جو اخبارات کے نامہ نگاروں کو

---

[1] ہیروشیما کی میونسپلٹی کے صدر نے ۲۰ راگست ۱۹۴۹ء کو اعلان کیا کہ ۶ راگست ۱۹۴۵ء کو ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۲ لاکھ دس ہزار اور ۲ لاکھ ۴۰ ہزار کے درمیان تھی۔ (پی ٹی)

ملی ہیں، ملاحظہ ہوں، وہ نامہ نگار اس ذراتی بم کے پلیگ (ATOMIC PLAGUE) کے بارہ میں لکھتے ہیں:۔

بہت سے لوگ جو بظاہر نہ تو بم کے پھٹنے سے متاثر ہوئے تھے اور نہ اس کی آگ و حدت سے مرگئے اور برابر مر رہے ہیں اور ان کی اس موت کا سبب یہ ہے کہ ان کا خون تحلیل ہو جاتا ہے، اول اوّل خون کے سفید ذرات تباہ ہوتے ہیں پھر سرخ ذرات کی باری آتی ہے ان کے بال گر جاتے ہیں اور وہ جتنے دن بھی زندہ رہتے ہیں ان کے اعضا سوکھتے ہی رہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ مر جاتے ہیں اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ فضا میں کچھ ریڈیائی مواد ایٹم بم کے پھٹنے کے ذریعہ رہ جاتے ہیں اور انسانی کھال میں جذب ہو کر یا بذریعہ تنفس پھیپھڑوں تک پہونچ جاتے ہیں۔"

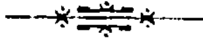
اس کتاب کو نقل کرنے کے بعد یہی مضمون نگار اسٹورٹ گلڈر (STUART GUILDER) لکھتا ہے:۔

"یہ خبر ساری دنیا کو لرزا دینے اور ڈرا دینے والی ہے، دنیا اب تک نہ تو اس خوفناک بم سے واقف تھی اور نہ ریڈیائی تاثیر رکھنے والی دھاتوں سے لیکن سائنسداں تو تیس سال قبل سے جانتے تھے کہ یہ ایک ایسا ہتھیار ہو گا جس کا توڑ اور تریاق کہیں نہیں اور یہ ساری نوعِ انسان کے لئے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جاپانیوں نے ان اثرات سے بچنے کے لئے خانہ ساز نقابیں استعمال کیں غالباً یہ وہ نقابیں تھیں جن کو اہل جاپان شدید سردی سے بچنے کے لئے استعمال کرتے تھے لیکن یہ اتنی ہی بے اثر نکلیں جتنے حبش کے فوجیوں کے وہ کپڑے جو انھوں نے اس وقت اپنی ناک کے گرد لپیٹ لئے تھے جب کہ مسولینی کے بمبار جہازوں نے ان پر زہریلی گیسیں برسائی تھیں۔

ذراتی بم پھینکنے میں ہوا باز شریک تھے' ان کا بیان ہے کہ اس بم کے گرنے کے بعد غبار اور دھواں نو میل تک ہوا میں پھیل گیا' پروفیسر (PLESCH) کی رائے ہے کہ جس جگہ بم پھٹے اس کے قرب و جوار میں سو میل کے علاقہ کے رہنے والوں کی سائنٹیفک طریقہ پر جانچ پڑتال کرنی چاہیئے اور ان کی جسمانی حالت کو بغور دیکھنا چاہیئے کہ کہیں ان پر اس کا اثر تو نہیں ہو گیا۔

یہ امر ذرا بھی مستبعد نہیں کہ دنیا ایک دن صبح اٹھ کر اخباروں میں یہ خبر پڑھے گی کہ وہ لوگ جو جاپان سے ہزارہا میل فاصلہ پر رہتے ہیں' ان میں وہی علامات پھیل گئی ہیں جو ذراتی بم کے پلیگ میں ہوتی ہیں' اگر ایک چھوٹا سا ذراتی بم ۹ میل تک کی ہوا کو گرد و غبار سے مسموم کر سکتا ہے تو یہ سمجھنا بالکل مطابقِ عقل ہے کہ اس سے بڑا بم اس سے کہیں زیادہ وسیع رقبہ کو متاثر کر دے گا۔[۱]



[۱] THE STATESMAN, SEPTEMBER 16, 1945

باب ششم

مغربی عہدِ اقتدار میں دنیا کے معنوی خسارے

یہاں مشرقی ایشیائی اقوام کے مادّی خساروں سے بحث نہیں، مغرب کے دورِ فتوحات میں مشرقی اقوام کو اپنے کن طویل وعریض ممالک سے دستبردار ہونا اور مغربی طاقت یا دانائی کے مقابلہ میں پسپا ہونا پڑا، یہ بحث اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے اور اس کی تفصیل ان مختصر اوراق میں سمیٹی نہیں جاسکتی، ہمیں اس وقت نہایت اختصار کے ساتھ بلکہ اشارات میں یہ دکھانا ہے کہ مغرب کے اقتدار کے اس سیلاب میں جو تمام روئے زمین پر پھیل گیا ہے اور اس کے اثرات سے پہاڑوں کی چوٹیاں اور وادیوں کی گہرائیاں آزاد قوموں کے ضمیر بلکہ ہوا اور پانی بھی محفوظ نہیں، دنیا کو کیا معنوی روحانی اور اخلاقی خسارے برداشت کرنے پڑے؟! اس عالمگیر انقلاب میں سب سے بڑا خسارہ مسلمان ہی کو برداشت کرنا پڑا ہے کہ جاہلیت کا تضاد و اختلاف اسی کے نظامِ زندگی سے ہے، اس لئے قدرتی طور پر جاہلیت کے غلبہ و اقتدار میں اسی کو سب سے زیادہ نقصان برداشت کرنا چاہئے۔

حاسۂ مذہبی کا فقدان

اس دنیا کا انجام کیا ہے، کیا اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے، اس کی

کیا نوعیت ہے اور اس کے لئے اس زندگی میں کیا ہدایات ہیں اور وہ کہاں سے معلوم ہوسکتی ہیں؟ اس کے بعد کی زندگی کو پُر راحت بنانے کے لئے کیا اصول و تعلیمات ہیں اور ان کا ماخذ کیا ہے روحِ انسانی کو ابدی راحت اور قلب کو دائمی سکون پہونچانے کا راستہ کیا ہے اور وہ کہاں سے دریافت ہوسکتا ہے۔؟

یہ وہ سوالات ہیں جنھوں نے مشرقی انسان کو سیکڑوں ہزاروں برس بے چین اور صورتِ سوال بنائے رکھا اور جو اس کے انتہائی مادّی استغراق اور خود فراموشی میں بھی اس کے قلب کی گہرائیوں سے بار بار اٹھتے رہے اور جواب مانگتے رہے مشرق نے اپنے کسی دور میں بھی ان فطری سوالات کو ٹالا نہیں اور اپنے دل کی یہ آواز سُنی اَن سُنی نہیں کی بلکہ اپنی زندگی کی تمام مشغولیتوں اور دماغ کی ساری کاوشوں میں ان کو پہلی جگہ دی وہ اپنی تہذیب اور علوم کی ہزاروں سال کی تاریخ میں برابر ان سوالات کے حل کرنے اور ان کا تشفی بخش جواب تلاش کرنے کے ادھیڑ بن میں رہا بعد الطبیعی فلسفہ علم کلام تصوف اشراق و روحانیت مجاہدہ و ریاضت علم و حکمت اور دوسرے مشرقی علوم و تجربات اس کے حل ہی کی مختلف کوششیں تھیں اس نے اس کے لئے غلط راستے بھی اختیار کئے اور غلط وسائل بھی استعمال کئے اور اس کو اس میں کامیابی سے زیادہ ناکامیابی ہوئی لیکن اس سے اس واقعہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ اہلِ مشرق کی زندگی میں یہ سوالات ہمیشہ موجود رہے اور ان کو اولین اہمیت حاصل رہی۔

اس موقع کے لئے اگر ہم فلسفہ ہی کی زبان استعمال کریں تو ہم یہ کہیں گے کہ اہلِ مشرق میں حواس ظاہری کے علاوہ ایک اور حاسہ بھی رہا ہے جس کو ہم حاسۂ مذہبی کہہ سکتے ہیں، جس طرح دوسرے حواس اپنا عمل کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے ان کے محسوسات حاصل ہوتے ہیں اس طرح اس حاسہ کے بھی کچھ محسوسات ہیں جو مشرقی زندگی کا لازمہ رہے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کے ابتدائی عہد میں یہ سوالات بدستور موجود تھے، اور اہلِ علم و اہلِ فکر ان پر عرصہ تک طبع آزمائی کرتے رہے لیکن مغربی تمدن اور فلسفۂ زندگی کے باطنی خواص زمانہ کے ساتھ ساتھ جس قدر ابھرتے رہے، اور زندگی میں مغرب کا جس قدر توغل اور انہماک بڑھا اسی قدر ان سوالات کی اہمیت کم ہوتی گئی اور وہ عملی زندگی میں پیچھے پڑتے رہے، فلسفۂ مابعد الطبیعات کے علمی و تعلیمی حلقوں میں اب بھی ان پر اظہار خیال ہوتا ہوگا، لیکن زندگی سے یہ سوالات یکسر خارج ہو چکے ہیں، اور ان کے سامنے سے علامت استفہام مٹ چکی ہے ان کے بارہ میں وہ خلش، کھٹک اور وہ ذوقِ جستجو جس میں ہزاروں سال اہلِ مشرق کو مشغول رکھا جاتا رہا، اور یہ کسی ایمان، شرحِ صدر اور اطمینانِ قلب کی بنا پر نہیں، بلکہ اس لئے کہ وہ اہلِ مغرب کی زندگی میں عرصۂ دراز سے اپنی اہمیت کھو چکے ہیں اور دوسرے مشاغل و مسائل کے لئے جگہ چھوڑ چکے ہیں، اس زمانہ کے مشغول انسان نے ان مسائل میں کامل بے تعلقی اور بے نیازی اختیار کر لی ہے، اس کو ان سوالات پر غور کرنے کی بالکل مہلت نہیں، اس کی طرف سے ان سوالات کے جواب کا کوئی پہلو اختیار کیا جائے اس کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں، اس کے لئے صرف یہ زندگی اہم ہے اور اسی کے متعلق ہدایات و تفصیلات اس کو مطلوب ہیں۔

قدیم مشرقی اور جدید مغربی میں یہ ایک عظیم الشان نفسیاتی فرق ہے کہ مشرقی مذہبی حاسہ رکھتا تھا اور مغربی اپنی تہذیب کے ارتقا کے ساتھ حاسہ مذہبی کھو چکا ہے، اور جب کسی شخص کا کوئی حاسہ باطل ہو جائے تو اس کے سارے محسوسات جو صرف اس حاسہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے لئے معدوم ہو جاتے ہیں، جو شخص قوتِ سامعہ سے محروم ہے اس کے لئے عالمِ اصوات معدوم ہے اور یہ پوری بولتی ہوئی دنیا ایک شہرِ خموشاں ہے، جو شخص قوتِ باصرہ سے محروم ہے اس کے لئے عالمِ الوان معدوم اور رنگوں کا فرق بے معنی ہے، اسی طرح جو شخص حاسہ مذہبی سے محروم ہے اس کے لئے وہ محسوسات، وجدانات اور تاثرات معدوم ہیں، جو صرف حاسہ مذہبی کا نتیجہ ہوتے ہیں، اس کے لئے آخرت، عذاب، ثواب، جنت، دوزخ

خدا کی رضامندی و نارضامندی، تقویٰ و طہارت، نجات و ہلاکتِ ابدی وغیرہ سب بے معنی الفاظ ہیں اس کے لئے کسی ایسی دعوت میں قطعاً کوئی کشش اور دلچسپی نہیں جس کا تعلق اس کے محسوسات اور نقد لذتوں اور منفعتوں کے سوا کسی اور چیز سے ہو۔

دین کی دعوت دینے والوں کو ہر دور میں اور انبیاء علیہم السّلام کو اپنے زمانۂ دعوت میں جن لوگوں میں سب سے زیادہ دقت پیش آئی ہے اور جن لوگوں پر ان کی انقلاب آفریں دعوت، ان کے خارہ شگاف اور آہن گداز مواعظ ان کا سوز و دردمندی بالکل بے اثر ثابت ہوئی ہے یہ وہی لوگ ہیں جو حاسۂ مذہبی سے محروم ہو چکے تھے اور جن کی دل کی انگیٹھیاں اس طرح سرد ہو چکی تھیں کہ ان میں کسی طرح گرمی نہیں پیدا کی جا سکتی تھی، جو مذہب اور اس کے متعلقات کے متعلق طے کر چکے تھے کہ ان کے بارہ میں نہ کچھ سننا ہے نہ غور کرنا ہے جنھوں نے اپنے زمانہ کے داعیوں کی پتھر کو موم کر دینے والی تقریریں کر بڑی سرد مہری سے کہا کہ "اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ"[1] (ہم تو محض دنیاوی زندگی کے قائل ہیں جینے اور مرنے کے سوا اور ہے کیا، مرنے کے بعد کون زندہ ہوگا؟) یا جن کی نظر مادی سطح سے حقیقت تک نفوذ کرنے کے قابل نہیں ہوتی اور جنھوں نے پیغمبر کی عام فہم تقریر سننے کے بعد جو انھیں کی زبان میں کی گئی تھی، بڑی سادگی سے کہا "مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا"[2] (تمہاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ تم کو ہم میں کوئی قوت حاصل نہیں۔)

مغربی تہذیب کے اس عروج کے زمانہ میں ہر قوم میں بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے، جس کی دنیاوی مشغولیت وانہماک یا دنیا کی محبت و حرص نے ان کی زندگی میں مذہب کے لئے کوئی خانہ خالی نہیں چھوڑا، بڑی تلاش و جستجو کے بعد بھی مذہب کی دعوت دینے والے کو ان کے دل و دماغ میں کوئی ایسا چھوٹے سے چھوٹا منفذ نہیں ملتا جس سے دینی اور اخلاقی دعوت ان میں

[1] المؤمنون - ۳۷ [2] ہود - ۹۱

نفوذ کر سکے، جس طرح کسی شخص کو موسیقی کے لئے کان اور شاعری کے لئے ذوق لطیف نہ ملا ہو اس کے لئے موسیقی کے سارے کمالات اور دنیا کی پوری وجد آفریں شاعری بے اثر و بے سود ہے، اسی طرح جو مذہبی حاسہ سے محروم ہو چکا ہو، اس کے لئے پیغمبروں کی پوری دعوت، ناصحوں کی وعظ و تلقین، علم و حکمت، قصص و امثال سب ضائع ہیں، یہ دلوں کی زمین کا سب سے بنجر حصہ ہے جس کو کوئی بارش سیراب نہیں کر سکتی۔ ع

یہاں آکے رو دیتا ہے ابر نیساں

جن لوگوں کو اس طبقہ سے خطاب کرنے اور اس کو دین و اخلاق کی دعوت دینے کا کبھی موقع ملا ہے ان کو قرآن مجید کی بہت سی آیات کے معنی سمجھ میں آگئے ہوں گے، اور وہ تمام کلامی اشکالات جو عملی زندگی اور میدان دعوت سے علیحدہ بیٹھ کر "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَةٌ ۡ"[1] اور اس کے ہم معنی آیات کے متعلق پیش آتے ہیں خود بخود حل ہو گئے ہوں گے اور یہ حقیقتِ قرآنی مجسّم نظر آئی ہو گی "وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاۗءً وَّنِدَاۗءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ" (البقرۃ۔ ۱۷۱)

اس زمانہ کا اصلی مرض دراصل دین کے بارہ میں بے حسی و بے طلبی اور مذہبی سوالات کے بارہ میں کامل بے تعلقی اور بے نیازی ہے جس کا علاج سب سے زیادہ مشکل ہے اور جس کی موجودگی میں کوئی مذہبی دعوت و تلقین کارگر نہیں ہو سکتی، مذہب و اخلاق کی دعوت کو فسق و فجور اور معصیت و غفلت کے تاریک دور اور انکار و مخالفت کے پُرشور سے پُرشور عہد میں وہ مشکلات پیش نہیں آئے جو مذہب سے بے تعلقی و بے نیازی کے اس خاموش و پرسکون دور میں پیش آرہے ہیں، جہاں سرے سے پیاس اور پانی کی طلب ہی نہ ہو وہاں پانی کا اہتمام اور خضر کی رہنمائی سب بے ضرورت ہے "اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاۗءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ"[2]

[1] البقرۃ ۷ [2] النمل ۸۰

ایک مغربی یونیورسٹی کے معلمِ فلسفہ و علم النفس نے اس حقیقت کا خوب ادراک کیا ہے اور اس فرق کی صحیح تحلیل کی ہے جو قدیم و جدید نفسیات میں پایا جاتا ہے' اس نے اس ایک جملہ میں ایک کتاب کا مضمون سمیٹ لیا ہے:۔

"مذہبی سوالات پہلے پیدا ہوتے تھے' ممکن ہے ان کا تشفی بخش جواب نہ ملتا ہو' لیکن اس زمانہ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ سوالات سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے"۔

ذوقِ خدا طلبی کا عالمگیر فقدان

اسلامی تمدن و حکومت کے عالمگیر اثرات کے تذکرہ میں گزر چکا ہے کہ اس کے اثر سے پوری دنیا میں (جو اسلام اور مسلمانوں کے زیرِ اثر تھی) خدا طلبی کا عام ذوق پایا جاتا تھا' ہزاروں لاکھوں اشخاص دین کی طلب اور مردانِ خدا کی تلاش میں دنیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ میں پہونچتے تھے' دنیا داری اور مادیت کے پھیل جانے کے بعد دینی رجحان اور خدا طلبی کا مرکز ان حضرات کی ذات اور ان کے مقامات تھے' جنھوں نے غفلت اور مادیت کے سمندر میں انسانی زندگی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے قائم کر رکھے تھے' جہاں وہ لوگوں کو مادیت کے اس بھنور سے نکال کر ان کی دینی تربیت کرتے تھے! ور ان میں طوفان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت و قوت پیدا کرتے تھے' بعد کی صدیوں میں ان کو صوفیہ و مشائخ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

ان حضرات کی طرف رجوع ان آخری صدیوں میں دینی رجحان اور عام مسلمانوں کے ذوقِ خدا طلبی کا ایک حد تک پیمانہ ہے' جس سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ لوگوں میں اس زمانہ میں مادیت و دنیا داری سے کس حد تک گریز اور دین کی کہاں تک طلب پائی جاتی تھی۔

عالمِ اسلامی کے مرکزی شہروں میں تقریباً ہر جگہ ایسے شخص موجود تھے جن کی ذات بحرِ ظلمات

میں روشنی کا مینار تھی، لوگ پروانوں کی طرح اس روشنی پر گرتے تھے، دنیا کے دور دراز گوشوں سے طالبینِ خدا وہاں جمع رہتے تھے، وہ مسلمانوں کی ایک بڑی بین الاقوامی آبادی ہوتی تھی، جہاں ایک وقت میں مشرق و مغرب، شمال و جنوب کے مسلمان پائے جاتے تھے اور اسلام کی وسیع دنیا وہاں سمٹی ہوئی نظر آتی تھی۔

ہمارا ملک ہندوستان جو اسلامی دنیا کے ایک سرے پر واقع ہے، دینی ذوق و شوق اور خدا طلبی کا ایک بڑا مرکز رہا ہے، یہاں ہر دور میں مسلمان سلاطین کی سلطنت کے پہلو بہ پہلو دینی و روحانی حکومت کے آزاد مرکز قائم رہے، جہاں سیکڑوں ہزاروں اشخاص اپنے زمانہ کی تمام مادی ترغیبات سے آزاد اور حکومت و سیاست کے انقلابات سے بے نیاز ہو کر اپنا کام کرتے تھے۔

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ (م ۷۲۵ھ) کی روحانی نو آبادی بستی غیاث پور اس کی ایک اچھی مثال ہے جس نے عین مرکز حکومت (دہلی) میں آٹھ با جبروت سلاطین (غیاث الدین بلبن ۶۶۴-۶۸۶ء سے لے کر غیاث الدین تغلق ۷۲۰-۷۲۵ھ تک) کے عہد حکومت میں تقریباً پچاس برس تک اپنی خود اختیاری اور بے نیازی قائم رکھی[1] اور جہاں سنجر[2] سے لے کر اودھ[3] تک کے طالبینِ خدا پڑے رہتے تھے۔

اگر تمام سلاسل طریقت کے بزرگوں کے مرکزوں کی آبادی اور ان کی طرف لوگوں کے رجوع کی تفصیل لکھی جائے (جس سے اس زمانہ کے دینی طلب و رجحان اور دینی عزت و احترام کا اندازہ ہوتا ہے) تو اس کے یہ اوراق متحمل نہیں، اس لئے نمونہ کے طور پر صرف ایک سلسلہ

---

[1] حضرت نظام الدینؒ غیاث الدین بلبن کے عہدِ حکومت میں ۶۶۹ھ میں دہلی تشریف لائے کچھ عرصہ تک مختلف محلوں میں قیام رہا پھر بستی غیاث پور (حال بستی نظام الدین) میں مستقل قیام اختیار کیا ۷۲۵ھ تک مختلف سلاطین آپ سے ملنے کی کوشش کرتے رہے لیکن کسی کو کامیابی نہیں ہوئی، تقریباً ۶۰ برس کی مدت تک آپ اور آپ کے اہلِ زاویہ بالکل یکسو رہے۔ [2] شیخ حسن علا سنجری۔ [3] شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی۔

(سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ) کے چند بزرگوں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق اور ان کی طرف اہل زمانہ کے رجوع کا مجمل ذکر کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ ان کے زمانہ میں جو مادیت اور دنیاداری کے عروج کا زمانہ تھا ذوق خدا طلبی کا کیا حال تھا اور دین کی کشش کہاں کہاں سے لوگوں کو کھینچ کر لاتی تھی۔

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ (م ۱۰۳۴ھ) کے منتسبین کی فہرست پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان وافغانستان کے کتنے شہروں اور قصبات کے کتنے کثیر التعداد اشخاص اور عہدِ جہانگیری کے کتنے بڑے بڑے امیر اور ارکانِ دولت ان کے حلقۂ ارادت وبیعت میں داخل تھے، اور کتنی دور سے انھوں نے سرہند آکر استفادہ کیا تھا۔

ان کے جلیل القدر خلیفہ حضرت سید آدم بنوریؒ (م ۱۰۵۳ھ) کی خانقاہ میں ایک ایک ہزار آدمی روزانہ ہوتے تھے، جو دونوں وقت خانقاہ میں کھانا کھاتے تھے ان کی سواری کے ساتھ ہزاروں ہزار آدمی اور سیکڑوں علماء ہوتے تھے "تذکرہ آدمیہ" میں ہے کہ ۱۰۵۲ھ میں جب آپ لاہور تشریف لے گئے تو سادات ومشائخ اور دوسرے طبقوں کے دس ہزار آدمی آپ کے ہمرکاب تھے، طالبین کا اتنا مجمع ہر وقت رہتا تھا کہ شاہجہاں کو ان کی طرف سے خطرہ پیدا ہوگیا تھا، اس نے کچھ رقم بھیج کر کہلوایا کہ آپ پر حج فرض ہوگیا ہے آپ حرمین تشریف لے جائیں، چنانچہ آپ ہندوستان سے ہجرت کر گئے۔

مجدد صاحب کے نامور خلیفہ اور صاحبزادہ حضرت خواجہ معصومؒ (م ۱۰۷۹ھ) کے ہاتھ پر نو لاکھ انسانوں نے بیعت وتوبہ کی اور سات ہزار آدمی خلافت سے مشرف ہوئے۔[1]

ان کے صاحبزادہ شیخ سیف الدین سرہندیؒ (م ۱۰۹۶ھ) کی خانقاہ (دہلی) میں طالبین کے ہجوم کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ صاحبِ ذیل الرشحاتؒ کے بیان کے . . . مطابق ایک ہزار چار سو آدمی دونوں وقت ان کے دسترخوان پر اپنی فرمائش اور خواہش کے موافق کھانا کھاتے تھے۔[2]

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد پنجم [2] ایضاً

امرا اور اہلِ ثروت کا بزرگان دین سے جو تعلق (دینی محبت و احترام کی بنا پر) تھا، اس کا ایک نمونہ یہ تھا کہ حضرت خواجہ محمد زبیر سرہندیؒ (م ۱۱۵۱ھ) جب مکان سے مسجد تشریف لے جاتے تو امراء راستہ میں دوشالے اور رومال بچھا دیتے کہ آپ کا پاؤں زمین پر نہ پڑے، کسی مریض کی عیادت یا کسی اور کام کے لئے کہیں تشریف لے جانا ہوتا تو آپ کی سواری بادشاہوں کی طرح نکلتی اور آپ کے جلو میں امرا اور اہلِ دولت کی پالکیاں اور سواریاں ہوتیں[1]۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد تجارت میں انقلاب حکومت سے کچھ پہلے تک یہ ذوق پورے طور پر موجود تھا، حضرت شاہ غلام علیؒ (م ۱۲۴۰ھ) (خلیفہ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ) کے عہد میں دہلی کی خانقاہ مجددیہ طالبین کا بہت بڑا مرکز تھی، سرسید احمد خاں مرحوم "آثار الصنادید" میں لکھتے ہیں:۔

"میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی اور خدمت خانقاہ کو سعادتِ ابدی سمجھے، اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امنڈتے تھے، حضرت کی خانقاہ میں پانچ سو فقیر سے کم نہیں رہتا تھا اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمہ تھا"[2]

شاہ رؤف احمد مجددیؒ "درالمعارف" میں صرف ایک روز کے طالبین کے مقامات کی فہرست لکھتے ہیں جو ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۱ھ کو دہلی کی اس خانقاہ میں استفادہ کے لئے حاضر تھے:

"سمرقند، بخارا، غزنی، تاشقند، حصار، قندھار، کابل، پشاور، کشمیر، ملتان، لاہور، سرہند، امروہہ، سنبھل، رام پور، بریلی، لکھنؤ، جائس، بہرائچ، گورکھپور،

---

[1] درالمعارف، ارشاد رحمانی، نزہتہ الخواطر [2] آثار الصنادید باب چہارم۔

عظیم آباد، ڈھاکہ، حیدر آباد، پونہ وغیرہ[1]

اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ ریلیں تھیں نہ آمد و رفت کی وہ سہولتیں جو آج حاصل ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے اسی دور میں انگریزی عملداری سے کچھ پہلے حضرت سید احمد شہیدؒ (ش ۱۲۴۶ھ) اور ان کے جلیل القدر رفیقوں، مولانا عبدالحی بڈھانویؒ (م ۱۲۴۲ھ) اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ (ش ۱۲۴۶ھ) اور ان کے مخلص مبلغوں نے مسلمانوں کو خدا اور رسول کی طرف رجوع کی دعوت دی اور "فَفِرُّوا إِلَى اللّٰهِ" (خدا کی طرف بھاگو) کی صدا بلند کی اور غفلت و معصیت اور خلاف شرع زندگی کے خلاف جد و جہد شروع کی، مسلمانوں نے جس ذوق و شوق کے ساتھ اس دعوت پر لبیک کہی اور جس طرح پروانہ وار اس جماعت کے امیر کے گرد جمع ہوئے جس عالی حوصلگی اور فراخ دلی کے ساتھ اس کے وفود کا خیر مقدم کیا اور اپنی دینی محبت و تواضع کا ثبوت دیا پھر جس طرح ہندوستان میں اسلام کے سارے باغوں کے بہترین پھولوں کا عطر کھینچ کر ان کے پاس پہونچ گیا (جو ۱۲۴۶ھ کے واقعہ میں بالاکوٹ کی مٹی میں مل گیا) اس سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس تنزل کے دور میں بھی مسلمانوں میں دین کی کتنی طلب اور خدا طلبی کا کیسا ذوق اور نشہ اور کیسی عالی ہمتی اور کتنی اچھی صلاحیت و استعداد تھی۔

مسلمانوں کے اس دینی ذوق کا اندازہ ان تبلیغی سفروں کی روداد سے ہوگا جو سید صاحبؒ نے بڑی بڑی جماعتوں کے ساتھ دو آبہ کے قصبات اور شہروں میں اور پھر اودھ میں کئے۔[2]

مسلمانوں کے ذوق و اشتیاق کا مزید اندازہ سید صاحبؒ کے سفر حج سے ہوگا جو آپ نے ۱۲۳۶ھ میں کیا، اس پورے سفر میں ہندوستان کا وہ مشرقی خطہ جو اب تین صوبوں (صوبۂ متحدہ، بہار اور بنگال) پر مشتمل ہے، اور اس قافلہ کی گزرگاہ تھا، مسلسل جنبش اور حرکت میں تھا، ہر جگہ

---

[1] درالمعارف ص ۱۰۶ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" طبع ثالث

دین کے طالب مسلمان پروانوں کی طرح گرتے تھے، معصیت اور غفلت کی زندگی سے توبہ کرتے تھے، اور خدا سے نیا عہد و پیمان باندھتے تھے، دیہاتوں اور گاؤں کے لوگ سیکڑوں کی تعداد میں جوق جوق آتے تھے، اور بیعت و توبہ کرتے تھے، اہل شوق اپنے مواضعات اور مقامات پر لے جاتے تھے، متوسط الحال لیکن بلند ہمت مسلمان پورے قافلہ کی (جس میں کلکتہ پہونچتے پہونچتے ساڑھے سات سو آدمی ہو گئے تھے) اور ان صدہا مسلمانوں کی جو قرب و جوار سے جمع ہو جاتے تھے، دل کھول کر کئی کئی دن ضیافت کرتے تھے، مسلمان رؤساء شاہانہ اولوالعزمی سے دین کے کام میں اپنی دولت صرف کرتے تھے، شیخ غلام علی صاحب رئیس الہ آباد نے بارہ پندرہ دن میں مجموعی طور پر بیس ہزار روپے صرف کئے ان کے دسترخوان پر دونوں وقت سیکڑوں آدمی کھانا کھاتے تھے، بعض لوگوں کا تخمینہ تھا کہ ایک ہزار روپیہ روزانہ کھانے پر صرف ہوتا تھا۔[1]

لوگوں کے رجوع اور اہلِ طلب کے ہجوم کا یہ عالم تھا کہ پورے پورے شہروں میں تھوڑے آدمی ایسے ہوں گے جو توبہ و بیعت سے اور اس قافلہ کے دینی برکات سے محروم رہ گئے ہوں گے، الہ آباد، مرزا پور، بنارس، غازی پور، عظیم آباد، پٹنہ اور کلکتہ میں مجموعی طور پر کئی لاکھ مسلمانوں نے بیعت و توبہ کی، دین کی عمومی اہمیت اور طلب کا اندازہ اس سے ہوگا کہ بنارس میں اسپتال کے مریضوں نے بھی پیغام بھیجا کہ ہم معذور ہیں وہاں تک ہمارا آنا دشوار ہے اگر آپ تشریف فی اللہ یہاں تشریف ارزانی فرمائیں تو ہم بیعت کریں، آپ ایک روز چند آدمیوں کے ہمراہ تشریف لے گئے اور ان مریضوں نے بھی توبہ و بیعت کی۔[2]

کلکتہ میں دو مہینے قیام رہا، روزانہ ایک ہزار آدمی کے قریب بیعت سے مشرف ہوتے روز بروز ہجوم بڑھتا جاتا تھا، کثرتِ بیعت کا یہ حال تھا کہ صبح سے دوڈھائی پہر رات گئے تک مردوں اور

[1] مخزن احمدی (فارسی) از مولوی محمد علی صاحب مرحوم (م ۱۲۶۶ھ) [2] ایضاً

عورتوں کا ہجوم رہتا، سید صاحب کو سوائے نماز پڑھنے کھانا کھانے اور ضروریاتِ بشری کے کچھ فرصت نہ ملتی علیحدہ علیحدہ ایک ایک شخص سے بیعت لینا محال تھا، ایک وسیع مکان میں سب جمع ہوجاتے آپ تشریف لاتے، سات آٹھ دستاریں کھول کر آپ لوگوں کے ہاتھ میں دے دیتے لوگ ان کو جابجا سے تھام لیتے اور آپ بیعت کے الفاظ کو اذان کی طرح بلند آواز سے تلقین فرماتے دن میں سترہ اٹھارہ بار یہی عمل ہوتا اور ہزاروں آدمی روزانہ اس طرح بیعت سے مشرف ہوتے[1]

نماز فجر کے بعد سید صاحب نے ۱۵-۲۰ روز تک وعظ فرمایا، دو دو ہزار امرا اور علما اور درویش ہر روز آتے تھے، اور غربا کا تو کچھ شمار نہ تھا، مولانا عبدالحی صاحب جمعہ و سہ شنبہ کو نماز ظہر کے بعد سے شام تک وعظ فرماتے تھے، اور لوگ پروانہ وار جمع ہوجاتے تھے، روزانہ ۱۰-۱۵ ہندو مسلمان ہوتے[2]

اصلاح و دین داری، توبہ و انابت کی اس عمومی فضا کا اثر یہ ہوا کہ کلکتہ میں یک لخت شراب کمپنی موقوف ہوگئی، دوکانداروں نے جاکر سرکار انگریزی میں اس کا شکوہ کیا کہ ہم لوگ سرکاری محصول بلا عذر ادا کرتے ہیں، اور دکانیں ہماری بند ہیں، جب سے ایک بزرگ اپنے قافلہ کے ساتھ اس شہر میں آئے ہیں، شہر اور دیہات کے تمام مسلمان ان کے مرید ہوئے اور ہر روز ہوتے جاتے ہیں، انھوں نے کل مسکرات (نشہ آور چیزوں) سے توبہ کی ہے، اب کوئی ہماری دوکانوں کی طرف ہو کر بھی نہیں نکلتا[3]

دین اور اہلِ دین کی محبت کا یہ حال تھا کہ جب حجاج کا یہ قافلہ جو سات سو آدمیوں پر مشتمل تھا، مکۂ معظمہ سے واپسی میں مرشد آباد کے قریب دیوان غلام مرتضیٰ کے دولت خانہ پر مقیم ہوا تو دیوان صاحب نے بھرے بازار میں اعلان کردیا کہ سید صاحب کے قافلہ کا جو آدمی اس بازار سے کچھ خریدے یا کسی دستکار سے کام لے تو اس کی قیمت و اجرت میرے ذمہ ہے، سید صاحب نے ان کو سمجھایا کہ آپ اس قدر زیر بار کیوں ہوتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ کسی مسلمان کے گھر کوئی حاجی آجاتا ہے تو اس کی بڑی سرفرازی

---

[1] وقائع احمدی (قلمی) [2] ایضاً [3] ایضاً

ہوتی ہے میں اپنی قسمت پر جو کچھ ناز کروں کم ہے کہ انتے حجّاج نے مجھے سرفراز فرمایا۔[1]

پھر جب سید صاحبؒ نے مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی تو مسلمانوں نے گرم جوشی کے ساتھ قبول کی، کاشتکار ہل چھوڑ کر، تاجر دکانیں بند کر کے، ملازم اپنے آقا کو سلام کر کے، امرا اپنے محلوں سے نکل کر، علماء اور مشائخ مسندِ درس و ارشاد چھوڑ کر ساتھ ہو گئے، اور کسی نے پلٹ کر اپنے گھر کو نہ دیکھا، یہاں تک کہ ان سرفروشوں کی آخری جماعت نے بالاکوٹ کی تنگ اور سنگ لاخ گھاٹی میں ان پتھروں اور چٹانوں کے درمیان (جن میں مسافر کا چلنا بھی آسان نہیں) اپنے سے دس گنا حریف کے مقابلہ میں جان دی اور مرتے مرتے بھی گھر کو یاد نہ کیا۔

یہ ساری تفصیل اس لئے لکھی گئی ہے کہ اس کا اندازہ کیا جائے کہ مسلمانوں کے برائے نام اقتدار کے بالکل آخری دور میں اور ان کے تنزّل و انحطاط کے شباب کے زمانہ میں بھی لیکن مغربی استیلا و تغلّب کے عہد سے پہلے مسلمانوں میں کتنی دینی طلب اور قدر، اور کس قدر دین کا ذوق و احساس اور کس قدر عالی ہمتی اور بلند حوصلگی تھی۔

انگریزی عملداری کے ابتدائی دور میں بھی جب کہ مغربی تہذیب و تعلیم اور اخلاق و سیاست کا اثر ہندوستان کی عام زندگی پر نہیں پڑا تھا، پہلے دور کے اثرات موجود تھے، اگرچہ ان کا دمِ واپسیں تھا، اور حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۰۸-۱۳۱۳ھ) جیسے بزرگ جنھوں نے دونوں دَور اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، اپنے زمانہ کی دینی ویرانی پر حسرت کرتے تھے اور بڑے درد سے فرماتے تھے۔ ع

جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

لیکن اگرچہ بادِ خزاں چلنے لگی تھی مگر خزاں کا دَور دَورہ نہیں ہوا تھا، خدا طلبی کا ذوق موجود تھا،

---

[1] منظورۃ السعداء از مولوی سید جعفر علی نقوی (م ۱۲۸۸ھ)

اہل اللہ سے تعلق اور اصلاح و تربیت زندگی کا ایک ضروری شعبہ سمجھا جاتا تھا، اہلِ علم و اہلِ دین کو چھوڑ کر عام کاروباری مسلمان اور دنیادار امراء بھی اس خیال سے خالی اور اس شوق سے محروم نہ تھے، بڑے بڑے مرکزی شہروں کو چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے قصبات اور گاؤں بھی مردانِ خدا سے معمور تھے، خدا کی طرف بلانے والے اور اللہ کا نام سکھانے والے مسلمانوں کی آبادیوں اور شہروں قصبوں اور دیہاتوں میں اس طرح تسلسل کے ساتھ پائے جاتے تھے کہ مشکل سے کوئی گوشہ ان کے وجود سے خالی ہوگا، آج سے تیس چالیس برس پہلے کے ہندوستان پر نظر ڈالئے یا معمر بزرگوں سے سنئے ملک کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک چراغوں کی ایک قطار نظر آئے گی۔

رفتہ رفتہ یہ چراغِ سحر ایک ایک کر کے بجھنے شروع ہوئے، دیئے سے دیا جلنا تو عرصہ سے موقوف ہوگیا تھا، یہ رہے سہے دیئے بھی گل ہوگئے، موسم نے رفتہ رفتہ پورا اثر کیا، فصل خزاں میں درختوں کو ہلاتے اور سوکھے پتے گراتے کس نے دیکھا ہے لیکن موسم اور ہوا کی تاثیر ہے کہ پتے اور پھول سوکھ سوکھ کر خود جھڑ جاتے ہیں، انگریزی عملداری کی طرف سے کبھی یہ اعلان نہیں ہوا کہ خانقاہیں بند کردی جائیں اور اصلاح و ارشاد کی بساط نہ کردی جائے اس کے برعکس اس زمانہ میں سفر کی بڑی سہولتیں پیدا ہوگئیں اور دور دراز کے مقامات پر پہونچنا پہلے سے بہت آسان ہوگیا، مگر دلوں سے وہ طلب اور شوق ہی نکل گیا جو سمرقند و بخارا سے طالبین کو پیادہ پا دلی لایا کرتا تھا، اس نے اس درخت پر تیشہ کبھی نہیں چلایا اور اس کو کبھی آگ نہیں دی، مگر جڑ کو پانی نہ پہونچنے اور موافق ہوا اور فضا نہ پانے کی وجہ سے اس کی شاخیں خود سوکھتی چلی جارہی ہیں اور پھلنا پھولنا اس نے عرصہ سے چھوڑ دیا ہے۔

زندگی میں خدا طلبی کا کوئی خانہ اور چھوٹے سے چھوٹا گوشہ بھی نہیں رہا، قلب و روح کی جگہ بھی معدہ اور شکم نے پُر کردی، زندگی کی تمام بلند اور لطیف حقیقتیں اوجھل ہوگئیں اب مدت سے

ہاتفِ غیب کی زبان پر ہے ؎

نہ ڈھونڈھ اہلِ دل کو اب کہ جوشِ قلزمِ فنا
متاعِ درد جن میں تھی وہ کشتیاں ڈبو چکا

دنیا طلبی کا بحران

خدا طلبی کے بجائے اب یہ دنیا طلبی کا دور ہے، اور اس سے کہیں زیادہ زور شور کے ساتھ آیا ہے، اس مغربی تہذیب و اقتدار کے دور میں دنیا طلبی اور شکم پری کا جو طوفان آیا ہے، اس کے لئے بحران و ہذیان سے کم الفاظ کفایت نہیں کرتے، مال و دولت کی ایک نہ مٹنے والی بھوک اور ایک نہ بجھنے والی پیاس ہے جس کو جوع البقر کہئے یا استسقا کا مرض، ہر طرف "ھل من مزید" کی صدا بلند ہے، زندگی کی ہوس اتنی بڑھ گئی ہے، اور معیار اتنا بلند ہو گیا ہے کہ مسافرِ طمع کو کسی منزل پر قرار اور طائرِ حرص کا کسی بام بلند پر بھی آشیانہ نہیں، دولت اور عزت وجاہ کی کوئی بڑی سی بڑی تعداد اور اونچی سی اونچی سطح تشفی کے لئے کافی نہیں۔

مغربی تہذیب و اقتدار کے اس دور میں درحقیقت نہ علم کا حقیقی ذوق ہے نہ دین کا، نہ کوئی اور ذوق لطیف کام کر رہا ہے، بالشت بھر پیٹ نے زندگی کی ساری وسعت گھیر لی ہے، عالمِ خیال میں کتابیں تصنیف کرنے والے، خوش فکر مصنفین جو چاہیں لکھیں، عملی زندگی میں اس وقت صرف ایک قوتِ محرکہ اور ایک زندہ حقیقت پائی جاتی ہے اور وہ پیٹ ہے یا جیب ہے۔

مسٹر جوڈ کا قول صرف یورپ ہی کے متعلق صحیح نہیں ہے بلکہ ساری مغرب زدہ دنیا کے متعلق صحیح ہے:۔

"جو نظریۂ حیات اس زمانہ پر مستولی اور غالب ہے وہ اقتصادی نظریہ اور ہر مسئلہ

اور معاملہ کو پیٹ یا جیب کے نقطۂ نظر سے دیکھنا اور جانچنا ہے؟

کسی زمانہ کے ذوق اور رجحانِ عام اور حقیقی مسئلہ زندگی کا صحیح اندازہ ان کتابوں سے نہیں ہوتا جو اس زمانہ میں تصنیف کی جاتی ہیں (اگرچہ عام ذوق و رجحان کے اثرات سے کتابیں بھی محفوظ نہیں ہوتیں اور وہ کئی کئی پردوں سے بھی جھلکتا ہے) لیکن بعض اوقات یہ مصنفین اپنے انفرادی ذوق یا قوم کی کسی مختصر جماعت کے رجحان کے نمائندے ہوتے ہیں اور بعض اوقات واقعات کے بجائے اپنی خواہشات کو واقعات کے طور پر پیش کرتے ہیں، زمانہ کے ذوق اور رجحان کا حقیقی اندازہ روزمرہ کی زندگی، بے تکلف گفتگو، مجالس کے موضوعِ سخن اور لوگوں سے ملنے کے بعد ہوتا ہے بقول اکبر مرحوم ؎

نقشوں کو تم نہ جانچو لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

اس اصول پر ریل کے طویل سفروں میں صبح و شام کی سیر میں، چائے اور کھانے کی میز پر، پارک اور سیرگاہوں کے سبزہ اور نشستوں پر، احباب و رفقاء کی بے تکلف گفتگو کے موقع پر کان لگا کر سنئے کیا موضوع ہے؟

تنخواہوں کی کمی بیشی، افسروں کی رضامندی و نارضامندی، حکام کا تبادلہ اور ان کے مزاج و معاملہ پر تنقید، تجارتوں کا منافع، ٹھیکیداروں کے امکانات، بینکوں کے حسابات، شرح سود، کمپنیوں کے حصص، انشورنس کمپنی پالیسی، پنشن اور پراویڈنٹ فنڈ، سبکدوشی کے بعد ملازمت کے امکانات، فتوحات کے واقعات، خوش قسمتوں پر رشک، بدقسمتوں پر تأسف، اور اسی قبیل کی باتوں کے سوا آپ کوشش کے باوجود بھی کوئی موضوع گفتگو نہیں پائیں گے۔

یا پھر سیاسی حالات اور ان پر تبصرہ لیکن کسی اخلاقی نقطۂ نظر سے نہیں کبھی نظامِ فاسد پر

اخلاقی تنقید اور کسی نظام صالح کی تمنا کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔

مغربی اس بارہ میں امام ہے اور ہندوستان کے ہندو اس "معاشی ہمہ اوست" میں اس کے قدم بہ قدم اور افسوس ہے کہ مسلمان بھی اب اس کے نقش قدم پر ہے۔

اخلاقی تغیر و زوال

مشرق میں جب اول مغربی تاجر پھر فاتح آئے ہیں تو یہاں عرصہ سے اخلاقی انحطاط شروع ہو چکا تھا، مشرقی اور اسلامی تہذیب کی خصوصیات یا تو روبہ تنزل تھیں یا ان میں افراط و تفریط اور تحریف شروع ہو چکی تھیں، لیکن پھر بھی بعض ایسے اخلاقی خصائص پائے جاتے تھے، اور اس میں ایسی ترقی ہو چکی تھی جس کا تصور بھی اس زمانہ میں مشکل ہے، مشرقیوں نے بعض اخلاق و خصائل کو ترقی دیتے دیتے ایک مستقل فن بنا دیا تھا، اور اس میں ایسی نزاکت و نفاست پیدا کی تھی جو مغرب میں صرف ادب و شاعری اور فنون لطیفہ کا حصہ ہے۔

اسلامی مشرق میں افرادِ معاشرہ کے باہمی تعلقات اتنے مستحکم دیرپا اور عمیق تھے، جو اس زمانہ کے تصور سے بالاتر ہیں، اولاد کی محبت والدین کے ساتھ، والدین کی شفقت اولاد کے ساتھ، خورد کی تعظیم بزرگ کے لئے، بزرگ کی تواضع و شفقت، عورت کی عفت مآبی ازدواجی وفاداری، ملازم کی نمک حلالی اور امانت داری، نوجوانوں کی اخلاقی استقامت، شرفا کا معاملہ وسلوک، تعلقات و ملاقات، اوقات و معمولات، لباس و معاشرت میں کامل یکسانی اور وضعداری، دشمنوں کے لئے ایثار و قربانی اور ہمدردی اس میں سے ہر ایک ایسا وسیع عنوان ہے، جس کے ماتحت ایسے واقعات ہیں جن کو زیادہ زمانہ گزر جانے کے بعد آسانی سے باور نہیں کیا جائے گا لیکن ابھی ان کے باور کرنے کے اسباب و قرائن موجود ہیں۔

اولاد کی اطاعت وسعادت مندی اسلامی مشرق میں ابھی کچھ عرصہ پہلے تک (اور شاید کہیں کہیں اب بھی) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی پوری تعمیل تھی جو آپ نے ایک شخص سے فرمایا تھا کہ "انت و مالك لأبيك" (تم اور تمہاری ملکیت و دولت سب تمہارے باپ کی ہے)

والدین کی محبت اور ادائے حقوق کا جذبہ ان کی ذات اور ان کی زندگی تک محدود نہ تھا ان کے بعد بھی اس کا سلسلہ جاری رہتا تھا، ان کے دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ سلوک و اعانت تحائف و ہدایہ کے ذریعہ اظہارِ محبت و تعلق، سعادت مند اولاد کے گویا اخلاقی فرائض اور سعادت مندی کے لوازم میں سے تھا، اور یہ بھی دراصل نبوت کی اس اعلیٰ اخلاقی تعلیم کا نتیجہ اور پرتو تھا کہ "من أبر البر صلة الرجل اهل ود أبيه بعد ان يولي"[1] (سب سے بڑی نیکیوں میں سے ایک نیکی انسان کا اپنے والد کے دوستوں کے ساتھ اس کے انتقال کے بعد حسن سلوک ہے۔)

والدین کا تعلق اولاد کے ساتھ صحیح خیر خواہی اور مشرقی ایثار و قربانی کا نمونہ ہوتا تھا وہ اس کے لئے اپنے لذائذ، خواہشات اور راحت قربان کرتے تھے، اور اس کی صحیح تعلیم و تربیت اپنا اصلی فرض سمجھتے تھے، اور اس کی تعلیم اخلاقی تنبیہ اور استادوں کی سرزنش و تادیب کے موقع پر اپنا دل پتھر کا بنا لیتے تھے، ایسے موقع پر بچہ کی جانبداری اور استاد کے فعل سے آزردگی معیار شرافت سے بہت گری ہوئی بات سمجھی جاتی تھی جس کے لئے کوئی شریف باپ تیار نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ غیر تعلیم یافتہ والدین بھی بعض اوقات استاد کی زیادتی پر استادوں ہی کی تائید اور بچہ ہی کو زجر و تنبیہ کرتے تھے، یہ فقرہ عام طور پر والدین کی زبان زد تھا کہ "استاد کا حق باپ سے زیادہ ہے"۔

اسلامی معاشرے میں بڑے اور چھوٹے کا تعلق "من لم يرحم صغيرنا ولم يوقر كبيرنا فليس منا" (جو اپنے خورد پر شفقت نہ کرے اور جماعت کے بزرگ کی توقیر نہ کرے وہ ہماری جماعت میں سے

---

[1] صحیح مسلم

نہیں ہے) کی تصویر تھی۔

مشرقی اخلاق وتہذیب کا جوہر وضعداری واستقامت اور زندگی کی یکسانی ہے اس پچھلے دور میں اس بر سر تنزل سوسائٹی میں بھی اس بارہ میں عجیب وغریب مثالیں ملتی ہیں جو شخص جو کام شروع کر دیتا تھا، برسوں کرتا رہتا تھا، جو معمول مقرر کر لیتا تھا، اس میں موسم کے تغیرات، صحت کے اتار چڑھاؤ اور معمولی سوانح اور کسلمندی سے فرق نہیں آنے دیتا تھا جس سے جس طرح معاملہ شروع کر دیتا تھا، آخر دم تک نباہتا تھا، خواہ اس پر کچھ بن جائے اور حالات میں کچھ بھی تغیر ہو جائے۔

اس دور میں خاندانی اور قبائلی زندگی میں فرد کی عزت وتوقیر کا معیار اور تعلقات کی وابستگی کی شرط تنہا دولت وتمول نہ تھی، ایک خاندان میں مختلف افراد خاندان مختلف معاشی سطح کے ہوتے، کوئی دولت مند ہوتا، کوئی تنگدست وپریشان حال لیکن خاندانی اجتماعات ومجالس میں یہ مجال نہ تھی کہ مالی حیثیتوں کے فرق کی بنا پر ایک خاندان کے لوگوں کے درمیان تفریق یا مختلف معاملہ کیا جاتا اگر کبھی ایسی غلطی ہو جاتی تو اس پر سارا خاندان احتجاج اور بعض اوقات مقاطعہ کرتا، ایک تنگدست شریف زادہ دوسرے مرفہ الحال بھائی سے آنکھیں چار کر کے باتیں کرتا اور وہ اس کے علوئے خاندانی جوہر شرافت یا لیاقت یا قرابت کی بنا پر مساویانہ سلوک کرتا، اس میں بھی بڑا اہتمام تھا کہ غربت وعسرت کا اظہار قریب ترین متعلقین کے سوا کسی پر نہ ہونے پائے۔

اسلامی ماحول کے دور آخر تک شریف وبا اصول انسان کا ضمیر اس کی عزت وآبرو اور مذہبی عقیدہ کی طرح ایک ایسی ناقابل فروخت چیز سمجھی جاتی تھی جس کا دنیا میں سودا نہیں ہو سکتا تھا اور جو بڑی سے بڑی قیمت پر فروخت نہیں کیا جاتا تھا ۱۸۵۷ء کے آگے پیچھے مسلمان شرفا کی متعدد نظیریں ملیں گی کہ انھوں نے اپنا خون گوارا کیا لیکن ضمیر کا خون کرنا پسند نہیں کیا اور اس لئے گولی کھائی یا پھانسی پر چڑھے کہ جھوٹ بولنا منظور نہ تھا، اور جان بخشی کے لئے ضروری تھا کہ وہ جھوٹ بول کر اپنی صفائی

پیش کریں، اور ہنگامہ میں شرکت سے انکار کریں، جو ان کے نزدیک خلاف واقعہ اور خلاف ضمیر بات تھی۔

قومی و ملی باتوں میں بھی وہ اس طرح سچے ثابت ہوتے تھے جس طرح شخصی و خاندانی معاملات میں، قومی عصبیت و جانبداری کی وہ ہوا جو مغربی قوم پرستی کے دور میں چلی ہے اس وقت تک نہیں چلی تھی، وہ قوم کے معاملات میں بھی جھوٹ بولنا، جھوٹی شہادت دینا، اسی طرح گناہ سمجھتے تھے جس طرح اپنے ذاتی معاملات میں، احکام شریعت کو وہ شخصی اور قومی تمام امور و مسائل کے لئے عام سمجھتے تھے، اور قرآن مجید کی حسب ذیل ہدایات ان کے پیش نظر تھیں:۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ۔ (النساء۔۱۳۵)	اے ایمان والو انصاف کے علمبردار اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو خواہ تمہیں گواہی خود اپنے خلاف اور اپنے والدین اور اعزا کے خلاف دینی پڑے۔
وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ (المائدہ۔۸)	کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اس کے معاملہ میں انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو، انصاف سے کام لو یہ خدا ترسی سے زیادہ قریب ہے اور اللہ کا لحاظ کرو۔
وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ (سورۃ النساء۔۵۸)	جب لوگوں کے درمیان حَکَم اور ثالث بنو تو عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔
وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی ج (الانعام۔۱۵۲)	جب بات کہو انصاف سے کہو چاہے کسی قرابت دار کے خلاف پڑے۔

انگریزی عملداری کی ابتدا کا واقعہ ہے کہ ضلع مظفر نگر کے قصبہ کاندھلہ میں ایک جگہ پر

ہندو مسلمانوں کا تنازعہ ہوا کہ یہ ہندوؤں کا معبد ہے یا مسلمانوں کی مسجد، انگریز مجسٹریٹ نے فریقین کے بیانات سننے کے بعد مسلمانوں سے تخلیہ میں پوچھا کہ کیا ہندوؤں میں کوئی ایسا شخص ہے جس کی صداقت پر آپ اعتماد کر سکتے ہیں، اور جس کی شہادت پر فیصلہ کر دیا جائے؟ انھوں نے کہا کہ ہمارے علم میں کوئی ایسا شخص نہیں، ہندوؤں سے پوچھا تو انھوں نے کہا یہ بڑی آزمائش کا موقع ہے، معاملہ قومی ہے لیکن پھر بھی ایک مسلمان بزرگ ہیں جو کبھی جھوٹ نہیں بولتے، شاید وہ اس موقع پر بھی سچی ہی بات کہیں، یہ بزرگ مفتی الٰہی بخش صاحبؒ (تلمیذ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ خلیفہ حضرت سید احمد شہیدؒ) کے خاندان کے ایک بزرگ تھے، مجسٹریٹ نے ان کے پاس چپراسی بھیج کر عدالت میں طلب کیا، انھوں نے فرمایا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ فرنگی کا کبھی منہ نہیں دیکھوں گا، مجسٹریٹ نے کہلوایا کہ آپ میرا منہ نہ دیکھیں لیکن تشریف لے آئیں، معاملہ اہم ہے اور آپ کے یہاں تشریف لائے بغیر فیصلہ نہیں ہو سکتا وہ بزرگ تشریف لائے اور پیٹھ پھیر کر کھڑے ہو گئے، معاملہ ان کی خدمت میں عرض کیا گیا، اور دریافت کیا گیا کہ آپ کا اس بارہ میں کیا علم ہے؟ ہندوؤں اور مسلمانوں کی نگاہیں ان کے چہرے پر ہیں اور کان ان کے جواب پر لگے ہوئے تھے، جن پر اس اہم قومی معاملہ کا فیصلہ ہوتا تھا، ان بزرگ نے فرمایا کہ صحیح بات تو یہ ہے کہ جگہ ہندوؤں کی ہے مسلمانوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں، عدالت کا فیصلہ ہو گیا، جگہ ہندوؤں کو مل گئی، مسلمان مقدمہ ہار گئے، لیکن اسلام کی اخلاقی فتح ہوئی، صداقت اور اسلامی اخلاق کے ایک مظاہرہ نے چند گز زمین کھو کر بہت سے غیر مسلم انسانوں کے ضمیر اور دل و دماغ جیت لئے، بہت سے ہندو اسی روز ان کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔

ضمیر کے علاوہ علم و دانش اور دماغی قوت و ذہانت بھی ایک ایسی مقدس اور قیمتی چیز سمجھی جاتی تھی جس کو ہر کس و ناکس کے ہاتھ اونے پونے فروخت نہیں کیا جاتا تھا، جو لوگ اس بارہ میں بلند مقام پر تھے وہ تو کسی قیمت پر بھی ان کو فروخت کرنا پسند نہیں کرتے تھے، اور اس کو اللہ کا

بیش قیمت عطیہ اور امانت سمجھتے تھے خصوصاً کفر و فسق کی بلا واسطہ یا بالواسطہ اعانت و تقویت میں اس کو صرف کرنا یا کسی غلط نظام کا آلہ کار بننا تو بہت بڑی خیانت اور دین فروشی سمجھتے تھے۔

اسی ذہنیت اور سیرت کے ایک بزرگ مولانا عبدالرحیم صاحب رامپوری (م ۱۲۴۳ھ) تھے روہیلکھنڈ کے انگریز حاکم مسٹر ہاکنس نے ان کو بریلی کالج کی تدریس کے لئے ڈھائی سو روپیہ [۲۵۰] مشاہرہ کی (جو ۱۸۵۷ء سے پہلے حیثیت وہ رکھتا تھا، جو اس وقت ہزار بارہ سو [۱۲] کی بھی نہیں ہے) پیشکش کی اور وعدہ کیا کہ تھوڑی مدت میں اس مشاہرہ میں اضافہ اور ترقی ہو جائے گی، انھوں نے عذر کیا کہ ریاست سے ان کو دس [۱۰] روپے ماہوار ملتے ہیں وہ بند ہو جائیں گے، ہاکنس نے کہا کہ میں تو اس وظیفہ سے پچیس گنا زیادہ پیش کرتا ہوں اس کے مقابلہ میں اس حقیر رقم کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے، انھوں نے اس کے بعد یہ عذر کیا کہ میرے گھر میں بیری کا ایک درخت ہے اس کی بیری میٹھی اور مجھے مرغوب ہے، بریلی میں وہ بیری کھانے کو نہیں ملے گی، ظاہر ہیں انگریز اب بھی ان کے دل کی بات نہیں پا سکا، اس نے کہا کہ رام پور سے آنے کا انتظام ہو سکتا ہے، آپ بریلی میں بیٹھے ہوئے بھی اپنے گھر کی بیری کھا سکتے ہیں، مولانا نے فرمایا ایک بات یہ بھی ہے کہ میرے طالب علم جو رامپور میں درس لیتے ہیں ان کا درس بند ہو جائے گا اور میں ان کی خدمت سے محروم رہ جاؤں گا، انگریزی منطق نے اب بھی ہار نہیں مانی، اس نے کہا کہ میں ان کے وظائف مقرر کرتا ہوں وہ بریلی میں آپ سے اپنی تعلیم جاری رکھیں اور اپنی تکمیل کریں، آخر اس سلمان عالم نے اپنی کمان کا آخری تیر چھوڑا جس کا انگریز کے پاس کوئی جواب نہ تھا، مولانا نے فرمایا کہ یہ سب صحیح ہے تعلیم پر اُجرت لینے کے متعلق میں قیامت میں اللہ کو کیا جواب دوں گا، ہندوستان کے فاتح نے اب اپنی شکست تسلیم کر لی اور مولانا عبدالرحیم صاحب نے نواب احمد علی خاں والیٔ رامپور کے دس [۱۰] روپیہ ماہوار پر اپنی زندگی گزار دی۔ رحمۃ اللہ علیہ[۱]

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۱

اس اخلاقی بلندی اور کردار کا مقابلہ اس زمانہ کی دانش فروشی سے کیجئے اس زمانہ کے اہل دانش نے اپنے علم، لیاقت اور ذہانت کو نیلام پر چڑھا رکھا ہے کہ جو زیادہ بولی بولے گا اس کے ہاتھ فروخت کردیں گے، اگر کوئی اسلامی ادارہ سو دے رہا ہے اور کسی نصرانی ادارے نے ایک سو پانچ لگائے تو اس کی طرف منتقل ہو گئے اور اگر کوئی یہودی اسٹیٹ قائم ہو جائے اور وہ پانچ بڑھا کر بول دے تو اس کے ہاتھ بک جائیں گے، مناسبتِ موضوع اور ذوق کی بھی کوئی شرط اگر حالات اجازت دیں تو محکمۂ تعلیم کا آدمی برائے نام ترقی پر پولیس کے محکمہ یا جہاز رانی کے صیغہ کی طرف بخوشی منتقل ہو سکتا ہے ایک فاضل جس نے کسی علمی مقالہ پر ڈاکٹریٹ حاصل کیا اور جو تحقیقی مقالے لکھا کرتا تھا، آپ اس کے متعلق سن سکتے ہیں کہ نہایت معمولی اضافہ کی بنا پر وہ کسی ایسے فوجی یا سیاسی محکمہ کی طرف منتقل ہو گیا ہے جس سے اس کو کوئی ذہنی اور علمی مناسبت نہیں۔

آج کسی انشا پرداز کو اس میں ذرا تکلف نہیں ہوتا کہ وہ ایک ہی قلم سے ایک مجاہد اعظم کی سیرت لکھے پھر اسی قلم سے کسی قوم فروش کی منقبت لکھے۔

بعض شائقینِ کتب جب کوئی نادر بیش قیمت کتاب خریدتے تھے تو وجد و سرور میں آکر یہ شعر پڑھتے تھے، برائے نام ترمیم کے ساتھ یہ شعر اب بھی پڑھا جا سکتا ہے ؎

جمادے چند دادم جاں خریدم

بحمد اللہ عجب ارزاں خریدم

اور "جان" کے بجائے اگر "ایمان" پڑھا جائے تو بھی واقعہ کے لحاظ سے کیا غلط ہے۔!

روابط و تعلقات اور حقوق باہمی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان کی بنیاد عام حالات میں اکثر غیر مادی اور خالص عقلی و روحانی یا قلبی ہوتی تھی اور ان میں خود غرضی اور نفسانیت کا شائبہ کم سے کم ہوتا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ بعض ایسے تعلقات اور روابط پائے جاتے تھے اور ان کی

جڑیں قلب و دماغ میں اتنی گہری ہوتی تھیں جن کی کوئی مادی اور تاجرانہ توجیہ ممکن نہیں استاد و شاگرد کا ایسا تعلق تھا جس کے سامنے اس زمانہ میں باپ بیٹے اور محب و محبوب کا تعلق گرد ہے عصر جدید کا ذہن شاید اس پر ہمیشہ حیرت کرے کہ ہندوستان کے مشہور عالم اور جہاں استاد ملا نظام الدین لکھنوی (۱۱۶۱ھ) صاحب درس نظامی کی خبر وفات سن کر ان کے ایک شاگرد سید کمال الدین عظیم آبادی کا صدمہ سے انتقال ہو گیا اور دوسرے شاگرد سید ظریف عظیم آبادی کے روتے روتے آنکھیں خراب ہو گئیں بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی[1]۔

یورپ میں لذتیت اور افادیت کے دو[2] اخلاقی فلسفے اور مکتب خیال پھلتے پھولتے رہے ہیں، مشرقی اور اسلامی اخلاقیت پر دونوں اثر انداز ہیں، مشرق کا اسلامی فلسفۂ اخلاق دونوں سے بہت بلند ہے، غرض اور نفسانیت، حظ نفس اور انتفاع کے خیال سے بھی پاک ہے۔

سترہویں صدی عیسوی سے افادیت کا غلبہ ہوتا گیا، مغرب کے علمائے اخلاق نے ڈنکے کی چوٹ پر کہنا شروع کیا کہ اخلاق میں سے جس چیز کا فائدہ ظاہر نہ ہو وہ قابل اعتنا نہیں ہے لیکن اس فائدہ کی تشخیص و تعیّن کے لئے جو ذہن میزان کا کام دیتا افسوس ہے کہ وہ برابر مادہ پرستانہ بنتا جا رہا تھا اس کی ساخت اور افتاد روز بروز ایسی ہوتی جا رہی تھی کہ کسی غیر مادی نفع کے تصور سے وہ قاصر تھا، اور اس بارہ میں اس کی حس اور ذکاوت محدود اور معین تھی نتیجہ یہ تھا کہ اخلاق کی تحدید و تصریف افادہ و انتفاع سے کی گئی یہ نازک کام جس حکم و ثالث کے سپرد ہوا وہ اپنی طبعی افتاد و مزاج کی وجہ سے کسی غیر مادی نفع کے تسلیم کرنے کے قابل ہی نہ تھا، اسی طرح انتفاع کی تحدید قدرتی اور غیر شعوری طور پر مادی ہو گئی، اور عملاً فلسفۂ اخلاق کا کسی ایسی چیز سے سروکار نہ رہا جس کا کوئی مادی و محسوس نفع نہ ہو رفتہ رفتہ یہ مادی ذہنیت اور افادیت ساری زندگی پر چھا گئی۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ بحوالہ رسالۂ قطبیہ۔

یورپ کے ادبیات میں پچھلی صدیوں میں جن الفاظ کا استعمال سب سے زیادہ ہوا ہے اور جو الفاظ یورپ کے لئے آج بھی سب سے زیادہ کشش رکھتے ہیں ان میں ایک لفظ "فطرت" بھی ہے لیکن جن چیزوں کے مقابلہ میں جن مواقع پر یہ لفظ بولا جاتا ہے ان سے صاف تعین ہوتا ہے کہ "فطرت" سے مراد فطرتِ حیوانی ہے جو ہر قسم کے لطیف احساسات اخلاقی ضمیر اور قلب سلیم اور عقل سلیم دونوں سے آزاد ہوتی ہے ہر قسم کی پابندیوں اور حدود سے گھبراتی ہے جس کا تقاضا صرف یہ ہے کہ کھائیے پیجئے اور آزاد رہیئے اس کے لئے حقوق و مطالبات اور انسانی ذمہ داریاں نہیں ہیں انیسویں صدی میں انسان کی اصل قدیم کے متعلق جو تحقیق کی گئی اور جس کو عام طور پر تسلیم کیا گیا وہ ہر شعبۂ زندگی میں اثر انداز ہوئی اخلاق پر بھی اس کا محسوس و غیر محسوس اثر پڑا۔[۱]

اس کے بعد اب اس دور میں یورپ میں میکانکی عہد شروع ہوا، انسان کا تصور خالص جماداتی ہوگیا اور وہ تھوڑی سی لچک اور زندگی بھی جاتی رہی جو حیوانی تصور میں پائی جاتی ہے۔

مسلمان یورپین محمد اسد صاحب نے یورپ کے اس اخلاقی تغیر پر گہرا اور سنجیدہ تبصرہ کیا ہے اگر مغرب کا ذہنی و سیاسی اقتدار مشرق پر اسی طرح قائم رہا اور خود یورپ میں کوئی بڑا انقلاب نہ آیا تو آج مغرب کے متعلق جو کچھ کہا جا رہا ہے کل مشرق کے متعلق بھی وہی صحیح ہوگا اور اس کے آثار ابھی سے نظر آ رہے ہیں ہر شعبۂ زندگی کی طرح مشرقی اخلاق جدید مغربی سانچہ میں ڈھلتے جا رہے ہیں جو حلقے مغربی تعلیم و تہذیب سے پورے طور پر متاثر ہیں ان کے اخلاق مغربی فلسفۂ اخلاق کا اعلیٰ نمونہ ہیں محمد اسد صاحب لکھتے ہیں:۔

("یورپ میں) انسانوں کی ایک ایسی قطع پیدا ہو گئی ہے جس کی اخلاقیت عملی افادیت کے سوال کے اندر محصور ہے اور جس کے نزدیک خیر و شر کا بلند ترین معیار مادی کامیابی ہے"

---

[۱] ملاحظہ ہو عنوان "ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کا اثر"

مغرب کی معاشرتی زندگی موجودہ زمانہ میں جس گہری تبدیلی سے گزر رہی ہے اس میں نئی اخلاقی افادیت روز بروز زیادہ سے زیادہ نمایاں ہوتی جا رہی ہے، وہ تمام محاسن جو سوسائٹی کے مادی مفاد پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں، مثلاً صنعتی قابلیت، وطن پرستی، قوم پرستانہ احساس جماعت ان کی عظمت بڑھتی جا رہی ہے اور ان کی قیمت میں بعض اوقات غیر معقول طریقہ پر مبالغہ کیا جاتا ہے، اس کے مقابل میں وہ محاسن جن کی ابھی تک محض اخلاقی حیثیت سے قیمت تھی، مثلاً محبت پدری یا ازدواجی وفاداری وہ بڑی سُرعت کے ساتھ اپنی اہمیت کھو رہے ہیں، اس لئے کہ وہ سوسائٹی کو کوئی نمایاں مادی فائدہ نہیں پہنچاتے اس زمانہ کی جگہ جس میں خاندانی روابط کا استحکام ہی خاندان اور قبیلہ کی خیر و فلاح کے لئے ضروری تصور کیا جاتا تھا، مغرب جدید میں اس زمانہ نے لے لی ہے، جو وسیع تر عنوانات کے تحت اجتماعی تنظیم کرتا ہے، ایک ایسی سوسائٹی میں جو بنیادی طور پر صنعتی ہے اور جس کی تنظیم بڑی تیز رفتاری کے ساتھ خالص میکانکی خطوط پر کی جا رہی ہے ایک فرد کا برتاؤ اپنے والد کے ساتھ کوئی معاشرتی اہمیت نہیں رکھتا جب تک کہ یہ افراد اس عام معیار شرافت کے حدود کے اندر ایک دوسرے سے برتاؤ کرتے ہیں جو سوسائٹی نے افراد کے باہمی برتاؤ کے لئے مقرر کر دیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ میں باپ کا اقتدار اپنے بیٹے پر برابر کم ہوتا جا رہا ہے اور بیٹے کے دل میں اپنے باپ کی طرف سے عزت و احترام کا جذبہ روبہ زوال ہے، ان دونوں کے باہمی تعلقات تیزی کے ساتھ قابو سے باہر ہوتے جاتے ہیں اور عملاً ایک ایسی مشینی سوسائٹی کے ذریعہ ان تعلقات کا خون ہو رہا ہے جس میں افراد کے باہمی حقوق کے منسوخ کر دینے کا رجحان پایا جاتا ہے اور جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ خاندانی

رشتہ داری کے پیدا کئے ہوئے حقوق بھی ختم ہوتے جاتے ہیں۔[ا]

پست ہمتی و تن آسانی

اسلامی مشرق میں انسان کی ترقی اور کمال کا معیار بہت بلند تھا، اس کے لئے دین و دنیا اور علم و عمل کی جامعیت بہت سے متفرق انسانی صفات سے اتصاف اور انسانی کمالات بہت سے ایسے منتشر شعبوں کا اجتماع ضروری تھا، جن میں اس زمانہ کی پست ہمتی اور کوتاہ نظری تضاد سمجھتی ہے اور کسی فرد انسان میں ان کے بیک وقت اجتماع کے تصور سے اکثر قاصر ہے، پوری دنیائے اسلام میں سے صرف ہندوستان کے مسلمان سلاطین اور ان کے امراء و وزراء کی سیرت پر ایک نظر ڈال لیجئے، آپ کو عالی ہمتی، بلند حوصلگی، کمالات و خصوصیات کے تنوع، قبائے شاہی کے اندر درویشی، مہماتِ سیاسی کے انہماک و تن دہی کے ساتھ عبادت کی مشغولیت و سرگرمی، علمی ذوق و مطالعہ کے ایسے نادر نمونے ملیں گے جن کی نظیر عام انسانی تاریخ میں ملنی آسان نہیں اور جن کی تصدیق میں اس زمانہ کا تنگ ظرف ذہن اور انسانی ترقی و کمال کا محدود تصور بار بار دقتیں محسوس کرے گا۔

سلطان شمس الدین التمش کی سلطنت کی وسعت اور اس کی ملکی سیاسی مصروفیت کا حال تاریخ ہندوستان کا ہر طالب علم جانتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اس کی انتظامی مشغولیت، شاہانہ ضروریات و مطالبات جنگوں اور سفروں کی کثرت اس کی مذہبی پابندی اور معمولات میں مطلق حارج نہ تھی، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے وصیت فرمائی تھی کہ میری نماز جنازہ وہ شخص پڑھائے جس کی کبھی عصر کی سنتیں اور تکبیرۂ اولیٰ فوت نہ ہوئی ہو، جب اس وصیت کا اعلان کیا گیا تو سلطان آگے بڑھا اور اس نے نماز پڑھائی۔

ISLAM AT THE CROSS-ROADS THE TRAGEDY OF EUROPE [ا]

سلطان غیاث الدین بلبن، ناصر الدین محمود، فیروز تغلق کی مذہبی زندگی اور مذہبی پابندی کا حال کوئی چھپا ہوا واقعہ نہیں۔

سلاطین گجرات بالخصوص دین و دنیا کی جامعیت اور "جنیدی دار دشیری" کا بہترین نمونہ تھے، محمود شاہ اول (م ۹۱۷ھ) اور اس کے بیٹے مظفر شاہ حلیم (م ۹۳۲ھ) کے حالات اس کی بہترین شہادت ہیں۔

مؤرخ ہندوستان مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب" مظفر شاہ حلیم کے حالات "تذکرہ یاد ایام" میں لکھتے ہیں:۔

"محمود شاہ کے بعد اس کا فرزند رشید نعم الخلف لنعم السلف کا صحیح مصداق مظفر شاہ حلیم تاج و سریر کا مالک ہوا، علوم و فنون میں یہ علامہ محمد ابن محمد الایجی کا شاگرد تھا اور حدیث علامہ جمال الدین محمد بن عمر بحرق سے پڑھی تھی، قرآن مجید حفظ کر لینے کا شرف ایسی عمر میں اس کو نصیب ہوا تھا جس کی نسبت شیخ سعدی فرماتے ہیں ____

___ در ایام جوانی چناں کہ افتد دانی" اس فضل و کمال کے ساتھ تقویٰ اور عزیمت کی دولت بھی اس نے خداداد پائی تھی، تمام عمر نصوص احادیث پر عمل رہا، ہمیشہ باوضو رہتا، نماز جماعت کے ساتھ پڑھتا، روزے عمر بھر نہیں چھوٹے، شراب ناب کو کبھی منہ سے نہیں لگایا، کبھی کسی پر بے جا سختی نہیں کی، بد زبانی سے اپنے منہ کو گندہ نہیں کیا، عجیب تر بات یہ ہے کہ اس پیکر تقدس میں سپہ گری اور ملک داری کی صفتیں بھی علیٰ وجہ الکمال مجتمع تھیں، مالوہ کی فتوحاتِ عظیمہ تاریخوں میں پڑھئے اور ان سے اس کے اخلاقِ فاضلہ کا اندازہ کیجئے، جس وقت محمود شاہ دوم مالوہ کی غفلت و سوءِ تدبیری سے اس کے وزیر مندلی رائے نے زمامِ حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے کر محمود شاہ کو

بے دخل کر دیا اور شعائر اسلام کو مٹا کر رسوم کفر کی ترویج شروع کر دی مظفر شاہ حلیم علیہ الرحمہ کی رگ حمیت کو جنبش ہوئی اس نے افواج قاہرہ کے ساتھ مالوہ کی جانب نہضت فرمائی اور کوچ در کوچ کرتا ہوا مانڈو پہونچا اور اس کا محاصرہ کر لیا مندلی رائے نے یہ سمجھ کر کہ وہ خود تاب مقاومت نہیں لا سکتا رانا سانگا کو بیش بہا تحائف کا لالچ دے کر اپنی مدد کے واسطے بلایا وہ ہنوز سارنگ پور تک نہیں پہونچا تھا کہ مظفر شاہ حلیم نے اس کی مدارات کے لئے اپنی فوج ظفر موج کا ایک معقول حصّہ آگے کو روانہ کر دیا جس سے رانا کو آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہو سکی، اور قبل اس کے کہ مندلی رائے کو اطراف و جوانب سے کمک پہونچے قلعہ کو مسخر کر لیا۔

جانِ سخن یہ ہے کہ تسخیر قلعہ کے بعد جس وقت مظفر شاہ حلیم اندر داخل ہوا اور امراء ہم رکاب نے شاہانِ مالوہ کے سامان تجمّل اور خزائن و دفائن کو ملاحظہ کیا اور اس ملک کی سرسبزی و شادابی کی اطلاع پائی تو انھوں نے جسارت کر کے مظفر شاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس جنگ میں تقریباً دو ہزار سوار جرّار درجہ شہادت کو پہونچ چکے ہیں، یہ مناسب نہیں ہے کہ اس قدر نقصان اٹھانے کے بعد پھر ملک کو اسی بادشاہ کے حوالے کر دیا جائے جس کی سوءِ تدبیر سے مندلی رائے نے اس پر قابو پایا تھا بادشاہ نے یہ سنتے ہی سیر موقوف کی اور قلعہ سے باہر نکل کر محمود شاہ کو ہدایت فرمائی کہ اس کے ہم رکاب لوگوں میں سے کسی کو قلعہ کے اندر نہ جانے دے محمود نے باصرار تمام اس بات کی التجا کی کہ بادشاہ چند روز قلعہ کے اندر آرام فرمائیں، مگر مظفر شاہ نے اس التجا کو قبول نہ فرمایا اور بعد کو خود ظاہر کیا کہ میں نے یہ جہاد دعز محض خداوند برحق کی رضامندی حاصل کرنے کو کیا تھا مجھ کو امراء کی تقریر سے یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ مبادا کوئی خطرۂ فاسد

میرے دل میں پیدا ہوا اور میرا خلوصِ نیت برباد ہو جائے میں نے محمود پر کوئی احسان نہیں کیا
بلکہ محمود کا مجھ پر بڑا احسان ہے کہ اس کی وجہ سے مجھ کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔"

انتقال کے قریب علماء و ارکان دولت کی ایک مجلس میں بادشاہ نے تحدیث بالنعمۃ کے طور پر بیان کیا کہ میں خدا کے فضل و کرم سے قرآن کے حفظ کے ساتھ ہر آیت سے متعلق ضروری مسائل و احکام، اسبابِ نزول اور اصولِ تجوید کا علم رکھتا ہوں، اپنے استاد علامہ جمال الدین محمد بن عمر بحرق سے جن احادیث کی سند لی ہے، وہ مع متن و سند راویوں کے حال کے مجھے حفظ ہیں، فقہ میں مجھے بفضلہ تعالیٰ وہ درک حاصل ہے کہ حدیث "من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین" (جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اس کو دین کا فقیہ بنا دیتا ہے) کا مصداق بننے کی امید رکھتا ہوں، اور اب چند مہینوں سے حضرات صوفیہ و مشائخ کے طریق پر تزکیۂ نفس میں مشغول ہوں اور "من تشبہ بقوم فھو منھم" کی بنا پر ان کے برکات کی امید رکھتا ہوں، تفسیر معالم التنزیل[1] ایک بار ختم کر چکا ہوں دوبارہ پھر شروع کی ہے نصف تک پہنچ گیا ہوں باقی امید ہے کہ انشاء اللہ جنت میں ختم کروں گا۔

جمعہ کی نماز کے قریب احتضار کی کیفیت شروع ہوئی، لوگوں کو حکم دیا کہ نماز پڑھنے جائیں خود ظہر کی نماز پڑھی اور کہا کہ ظہر کی نماز میں نے تمہارے یہاں پڑھی ہے، عصر کی نماز انشاء اللہ جنت میں پڑھوں گا انتقال کے وقت حضرت یوسفؑ کی یہ دعا زبان پر تھی جو اس درویش بادشاہ کے بالکل حسب حال تھی:۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ	پروردگار تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور
وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ	باتوں کا مطلب (ذریعہ) نکالنا تعلیم فرمایا اے آسمان

[1] علامہ بغوی کی ضخیم تفسیر جو کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۝ (یوسف - ۱۰۱)

وزمین کے بنانے والے! تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ایسا کیجیو کہ دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت میں جاؤں اور ان لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں۔

شیرشاہ سوری (م ۹۵۲ھ) کے اوقات ومعمولات کی فہرست جو مؤرخین نے تاریخ میں محفوظ کر دی ہے ملاحظہ ہو، اس زمانے میں متوسط درجہ کے مشغول انسان کے لئے بھی ان کا التزام مشکل ہے، چہ جائیکہ اس مصروف ترین بادشاہ کے لئے جس کو پانچ برس کی مدت میں ایک صدی کا کام کرنا تھا اور جس کو بظاہر اپنی انتظامی وسیاسی مشغولیت سے ایک لمحہ کی فرصت نہیں ہونی چاہئے تھی۔

"شیرشاہ تہائی رات رہتی کر بیدار ہو جاتا، غسل کرتا اور نوافل پڑھتا، نماز فجر سے پہلے اوراد ختم کر لیتا، پھر مختلف صیغوں کے حسابات دیکھتا اور دن کے اہم کاموں کے متعلق حکام و اہل کارانِ سلطنت کو ہدایت دیتا اور روزانہ کا نظامِ عمل بتلاتا تاکہ دن کو سوالات سے اس کو پریشان نہ کریں، اس سب سے فارغ ہو کر نماز فجر کے لئے وضو کرتا اور جماعت کے ساتھ نماز فجر پڑھتا، پھر اذکار و اوراد میں مشغول ہو جاتا، اتنے میں حکام سلام کے لئے حاضر ہوتے، بادشاہ نماز اشراق سے فارغ ہو کر لوگوں کی ضروریات معلوم کرتا اور گھوڑے، علاقے، جاگیریں، اور مال جس کو جیسی ضرورت ہوتی دیتا، پھر اہل مقدمہ اور دادخواہوں کی طرف متوجہ ہوتا اور ان کی دادرسی اور حاجت براری کرتا، پھر افواج شاہی اور اسلحہ کا معائنہ کرتا اور فوج کے لئے امیدواروں کی قابلیت کا اندازہ کر کے ان کے تقرر کا حکم دیتا، پھر ملک کی روزانہ آمدنی اور مالیہ کا معائنہ کرتا، پھر ارکانِ سلطنت، اُمراء اور

سلطنتوں کے سفرا اور وکلا حاضر ہوتے ان سے گفتگو کرتا، پھر حکام اور اہل کاروں کی عرضیاں گزرتیں ان کی سماعت کرتا اور حکم لکھواتا، پھر دوپہر کا کھانا تناول کرتا، علمائے و مشائخ بھی دستر خوان پر ہوتے، پھر ظہر کی نماز تک دو گھنٹے اپنے ذاتی کام انجام دیتا اور قیلولہ کرتا، پھر ظہر کی نماز جماعت سے پڑھتا، اس کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتا، اس سے فارغ ہو کر پھر امور سلطنت میں مشغول ہو جاتا، سفر و حضر میں اس نظام الاوقات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی، کہا کرتا تھا کہ بڑا آدمی وہ ہے جو اپنا پورا وقت ضروری کاموں میں صرف کرے۔"

سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے تفصیلی حالات پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ "دنیا دار" بادشاہ جو کابل و قندھار سے لے کر دکن تک حکومت کرتا تھا اور اس پوری وسیع سلطنت کی بذات خود نگرانی کرتا تھا، اپنی عالی ہمتی اور عزم کی قوت سے اتنا وقت نکال لیتا تھا کہ تمام مہمات ملکی کے ساتھ اول وقت جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا تھا، جمعہ کی نماز جامع مسجد میں ادا کرتا تھا، سنن و نوافل کی پابندی کرتا تھا، سخت گرمی میں رمضان کے پورے روزے رکھتا تھا اور رات کو تراویح پڑھتا تھا، رمضان کے عشرۂ اخیر میں مسجد میں اعتکاف کرتا تھا، دوشنبہ، پنجشنبہ اور جمعہ کو ہر ہفتہ روزہ رکھتا تھا، ہمیشہ باوضو رہتا تھا، اذکار و ادعیۂ ماثورہ کا پابند تھا، روز صبح قرآن مجید کی تلاوت کرتا تھا، اور تمام ملکی و سیاسی مشاغل اور انتشار طبیعت کے ساتھ پوری دلجمعی سے حضرت خواجہ سیف الدین (نبیرۂ حضرت مجدد الف ثانیؒ) سے ایسا استفادۂ باطنی کرتا تھا کہ وہ اپنے والد ماجد (حضرت خواجہ محمد معصومؒ) کو اس میں آثار ذکر کے ظاہر ہونے کی اطلاع دیتے ہیں، روزانہ کی مصروفیتوں کے ساتھ اتنا وقت نکال لیتا تھا کہ فتاویٰ عالمگیری کو جو اس کے حکم سے علماء ترتیب دے رہے تھے، روز کا روز سنتا تھا اور مشورہ دیتا تھا۔

عالمگیر کی تخت نشینی کا زمانہ کتنا پرآشوب اور تلاطم خیز تھا، اسی زمانہ میں اس کو سلطنت کی از سرِ نو تنظیم کرنی پڑی، اٹھے ہوئے فتنوں کو دبانا پڑا لیکن یہ عالمگیر ہی کی عزیمت تھی کہ اس زمانہ میں جب اس کو سر اٹھانے کی مہلت نہ تھی اس نے قرآن مجید حفظ کرنے کے لئے وقت نکال لیا اور اپنی کتاب "اربعین" کی (جس میں اس نے چالیس حدیثیں جمع کی تھیں) شرح لکھی، عالمگیر کا شعر ہے ؎

غمِ عالم فراواں است و من یک غنچہ دل دارم
چناں در شیشۂ ساعت کنم ریگ بیاباں را

لیکن اس نے اس "شیشۂ ساعت" میں جس طرح اس "ریگ بیاباں" کو بند کیا وہ اس کی مندرجہ بالا خصوصیات سے ظاہر ہے۔

امراء اور وزراء میں دیکھئے تو آپ کو عبدالرحیم بیرم خان خاناں جملۃ الملک سعد اللہ خاں علامی، حمید الدین محمد بن محمد الایجی، اختیار خاں، افضل خاں اور مسند عالی عبدالعزیز آصف خاں جیسے جامع کمالات بزرگ نظر آتے ہیں، ان میں سے صرف دو (عبدالرحیم خانِ خاناں اور آصف خاں) کا مختصراً تذکرہ کیا جاتا ہے۔

عبدالرحیم خاں نے درسی کتابیں مولانا محمد امین انجبانی اور قاضی نظام الدین بدخشانی سے پڑھیں اور حکیم علی گیلانی اور علامہ فتح اللہ شیرازی سے علمی استفادہ کیا، پھر جب گجرات میں قیام کا موقعہ ملا تو علامہ وجیہ الدین بن نصر اللہ گجراتی سے مزید تحصیلِ علم کی، ان اساتذۂ وقت کے علاوہ اس کا دربار اہلِ کمال اور ماہرینِ فن کا مرکز تھا، ان سے برابر علمی مذاکرہ و استفادہ جاری رہتا تھا، یہاں تک کہ تمام علوم و فنون میں تبحر پیدا کر لیا، اکثر اصنافِ علم و ادب میں ذوقِ سلیم، ناقدانہ نظر اور فیصلہ کن رائے رکھتا تھا، زباں دانی میں دیکھئے تو اس کو ہفت زبان کہنا صحیح ہوگا، عبدالرزاق خوافی "مآثر الامراء" میں لکھتا ہے کہ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں میں مہارتِ کامل

رکھتا تھا، ان سب زبانوں میں فصاحت وطلاقت سے گفتگو کرتا اور بے تکلف آبدار شعر کہتا۔

ان علمی کمالات کے ساتھ فنونِ جنگ اور سپہ گری میں یکتائے روزگار اور شجاعت و بہادری میں نامدار تھا، گجرات وسندھ اور دکن کی فتوحات اس کی شجاعت وخوش تدبیری کی یادگاریں ہیں۔

اخلاق وکرم کے لحاظ سے دیکھئے تو تمام مؤرخ اس کے حسنِ خلق، نرم خوئی، بُردباری، خاکساری اور تواضع کے ثناخواں ہیں۔

داد ودہش اور سخاوت کی حیثیت سے دیکھئے تو سید غلام علی بلگرامی شہادت دیتے ہیں کہ اگر عبدالرحیم خان خاناں کے انعامات اور صلے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھے جائیں اور تمام شاہانِ صفویہ کے انعامات اور زرپاشی ایک پلڑے پر ہو تو عبدالرحیم کا پلڑا بھاری رہے گا۔[1]

علمی ذوق ومطالعہ کے انہماک کا عالم یہ تھا کہ عین میدانِ جنگ میں گھوڑے کی پیٹھ پر کتاب کے اجزا ہاتھ میں کھلے ہوئے ہوتے نہانے کا وقت بھی کتاب سے خالی نہ ہوتا، خُدّام کتاب کھولے ہوئے سامنے کھڑے ہوتے نہانے کے ساتھ ساتھ کتاب کا مطالعہ جاری رہتا۔

دینی رجحان اور طبیعت کی صلاحیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی نگاہِ التفات اور نظرِ انتخاب سے محظوظ تھا اور اُن خوش قسمت افراد میں شامل تھا جن کو حضرت مجدد صاحب کے مکتوب الیہ اور معتمد علیہ ہونے کا شرف حاصل تھا، مجدد صاحب کے مکتوبات سے اُن کے قلبی تعلق اور گہری ارادت کا پتہ چلتا ہے۔

آصف خاں وزیر گجرات کا حال پڑھئے تو جامعیت وباکمالی کی ایک دوسری تصویر نظر آئے گی۔

عبدالعزیز نام تھا، حمید الملک کے بڑے بیٹے تھے، کچھ کتابیں والد سے پڑھیں، حدیث وفقہ قاضی برہان الدین نہروالے سے حاصل کی، علوم حکمیہ میں ابوالفضل گازرونی اور ابوالفضل استرآبادی

---

[1] خزانۂ عامرہ۔

کے شاگرد تھے، علوم و فنون کی تحصیل سے فراغت ہوئی تو دربار شاہی میں پہونچے، بہادر شاہ کے زمانہ میں وزارت ملی، محمود شاہ کے زمانہ میں وکالتِ مُطلقہ کے عہدہ پر سرفراز ہوئے باوجود ان مناصبِ جلیلہ کے درس و تدریس اور مذاکرۂ علمی کا مشغلہ آخر وقت تک قائم رہا۔

بعض سیاسی انقلابات کی وجہ سے ایک عرصہ تک آصف خاں نے مکۂ معظمہ میں قیام کیا، وہاں علماءِ حرمین اور بلاد و امصار کے باکمال ان کے علمی و عملی کمالات، دینی استقامت و عزیمت اور عبادت کی مشغولیت دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے، علامۂ عصر ابن حجر مکی نے تو ان کے فضائل و مناقب میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے، (اور غالباً کسی ہندی کے مناقب میں ایک مسلم الثبوت عربی عالم کی یہ پہلی تصنیف ہے) جس میں ان کے فضل و کمالِ تقویٰ و تقدس کی بڑی مدح سرائی کی ہے۔

علماءِ حرمین کی شہادت ہے کہ جواری و خدام اور جاہ و حشم کے باوجود ان کی زندگی مکۂ معظمہ میں بالکل زاہدانہ تھی، قرآن کے دس پارے تہجد میں پڑھتے، ابن حجر مکی کی شہادت ہے کہ مکۂ معظمہ کے دس سالہ قیام میں مسجدِ حرام میں ان کی کوئی جماعت فوت نہیں ہوئی، ان کی قیام گاہ مطاف کے محاذی تھی، کبھی نوافل، ذکر و تسبیح، مراقبہ و مطالعہ کے علاوہ ان کو کسی حال میں نہیں دیکھا گیا، اونچی اونچی کتابوں کا درس اور علماء سے علمی مذاکرۂ بحث و تحقیق کا سلسلہ برابر جاری رہتا، علماءِ حرم بڑے شوق سے ان کی علمی مجالس میں شریک ہوتے، اعلیٰ درسی اور دینی فنون کی منتہیانہ کتابوں کے اشکالات پر فاضلانہ و محققانہ گفتگو و تحقیق ہوتی۔

علمی سرپرستی اور قدردانی کا یہ عالم تھا کہ ابن حجر مکی لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں آصف خاں مکۂ معظمہ میں آکر رہے تھے، تو عجیب طرح کی رونق مکۂ معظمہ میں پیدا ہوگئی تھی، علماء و فقہا ان کی صحبت کو غنیمت سمجھتے تھے، علم کا چرچا بڑھ گیا تھا، اور مکہ والوں نے تحصیل علم میں بڑی کوشش کی تھی، طلبہ ہر طرف سے سمٹ آئے تھے، اور انھوں نے حصولِ علم پر مستقل توجہ کی اور دقائق علمی کی

اس غرض سے جستجو وتلاش کی کہ آصف خاں کے سامنے ان کو پیش کریں اور رسوخ پیدا کریں، اور مشکلات فن کو محفوظ کیا تاکہ ان کے ذریعہ سے ان کا تقرب حاصل کریں، یہ سب اس وجہ سے تھا کہ انھوں نے اہل علم پر احسان وکرم کے دائرہ کو اس قدر وسیع کر دیا تھا کہ جس کی نظیر ان کے معاصرین میں بلکہ ایک مدت سے موقوف تھی، یہاں تک کہ مکہ معظمہ میں ہر گلی کوچہ میں ان کو اس طرح دعائیں دی جاتی تھیں جس طرح لبیک کی صدائیں ایام حج میں بلند ہوتی ہیں۔

آصف خاں کے فضائل وکمالات کی دور دور ایسی شہرت ہوئی کہ سلطان ترکی نے ان کی ملاقات کی آرزو ظاہر کی اور شریف مکہ کے توسط سے شاہانہ اعزاز واکرام کے ساتھ قسطنطنیہ بلایا، اور بڑی توجہ واعزاز کے ساتھ اس جامع کمالات ہستی سے گفتگو کی۔

ایک رفیق سفر نے جس نے مکہ معظمہ سے قسطنطنیہ تک آصف خاں کے ساتھ سفر کیا تھا بیان کیا کہ اس پورے سفر میں آصف خاں نے کبھی کسی رخصت پر عمل نہیں کیا، ہمیشہ اسی طرح عزیمت پر عمل کرتے رہے جیسے اقامت میں کرتے تھے خسرو پاشا حاکم مصر نے آصف خاں کے لئے ایک خلعت بھیجی اور سفیر نے باصرار عرض کیا کہ بادشاہ کی خوشی کے لئے آپ اس کو ایک مرتبہ بدن پر ڈال لیں تاکہ پہننے کو ہو جائے، آصف خاں نے معذرت کی کہ یہ قبا ریشمی ہے، میں اس کو کسی طرح بدن پر نہیں رکھ سکتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر بادشاہ مظفر شاہ حلیم واورنگ زیب اور ہر امیر وزیر عبدالرحیم خانِ خاناں اور آصف خاں نہیں تھا، لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ انسان کی عظمت وکمال کا معیار اس زمانہ میں عام طور پر بہت بلند تھا، اس کی بڑائی اور کامیابی کے لئے بہت سی ایسی صفات اور کمالات ضروری سمجھے جاتے تھے، جو بعد کے زمانہ میں خصوصاً مغرب کے مادی اقتدار کے دور میں عظمت کی شرائط سے خارج ہو گئے ہیں وہ معیار لوگوں کی نظر کے سامنے ہر وقت رہا کرتا تھا، عوام بھی اس کی توقع کرتے تھے اور اہلِ ہمت بھی اپنے تئیں ان کا ایسا پابند سمجھتے تھے کہ

ہمیشہ ان کی جدو جہد میں رہا کرتے تھے، اور کبھی اس بارہ میں اپنے کو معاف نہیں کرتے تھے، دنیاوی عظمت و ترقی کا بلند سے بلند زینہ ان میں دین کی طرف سے دوں ہمتی نہیں پیدا کرتا تھا، دنیاوی مشاغل کا ہجوم اور شدتِ انہماک، حکومت، ریاست و وزارت کی ذمہ داریاں، مذہبی فرائض بلکہ سُنن و نوافل کی طرف سے بھی ادنیٰ غفلت پیدا نہیں ہونے دیتی تھیں، عیش و عشرت کے وسائل اور دولت، تن آسانی اور راحت طلبی پیدا نہیں ہونے دیتی تھی، دوسری چیزوں اور شعبوں کے انحطاط کے ساتھ اس عالی ہمتی اور جامعیت میں بھی تنزّل ظاہر ہوا، اور وہ نمونے جو ہر زمانہ میں بہ کثرت نظر آتے تھے، خال خال نظر آنے لگے لیکن پھر بھی وہ معیار باقی تھا، اور دماغوں اور دلوں پر اس کی حکومت تھی، اپنے اپنے دور کے عالی ہمت اور صاحبِ عزم افراد اس معیار پر پورا اترنے کے لئے کوشاں رہتے تھے، اور اس کے لئے اپنی راحت و لذت، اور خواہشات قربان کرتے تھے، ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے کچھ پہلے اور اس کے بعد ہندوستان کے اہلِ وجاہت و اہلِ علم پر نظر ڈالئے، آپ مفتی صدر الدین خاں، نواب قطب الدین خاں، نواب وزیر الدولہ مرحوم والیٔ ٹونک، نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور، مدار المہام منشی جمال الدین خاں وزیر ریاست بھوپال، نواب سید صدیق حسن خاں ایسے جامع اوصاف بزرگ ملیں گے جن میں ریاست و امارت اور علم و فضل کے ساتھ زاہدوں کا زہد، عابدوں کی سرگرمی، طالب علموں کا انہماک و شوق مطالعہ اور سپاہیوں کی چستی جمع تھی، اور یہ اس کا نتیجہ تھا کہ زندگی کا نمونہ اور معیار (آئیڈیل) بلند تھا، اور ہر زمانہ میں دل و دماغ پر آئیڈیل ہی کی حکومت ہوتی ہے۔

مغرب کے مادّی و معاشی دورِ اقتدار و تہذیب میں انسانی زندگی کا قابلِ تقلید نمونہ اور مثالی تصوّر پست ہو گیا، صرف اچھا کھانا، اچھا پہننا، سوسائٹی میں معزز و ممتاز بننا اور ہم چشموں میں جاہ و اعزاز حاصل کرنا آئیڈیل بن گیا، پیغمبروں کی سیرت نظروں سے اوجھل ہو گئی،

دین و دنیا کی جامع اور ذہنی، علمی، روحانی وانتظامی کمالات اور کسبِ حلال کی صفت سے متصف ہستیوں کا ذہنی اثر و تسلّط ہٹ گیا اور وہ شخصیتیں ذہن پر چھا گئیں، اور نمونہ و مثال اور زندگی کی کامیابیوں کا منتہیٰ بن کر آنکھوں اور تصور کے سامنے پہاڑ بن کر کھڑی ہو گئیں، جو اخلاقی و ذہنی حیثیت سے سخت ناقص، اعمال و کردار کے لحاظ سے بے حد پست، علمی کمالات اور حقیقی صفات سے محروم، اخلاقی سطح کے لحاظ سے بتذل اور عامی، گھٹیا درجہ کے انسان یا معاشی جانور اور روپیہ پیدا کرنے کی بے شعور و بے درد مشینیں ہیں، تن آسانی اور راحت پسندی اتنی غالب آ گئی اور تفریحی مشاغل نے زندگی کی اتنی بڑی جگہ گھیر لی کہ عبادت، دینی فرائض کی ادائیگی اور روحانی ضروریات کی طرف توجہ کرنے کے لئے گنجائش نہیں رہی، اس وقت ترقی یافتہ اور مہذّب طبقہ کے نظام اوقات پر نظر ڈالئے گا تو قدیم اسلامی تہذیب کے ان نمائندوں کے نظامِ اوقات میں اور بیسویں صدی عیسوی کے اس نظام اوقات میں اتنا بڑا فرق نظر آئے گا کہ ایک قوم اور ملک کے افراد نہیں معلوم ہوں گے اور درمیان میں برسوں نہیں بلکہ صدیوں کی مسافت اور سمندروں اور ملکوں کا فاصلہ معلوم ہوگا۔



باب ہفتم

عالم اسلام زندگی کے میدان میں

گذشتہ اسلامی قیادت کے اثرات

گذشتہ صفحات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ چھٹی صدی مسیحی میں جب دنیا تیزی کے ساتھ ہلاکت کے غار کی طرف جارہی تھی اور روئے زمین پر کوئی طاقت نہ تھی جو گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑ سکے، محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے دنیا کو ایک ایسی جماعت کی قیادت عطا فرمائی جو آسمانی کتاب اور الٰہی شریعت وقانون رکھتی تھی جس کا ہر قدم خدا کی بخشی ہوئی روشنی میں اٹھتا تھا، اور اُجالے میں پڑتا تھا جو دنیا میں حق وانصاف کی علمبردار تھی، جو حکومت وقیادت کے منصب پر نبوت کی مستحکم اخلاقی تربیت اور دین کی مکمل تہذیب نفس کے بعد فائز ہوئی تھی، جو کسی قوم کی خدمت گزار اور کسی نسل ووطن کی نمائندہ نہ تھی جس کو انسانیت کا معتدل ترین مزاج اور متوازن ترین طبیعت عطا ہوئی تھی۔

اس جماعت کے وجود نے نوعِ انسانی کی مجموعی ہلاکت کے راستہ میں فوری روک کا کام دیا اور بتدریج انسانیت کو صدیوں تک کے لئے ان تمام فتنوں اور خطرات سے محفوظ کردیا جو عالم پر محیط تھے اس نے صحیح منزل کی طرف انسانوں کو ساتھ لے کر بڑھنا شروع کیا اس کے اقتدار میں انسانیت کو متوازن ترقی ہوئی اور انسان کی تمام ظاہری وباطنی قوتوں نے

ہم آہنگی اور تناسب کے ساتھ نشو ونما اور ترقی حاصل کی اور ایک ایسا ماحول قائم ہوا، جس میں انسان کے لئے بسہولت اپنے کمالِ انسانی تک پہونچنا ممکن ہوا۔

اس جماعت کے اثر و نفوذ سے زندگی کا دھارا اور دنیا کی سمت بدل گئی، ایک وسیع پیمانہ کی خودکشی اور عالمگیر خدا فراموشی و خود فراموشی سے ہمہ گیر خدا پرستی اور خود شناسی کی طرف رُخ ہوگیا، انسانوں کا مزاج، ذہن اور قلب بدل گیا، غلط اخلاقی قدریں اور جھوٹے پیمانے تبدیل ہوگئے، اعلیٰ اخلاقی نمونے معیار کا کام دینے لگے، زندگی اور نظامِ حکومت کے لئے خالص دینی و اخلاقی تعلیمات نے میزان کا درجہ حاصل کرلیا، اس کے دورِ تمدن میں تجارت و صنعت کے ساتھ اخلاق و فضیلت کو بھی عروج ہوا اور فتوحات کی وسعت اور تمدن کی ترقی کے ساتھ اخلاق و روحانیت نے بھی یکساں فروغ پایا، دینی رشتہ، مقاصد کے اتحاد اور صلح و محبت نے دنیا کو جنت کا نمونہ بنادیا جس میں نہ باہم زور آزمائی تھی نہ رسّہ کشی، خدا پرستی و پاکیزگی کی راہ جو جاہلیت کی حکومت و اقتدار میں کانٹوں سے بھری اور مدت سے سنسان پڑی تھی، بے خطر شاہ راہ بن گئی جس پر بے روک ٹوک قافلے جاتے تھے، خدا کی اطاعت جو پہلے مشکل تھی اب آسان، اور نافرمانی جو پہلے آسان تھی اب مشکل ہوگئی، دین کی دعوت میں مقناطیس کی کشش اور اخلاقی تربیت و اصلاح میں جرِّ ثقیل کی طاقت پیدا ہوگئی جس نے لاکھوں نفوس کو بہیمیت کی زندگی اور اخلاق کی پستی سے اٹھا کر روحانی اور اخلاقی ترقی کی انتہائی بلندیوں پر پہونچادیا، انسانی جوہر و کمالات علم و ذہانت اور طبیعت کی جولانی نے جو عرصہ سے ضائع یا بے محل صرف ہو رہی تھی، صحیح رُخ اختیار کرکے دنیا کو حقیقی ترقی دی، غرض انسانیت کا قافلہ منزلِ مقصود سے قریب ہوا اور اس کا اگلا حصہ منزل پر پہونچ گیا۔

مغربی قیادت اور اس کے اثرات

لیکن قبل اس کے کہ پچھلے مسافر منزل پر پہونچیں، دفعۃً قافلہ ٹھہرا معلوم ہوا کہ قیادت

تبدیل ہوگئی، کاروانِ سالار کو اس لئے قیادت سے سبک دوش ہونا پڑا کہ اس نے قافلہ کی حفاظت کا پورا سامان نہیں کیا تھا،[1] ایک اجنبی[2] مسافر نے جس کو قافلہ میں کوئی نہیں پہچانتا، تلوار کے زور اور قوت کی دلیل سے زمام قیادت لے لی ہے۔

اس بے بس انسانی قافلہ کو نیا قافلہ سالار ایک ایسے راستہ کی طرف لے چلا جس میں سخت نشیب وفراز اور پیچ وخم ہیں، جس پر دن کی روشنی[3] میں رات کا اندھیرا ہے، قافلہ کے رہرو بار بار ٹھوکر کھاتے، منھ کے بل گرتے اور فریاد کرتے ہیں لیکن قافلہ سالار قوت کے نشہ اور جلد پہونچنے کی عُجلت میں قافلہ کو سرپٹ لئے جارہا ہے۔

یہ تمثیل نہیں واقعہ ہے، دنیا کی زمامِ قیادت مسلمانوں کے بعد مغرب کی ان قوموں نے اپنے ہاتھ میں لی، جن کے پاس ابتدا سے حکمتِ الٰہی کا کوئی سرمایہ اور علم صحیح کا کوئی صاف سرچشمہ نہ تھا، نبوت کی روشنی وہاں دراصل پہونچنے ہی نہیں پائی، حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کی ایک شعاع جو وہاں پہونچی بھی وہ تحریف وتاویل کے اندھیروں میں گم ہوگئی، انھوں نے اس آسمانی روشنی کی خانہ پُری یونان وروما کے دفتروں کی سیاہی سے کی، جاہلی یونان وروما کا پورا جاہلی ترکہ ان کے میراث میں آیا، اور نسلی طور پر ان کے تمام فطری، ذہنی، اخلاقی اور مزاجی خصائص ان میں منتقل ہوئے، محسوسات پرستی، روحانیت سے بُعد، تمتع ولطف اندوزی وطینت کا غلو، غیر محدود شخصی آزادی کا شوق یونان سے، اور ضعف ایمان، جارحانہ قوم پرستی، طاقت کی تقدیس، اور استعمار (شہنشاہیت) کی روح روم سے منتقل ہوئی، مسیحی تعلیمات کے بچے کھچے سرمایہ کو (جو شاید اصل سے ایک اور دس کی بھی نسبت نہیں رکھتا تھا) رومی بت پرستی اور سینٹ پال اور قسطنطین کی منافقت نے ڈبویا اور اگر کچھ

---

[1] مسلمانوں کی مادی کمزوری اور اسبابِ قوت سے غفلت وکوتاہی کی طرف اشارہ ہے جس کی تکوینی طور پر اس عالم اسباب میں یہ سزا تھی کہ ان کو دنیا کی قیادت سے دست کش ہوجانا پڑا۔

[2] مغربی اقوام   [3] بجلی کی روشنی میں۔

باقی رہا تو علماء مذہب کی تحریف و تاویل نے کھویا، رہبانیت کے جنون نے مادہ پرستی کے رد عمل کو پیدا کیا، ارباب کلیسا کی عیش پرستی اور دنیاداری نے اہل مذہب کی طرف سے بے اعتمادی اور نفرت پیدا کی، حکومت و کلیسا کی کشاکش نے قومی مزاج میں برہمی اور عدم توازن پیدا کیا اور دین و دنیا میں تفریق کی، مذہب و عقلیت کی خونی کش مکش اور اہل دین کے جمود و نافہمی اور ارباب کلیسا کے لرزہ خیز مظالم نے برائے نام مذہب کے خلاف نسلی اور موروثی عداوت کا بیج بو دیا، خام کار روشن خیالوں کی عجلت پسندی اور تعصب نے مذہب کا آخری تسمہ بھی کاٹ دیا، اور مذہب کے رہے سہے فوائد سے بھی محروم کر دیا آخرکار ساری مغربی قوموں پر مادہ پرستی کا دور آیا اور سارے مغرب پر خدا فراموشی اور اس کے طبعی نتیجہ کے طور پر خود فراموشی کا عالم چھا گیا زرپرستی مذہب بن گیا، مادیت کے استغراق نے خالص اقتصادی وحدۃ الوجود کا فلسفہ پیدا کر دیا جس کا نعرہ ہے "لاالہ الا الخبز اور لا موجود الا البطن"۔

دوسری طرف زندگی کا صحیح مقصد و مشغلہ اور عالمگیر پیام نہ ہونے کی وجہ سے جارحانہ قوم پرستی اور وطن پرستی زندگی کا مقصد اور قومی مشغلہ بن گیا، قومی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے دوسری قوموں سے نفرت و خوف کے جذبات ظہور پذیر ہوئے اور ایک طرف سارے مشرق کو مغرب کے مقابلہ میں حریف کیمپ سمجھ لیا گیا، دوسری طرف اندرونی قومیت کی حدبندیوں نے سارے مغرب کو چھوٹے چھوٹے گھروندوں میں تبدیل کر دیا اور ہمسایہ اور ہمسایہ کے درمیان ایک خط کھینچ دیئے جن کے باہر انسان کا تصور نہیں کیا جا سکتا، استعمار یا امپیریلزم نے ساری دنیا کو بردہ فروشی کی ایک منڈی (جہاں قوموں کا سودا ہوتا ہے) اور سلطنتوں کی رقابتوں نے دنیا کو لوہار کی بھٹی بنا دیا جہاں ہر وقت آگ کا کھیل ہے اور لوہے کو تپا کر اور پیٹ کر اپنے کام کے ہتھیار بنائے جاتے ہیں۔

اخلاقی و دینی تعلیمات سے محرومی اور صدیوں کی بے تربیتی کے ساتھ علم و صنعت تحقیق و اکتشافات کی ترقی سے قوت و اخلاق میں کوئی توازن باقی نہیں رہا، انسانوں نے

پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنا او مچھلیوں کی طرح پانی میں پیرنا سیکھ لیا لیکن آدمیوں کی طرح زمین پر چلنا بھول گئے، بے قید اور بے شعور عقل و علم نے ہر رہزن او قفل شکن کو قفل شکنی کا آلہ اور ہر بدست کو تلوار مہیا کی، سائنس نے بیسویں صدی کے شریر او نادان بچوں کو کھیلنے کے لئے دھار دار او خطرناک اوزار تقسیم کئے جن سے وہ اپنے کو بھی زخمی کر رہے ہیں اور اپنے بھائیوں کو بھی، بالآخر اندھے بہرے سائنس نے "ذراتی اور ہیڈروجن بم" کی شکل میں انسان کے ہاتھ میں خود کشی کا ہتھیار دے دیا۔

ان لادینی قوموں کے عہد اقتدار میں انسان اس مذہبی حاسہ سے محروم ہونے لگا جو دوسرے انسانی حواس کے ساتھ مشرق کی ہزاروں سال کی زندگی میں لازمۂ زندگی رہا ہے، خدا طلبی کے عمومی ذوق کی جگہ دنیا طلبی کے بحران نے لے لی، اخلاق و معنویات اور حقیقی انسانی صفات و کمالات میں سخت انحطاط اور تنزل ہوا، غرض لوہے اور دھات کو ہر طرح ترقی ہوئی اور "آدمیت" کو ہر طرح زوال ہوا۔

عالمگیر جاہلیت

اس وقت کوئی ایسی طاقت ور قوم یا جماعت جو ان مغربی قوموں سے عقائد و نظریات کا اختلاف رکھتی ہو اور ان کے جاہلی فلسفہ اور مادی نظامِ زندگی کی مخالف ہو منظر عام پر نہیں ہے ایسی قوم یا جماعت اس وقت نہ یورپ میں پائی جاتی ہے، نہ افریقہ اور ایشیا میں، یورپ کے جرمن ہوں یا ایشیا کے جاپانی یا ہندوستان کے باشندے سب اس جاہلی فلسفہ اور اس مادہ پرستانہ نظامِ حیات کے قائل و معتقد ہیں، یا ہوتے جا رہے ہیں، باقی وہ سیاسی اختلاف اور قوموں کی سیاسی کش مکش جو اس وقت مختلف فلسفوں یا جنگوں کی صورت میں نظر آ رہی ہے، وہ محض اس بات کی کش مکش ہے کہ اس مادہ پرستی کی منزلِ مقصود کی طرف لے جانے کا منصبِ قیادت کس کے ہاتھ میں رہے؟ ایک قوم کی غیرتِ قومی اس کی روادار نہیں کہ دوسری قوم ایک مدتِ دراز سے دنیا کی قیادت پر فائز، زندگی کے مسائل و فوائد سے متمتع اور دنیا کے بازاروں، منڈیوں اور نو آبادیوں پر قابض

رہے، حالانکہ وہ قوت علم، نظام، اور صلاحیت میں اس سے کسی طرح پیچھے اور کمتر نہیں، رہا یہ کہ وہ خود کسی اور منزل کی طرف بڑھنا اور دوسری قوموں کو لے جانا چاہتی ہے، زمین میں امن و انصاف قائم کرنا چاہتی ہے، اور دنیا کا رُخ بے دینی اور مادّیت سے دین و روحانیت کی طرف، بداخلاقی سے اخلاق کی طرف، اور نفس و شیطان پرستی سے خدا پرستی کی طرف پھیرنا چاہتی ہے تو اس غریب کو نہ اس کا دعویٰ ہے نہ یہ کبھی اس کا ارادہ ہے!

اشتراکی روس اور سرمایہ دار مغربی ممالک کا فرق

رہا اشتراکی روس جس کا نظام بظاہر موجودہ مغربی قوموں سے جدا معلوم ہوتا ہے تو وہ محض جاہلی مغربی تہذیب کا ایسا پھل ہے جو پک گیا ہے، اس میں اور دوسرے مغربی ملکوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ اس نے منافقت اور فریب کا نقاب اپنے چہرے سے ہٹا دیا ہے، اور جس فلسفہ اور اخلاق و اجتماعی نظریات کو مغربی قوموں کے مفکر، مصنّف، فلسفی اور ادیب اور سیاسی صدیوں سے لکھ رہے ہیں، اور وہ قومیں ان کو دل سے مان رہی ہیں، اس فلسفہ اور ان اصول و نظریات کو روس نے ایک مرتبہ جرأت کر کے اپنے ملک میں نافذ کر دیا ہے، اور عملاً اس کو کر کے دکھایا ہے، اشتراکی رہنما اس رفتار پر قانع نہ تھے، جس رفتار سے یورپ کی قومیں الحاد، لامذہبیت، اباحت (ہر قسم کی آزادی) اور بہیمانہ مادّیت کی طرف بڑھ رہی تھیں، انھوں نے تیز رفتاری کے ساتھ منزل کی طرف قدم اٹھائے اور اس منزل پر پہونچ کر اب وہ چاہتے ہیں کہ دنیا کی قیادت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیں اور اقوامِ عالم کو اس منزل پر لے آئیں جس پر وہ پہونچ چکے ہیں۔[1]

---

[1] خدا کا شکر اور اس کی قدرتِ مطلقہ کا ایک نمونہ ہے کہ ان سطور کے لکھنے کے چند سال بعد قیاس و توقع اور اندازوں کے بالکل برخلاف روس میں انقلاب ہو گیا، اور وہاں کی مسلمان آبادی کو بڑی حد تک مذہبی آزادی، اور نئی نسل کی تعلیم و تربیت، حج و زیارت اور اسلامی ممالک کے سفروں کی آزادی مل گئی، جس کی

(باقی صفحہ ۳۲۰ پر)

ایشیائی اور مشرقی قومیں

ایشیائی اور مشرقی قومیں اور سلطنتیں مختلف رفتار کے ساتھ تہذیب و سیاست کی اس منزل کی طرف گامزن ہیں جس پر وہ مغربی قوموں کو دور سے دیکھ رہی ہیں، تہذیب و اخلاق و اجتماع کے وہی اصول و نظریات اور زندگی اور کائنات کے متعلق وہی نقطۂ نظر اختیار کرتی جا رہی ہیں جو ان مغربی قوموں کا شعار بن چکا ہے ان کے افراد کی سیرت مغربی اقوام کے افراد سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے ان کو مغربی اقوامِ غالب سے صرف اتنا اختلاف ہے کہ وہ سیاسی بیداری اور قوم پرستی کی بنا پر غیر ملکی حکومتوں کی سیادت اور اتالیقی پر اب راضی نہیں اور اس کو گوارا نہیں کرتیں کہ مغربی قوموں کی بڑی بڑی سلطنتیں اور شہنشاہیاں قائم رہیں ان غالب قوموں کے افراد اپنی سلطنتوں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے مادّی فوائد اور ثمرات سے متمتّع ہوں اور شوکت و عظمت اور عیش و عشرت کی زندگی گزاریں، ان مظلوم مشرقی قوموں کو خود اپنی سرزمین میں یہ فوائد حاصل نہ ہوں ان کو دراصل ان مغربی قوموں کے فلسفۂ زندگی اور نظامِ سیاسی سے بنیادی اور اصولی اختلاف نہیں پورے پورے قوم پرست لٹریچر میں اس کی طرف اشارہ بھی نہیں ملے گا، ان مشرقی اور ایشیائی قوموں کو صرف اس سے اختلاف ہے کہ یہ نظامِ سیاسی ان کے ملک میں غیر ملکی چلائیں وہ بے کم و کاست یا تفصیلات و اجزاء میں کچھ تغیّر و ترمیم کے ساتھ یہی نظام اپنے ملک میں خود چلانا چاہتے ہیں گویا شطرنج کی بساط نہیں الٹنا چاہتے بلکہ صرف کھیلنے والے بدلنا چاہتے ہیں، پھر ان میں سے بہت سی قوموں کی خود اپنی قدیم جاہلیت ہے جس کے ساتھ ان میں سے بہت سی قوموں نے جاہلیت فرنگ بھی اختیار کر لی ہے اور اب جب کبھی ان کو اقتدار حاصل ہوگا

(باقی ص ۳۱۹ کا) چند سال پہلے پیشین گوئی کرنی بھی مشکل تھی "یُقَلِّبُ اللّٰہُ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ، اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ" اللہ تعالیٰ اس صورت حال کو قائم رکھے اور بڑھائے۔

وہ ان دونوں جاہلیتوں کے بہترین عناصر و اجزا بروئے کار لائیں گے۔

مسلمان، جاہلیت کا حلیف

طرفہ تماشا یہ ہے کہ جاہلیت کا قدیم و نسلی حریف (مسلمان) بھی اس زمانہ میں دنیا کے بہت سے گوشوں میں جاہلیت کا حلیف بن گیا ہے اس کو اس نے اپنی دوستی اور وفاداری کا اطمینان دلا دیا ہے اور دنیا کے بعض حصّوں میں اس نے ان مغربی جاہلی قوموں کے لئے رضاکارانہ خدمات انجام دی ہیں، جاہلیت کی اس سے بڑھ کر کیا کامیابی ہو سکتی ہے کہ بعض مسلمان قومیں اور سلطنتیں اور بعض مسلمان جماعتیں ان قوموں اور سلطنتوں کو اپنا حامی و سرپرست اور حق و انصاف کا علمبردار سمجھنے لگی ہیں جو اس زمانہ میں جاہلی تحریک کی علمبردار ہیں، اور جنھوں نے جاہلیت کے تنِ مُردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دی ہے، عام مسلمان دنیا کی قیادت کا خیال ہی چھوڑ چکے ہیں، اور اسلامی جیش کے قائد ہونے کے بجائے جاہلیت کے گردِ کارواں بننے پر قانع ہیں، اور اس پر بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔

افراد میں جاہلی مغربی اخلاق اس طرح سرایت کرتے جا رہے ہیں جس طرح درختوں کے رگ و ریشہ میں پانی اور تاروں میں بجلی دوڑ جاتی ہے، اسلامی ممالک میں مغربی مادّیت اپنی پوری شان کے ساتھ دیکھنے میں آتی ہے، خواہشاتِ نفس کی اندھا دھند پیروی زندگی کی نہ بجھنے والی پیاس اور نہ مٹنے والی بھوک اس قوم میں بھی پیدا ہوتی جا رہی ہے جس کے نزدیک آخرت کی زندگی اصل زندگی ہے، مغربی علوم اور تہذیب کے اثر سے آخرت کا خیال روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے، اور حیاتِ دنیا کی اہمیت اور کشش بڑھتی جا رہی ہے، اعزاز و فخر و جاہ کے حصول میں اور سربلندی اور سرفرازی کی کوشش میں بلند حوصلہ اور ترقی پسند مسلمان یورپ کے ترقی یافتہ لوگوں کے نقش قدم پر ہے، اصول و اخلاق پر فوائد اور مصلحتوں کو ترجیح دینے کا مرض پھیل گیا ہے، مادی قوموں کی تقلید میں ظاہری نمائش اور کھوکھلے مظاہر کی گرویدگی بڑھ گئی ہے، انسانوں کی بندگی، قوت اور دولت کے سامنے سرافگندگی

اور "شاہ پرستی" میں کہیں کہیں یہ موحد اور مجاہد امت مشرک اور غلام طینت قوموں سے زیادہ ممتاز نظر نہیں آتی۔

امید کی شعاع

یہ سب کچھ ہے مگر اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی امید کی شعاع نظر آتی ہے، دوسری قومیں آسمانی ہدایت اور پیغمبروں کی تعلیم و حکمت کے سرمایہ کو یکسر کھو چکی ہیں اور صدیوں پہلے ان کے سفینوں اور ان کے سینوں میں یہ روشنی گل ہو چکی ہے، ماضی و حال کو مربوط رکھنے والے رشتہ کے ایک تار کو زمانہ کا ہاتھ کاٹ چکا ہے، ان قوموں کی مذہبی اصلاح کی تاریخ بتلاتی ہے کہ ان میں دینی تجدید و احیاء کی دعوت کوئی وسیع انقلاب برپا نہیں کر سکتی اور کوئی بڑی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی، گوسالہ کے اس تن مردہ میں کوئی سامری، مذہبی اور اخلاقی زندگی کی نئی روح نہیں پھونک سکا، مادہ پرستی، دولت و قوت پرستی پورے طور پر ان پر حاوی ہو چکی ہے، جاہلیت کے قطع کئے ہوئے لباس یکے بعد دیگرے ان کے جسم پر چسپاں ہو سکتے ہیں مگر دین کا لباس اب ان کے قامت پر راست نہیں آتا، جاہلیت کے بالکل مخالف اور متوازی نظام دین و اخلاق و معاشرت و اجتماع و سیاست کو ان کا صدیوں کا بنا ہوا دماغی سانچہ اب قبول نہیں کرتا۔

اس کے برخلاف مسلمانوں کا دینی سرمایہ اور آسمانی ہدایت و حکمت کا سرچشمہ محفوظ ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور صحابۂ کرام کی زندگی جس میں پوری اُمت کی تخلیق کی قوت ہے ان کے پاس موجود ہے، پھر اصحاب تجدید کا ایک غیر منقطع سلسلہ اور اصلاح و انقلاب کی دینی دعوت کا ایسا تسلسل ہے جس نے اس امت کو کسی دور میں بھی جاہلیت میں گم ہو جانے کا موقع نہیں دیا، جاہلیت کا خالص مادی نظام اس امت کا ذہن (جب تک کہ اس کا سانچہ توڑ کر

از سر نو نہ بنایا جائے) پورے طور پر ہضم نہیں کر سکتا اور مسلمان جاہلیت کی مشینری میں اس طرح فٹ نہیں ہو سکتا جس طرح ایک ڈھلا ڈھلایا پرزہ فٹ ہو جاتا ہے۔

طلوع اسلام

دین الٰہی کا علمبردار اور دنیا کا محتسب

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے میدان بدر میں فرمایا تھا۔

اَللّٰھُمَّ اِن تُھلِكْ ھٰذِہِ العصابۃ لا تُعبد۔ — اے اللہ اگر تو اس جماعت کو ہلاک کر دے گا تو پھر تیری عبادت نہ کی جائے گی۔

مسلمانوں کے سارے نقائص کے باوجود یہ حقیقت اب بھی اسی طرح باقی ہے، جاہلیت دنیا کے لئے جو نقشہ رکھتی ہے اور جس نقشہ پر وہ آج دنیا کو چلا رہی ہے اس کے خلاف اگر کوئی نقشہ ہے تو صرف مسلمانوں کے پاس ہے اگرچہ مسلمان خود اس کو بھولے ہوئے ہیں لیکن یہ نقشہ ابھی ضائع نہیں ہوا اور نہ کبھی ضائع ہو سکتا ہے، مسلمان اپنے دین کے رو سے دنیا کے محتسب اور خدائی فوجدار ہیں جس دن وہ بیدار ہوں گے اور اپنا فرض منصبی انجام دیں گے وہ مشرق اور مغرب کی قوموں کے لئے روزِ حساب ہوگا، انھیں کے خاکستر میں وہ چنگاری دبی ہوئی ہے جو کسی نہ کسی دن بھڑک کر جاہلیت کے خرمن کو جلا کر خاک کر دے گی۔

علامہ اقبال مرحوم نے اس حقیقت کو نظامِ جاہلی کے علمبردار و صدر نشین ابلیس کی زبان سے ادا کروایا ہے "۱۹۳۶ء کی مجلس شوریٰ" میں شیاطین عالم نے جمع ہو کر ان خطرات کو پیش کیا جو ابلیسی نظام کے لئے سخت تشویش اور پریشانی کا باعث ہیں اور جن کی طرف جلد متوجہ ہونے کی ضرورت ہے، ایک مُشیر نے جمہوریت کا نام لیا، اور اس کو "جہانِ نو کا تازہ فتنہ" بتلایا، دوسرے نے اشتراکیت سے سخت خطرہ ظاہر کیا اور ابلیس کو مخاطب کر کے کہا ؎

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج — کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے — جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پہ مدار

صدرِ مجلس (ابلیس) نے اپنے مشیروں کو ان فتنوں سے اطمینان دلایا اور اپنی گہری اور اندرونی واقفیت کی بنا پر ان کی اصل حقیقت بیان کی جو ان کی ظاہر بیں نگاہ سے پوشیدہ رہ گئی تھی، اور ان فتنوں کا توڑ بتایا جس کا اس نے پہلے سے انتظام کر لیا تھا۔

آخر میں اس نے اپنے نقطۂ نظر سے اصل خطرہ کا ذکر کیا جس کے لئے اگرچہ اس نے انتظامات سوچ لئے ہیں مگر مستقبل کی خطرناکی سے اس کے جسم پر لرزہ طاری اور راتوں کی نیند حرام ہے، وہ کہتا ہے۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے — جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ — کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے — مزدکیت[1] "فتنۂ فردا" نہیں اسلام ہے
جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر — حافظِ ناموسِ زن مرد آزما مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف — منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب — یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

---

[1] اشتراکیت

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

وہ اپنے مشیروں کو مشورہ دیتا ہے ؎

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسم شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

عالم اسلامی کا پیغام

عالمِ اسلام کے پاس اب بھی دنیا کے لئے نیا پیغام اور زندگی کی نئی دعوت ہے یہ وہی پیغام ہے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے اس کے حوالہ کیا تھا یہ ایک بڑا طاقتور واضح اور روشن پیغام ہے جس سے زیادہ منصفانہ بلند و برتر اور مبارک پیغام اس پورے عرصہ میں دنیا نے کسی کی زبان سے نہیں سنا۔

یہ بعینہٖ وہی پیغام ہے جس کو سن کر مسلمان مدینہ طیبہ سے نکلے اور تمام دنیا میں پھیل گئے اور جس کو ایک مسلمان سفیر نے شاہ ایران کے اس سوال پر کہ تم ہمارے ملک کیسے آئے مختصر لفظوں میں اس طرح بیان کیا تھا "اللہ نے ہم کو اس لئے بھیجا ہے تاکہ ہم اس کی مشیت سے لوگوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اس وحدہٗ لاشریک کی بندگی میں، دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت میں، اور مذاہب کے ظلم و ناانصافی سے اسلام کے عدل و انصاف میں داخل کریں اس پیغام میں آج بھی ایک حرف کی کمی بیشی کی ضرورت نہیں آج کی بیسویں صدی کی دنیا کے لئے بھی وہ ایسا ہی نیا اور تازہ اور مناسب حال

ہے، جیسا چھٹی صدی مسیحی دنیا کے لئے تھا۔

آج بھی لوگ تراشیدہ اور ناتراشیدہ بتوں کے سامنے سربسجود ہیں آج بھی الٰہِ واحد کی بندگی اجنبی و نامانوس ہو رہی ہے آج بھی غیر اللہ کی عبادت و طاقت کا بازار گرم ہے آج بھی خواہشاتِ نفس کا بت بر سرِ راہ پج رہا ہے آج بھی احبار و رہبان (عالم درویش) ملوک و سلاطین صاحبِ طاقت اور اہلِ دولت، زعماء و قائدین سیاسی جماعتیں اور ان کے لیڈر "اَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ" بنے ہوئے ہیں جن کے لئے ویسے ہی قربانیاں پیش کی جا رہی ہیں اور ان کے آستانوں پر اسی طرح سے ناصیہ فرسائی ہو رہی ہے جیسے معبودانِ باطل کے سامنے ہوتی تھی۔

آج عالمِ انسانیت اپنی وسعت، وسائلِ سفر کی فراوانی نقل و حرکت کی آسانی، اور اقوام و ممالک کے قرب و اتصال کے باوجود پہلے سے کہیں زیادہ تنگ ہے اس وقت کا مادہ پرست انسان اس دنیا میں کسی دوسرے کی ہستی کو تسلیم نہیں کرتا، اور اپنے فوائد اور خواہشاتِ نفس اور خود پرستی کے سوا اس کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں خود غرضی نے اس کی بھی گنجائش نہیں چھوڑی کہ کسی لمبے چوڑے ملک میں دو آدمی بھی زندہ رہ سکیں تنگ نظر وطن پرستی ہر ایسے انسان کو جو اس کے وطن کے باہر پیدا ہو جانے کا قصور وار ہے نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اس کے ہر کمال کی منکر ہے، اور اس کو ہر حق سے محروم کرتی ہے۔

پھر اس زندگی کی رہی سہی وسعت کو ان اہلِ سیاست و حکومت نے اور تنگ کر دیا ہے جو زندگی، وسائلِ معیشت اور خوراک کے سرچشموں اور ذخیروں پر قابض ہیں، وہ جس کے لئے چاہتے ہیں اس زندگی کو تنگ کر دیتے ہیں، اور جس کے لئے چاہتے ہیں وسیع کر دیتے ہیں بڑے بڑے وسیع شہر اور شاداب و زرخیز ملک لوگوں کے لئے بے فیض ہو گئے ہیں، قوموں کی قومیں اور پوری پوری آبادیاں نابالغ بچوں اور ناسمجھ یتیموں کی طرح دوسروں کی اتالیقی اور تولیت میں زندگی گزار رہی ہیں،

انسان کا انسان پر اعتماد نہیں رہا، ہر ایک دوسرے کو بدگمانی اور شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور اپنا حریف سمجھتا ہے، قرآن مجید کے بلیغ اور معجزانہ الفاظ کے مطابق زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تنگ ہوگئی ہے اور طبیعتیں اندر ہی اندر گھُٹنے لگی ہیں، تمدن اور حکومت کی نئی نئی بیڑیاں اور غلامی کے طوق لوگوں پر پڑتے جارہے ہیں، ہر وقت ٹیکسوں اور نئے نئے محاصل کی بھرمار سے مصنوعی قحطوں کا خطرہ ہے، بیرونی اور اندرونی جنگیں سروں پر منڈلا رہی ہیں، فسادات اسٹرائکیں اور ہڑتال زندگی کا لازمہ بن گئے ہیں۔

بے شک آج بھی مذاہب کی ناانصافی سے اسلام کے عدل و انصاف کی طرف لانے کی ضرورت ہے، اس روشن خیال اور ترقی یافتہ زمانہ میں بھی ایسے مذاہب پائے جاتے ہیں جن کے عقائد و تعلیمات مضحکہ خیز ہیں، جو اپنے پیروؤں کو بے عقل اور بے شعور جانوروں کی طرح قابو میں رکھتے ہیں، اور ان کو اپنے عقل و تفکر سے کام لینے کی اجازت نہیں دیتے، پھر کچھ مذاہب و نظام ایسے ہیں جو مذہب کہلانے کے روادار تو نہیں لیکن اپنے تسلط و اقتدار میں، اپنی غیر محدود طاقت و حکومت میں، اور اپنے پیروؤں کی اندھی تقلید اور جوش عقیدت میں قدیم مذاہب سے کسی طرح کم نہیں ہیں، یہ وہ سیاسی نظام اور اقتصادی نظریات ہیں، جن پر آج لوگ اسی طرح سے ایمان لا رہے ہیں، جیسے پہلے مذاہب و ادیان پر ایمان لاتے تھے، یہ اس عصر کی قوم پرستی، وطن پرستی، جمہوریت، اشتراکیت اور اشتمالیت وغیرہ ہے، یہ نئے مذاہب اپنی ناروا داری تنگ نظری اور بے رحمی میں قدیم جاہلی ادیان و مذاہب سے بھی بڑھے ہوئے ہیں، کسی سیاسی عقیدہ یا معاشی نظریہ سے اختلاف کی سزا آج اس سے کہیں زیادہ سخت ہے جتنی زمانۂ سابق میں کسی مذہب یا عقیدہ سے اختلاف کی تھی، آج جب کسی پارٹی یا اصول کا اقتدار قائم ہوتا ہے تو مخالف جماعت کو زندگی کا حق بھی نہیں دیا جاتا اور اس کو اپنے اختلاف کی سخت سزا بھگتنی پڑتی ہے، اس زمانہ کی

دو بڑی جنگیں کسی مذہبی اختلاف کی بنا پر یا کسی مذہبی گروہ کی تحریک سے نہیں ہوئیں بلکہ محض سیاسی اغراض کے تصادم اور قومی خود غرضیوں کی بنا پر ہوئیں اسپین، چین کی خانہ جنگیاں CIVIL WARS جن کے سامنے چھٹی صدی مسیحی کی عیسوی دنیا کی مذہبی خانہ جنگی اور قرونِ وسطیٰ کی کلیسا اور علم و فن کی کش مکش بھی گرد ہے کسی مذہبی اختلاف کی بنا پر نہ تھیں بلکہ محض ایک سیاسی اصول کے اختلاف اور اقتدار پسند گروہوں کی کش مکش تھی۔

آج بھی عالمِ اسلامی کا پیغام خدائے واحد کی عبادت اور اطاعتِ مطلق اللہ کے پیغمبروں کی رسالت بالخصوص آخری اور سب سے بڑے پیغمبر محمد رسول اللہ (صلعم) کی رسالت اور آخرت کے عقیدہ پر ایمان لانے کی دعوت ہے اس دعوت کو قبول کرنے کا انعام اور صلہ یہ ہوگا کہ یہ عالم تو بر تو تاریکیوں سے نکل کر جن میں وہ صدیوں سے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے روشنی کی طرف آجائے گا، اپنے جیسے انسانوں کی بندگی سے وہ نجات پاکر خدائے واحد کی بندگی کی نعمت پائے گا، زندگی کے اس جیل خانہ سے نجات پاکر جس میں وہ صدیوں سے محبوس ہے زندگی کے کھلے میدان اور دنیا کی آزاد فضا میں قدم رکھے گا، اعتقادی اور سیاسی مذاہب کی جکڑ بندیوں سے رہائی پاکر وہ دینِ فطرت اور شریعتِ الٰہی کے سایۂ عدل میں جگہ پائے گا۔

اس پیغام کی ضرورت و اہمیت کی اس بلندی و برتری جیسی اس زمانہ میں واضح ہوئی ہے اور جیسا آج اس کا سمجھنا آسان ہوگیا ہے ویسا کبھی نہیں ہوا تھا، آج جاہلیت سرِ بازار رسوا ہو چکی ہے اس کے چھپے ڈھکے عیب کھل گئے ہیں لوگ زندگی سے عاجز ہیں اور اس وقت کے ناخداؤں سے مایوس ہیں، دنیا کی قیادت میں اصولی تبدیلی کا یہ خاص وقت ہے اس وقت تک دنیا کی قیادت میں جو کچھ تبدیلیاں ہوئیں وہ اس سے زائد نہ تھیں

کہ جب کشتی کا ملاح کشتی کھیتے کھیتے تھک جاتا ہے تو وہ کشتی کا پتوار ایک ہاتھ سے دوسرے میں لے لیتا ہے، جب وہ ہاتھ بھی تھک جاتا ہے تو پھر پتوار بدل لیتا ہے، برطانیہ سے امریکہ یا امریکا سے روس کی طرف عالمگیر رہنمائی یا بین الاقوامی اثر و اقتدار کی تبدیلی کی حقیقت اس سے زائد کچھ نہیں کہ ملاح نے کشتی کا پتوار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لے لیا، یہ ناخدا کی تبدیلی یا اصول جہازرانی کی تبدیلی یا سمتِ سفر کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ صرف دائیں بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

انسانیت کی مشکل کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ عالمگیر قیادت اور زندگی کی جہازرانی ان مجرم اور انسانیت کے خون سے رنگین ہاتھوں سے نکل کر جنھوں نے انسانیت کے قافلہ کو غرق کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے، ان امانت دار، فرض شناس، خدا ترس، تجربہ کار ہاتھوں کی طرف منتقل ہو جو انسانیت کی جہازرانی کے لئے روزِ ازل سے بنائے گئے ہیں، نتیجہ خیز اور کارآمد انقلاب صرف یہ ہے کہ دنیا کی رہنمائی اور انسانیت کی سربراہی جاہلیت کے کیمپ سے جس میں برطانیہ، امریکہ، روس اور ان کی حاشیہ بردار مشرقی اور ایشیائی قومیں ہیں اور جس کی زمامِ قیادت مُترفین اور اکابر مجرمین کے ہاتھوں میں ہے منتقل ہو کر اس امت کے ہاتھ میں آجائے جس کی قیادت انسانیت کے معمارِ اعظم رحمتِ عالم سید اولادِ آدم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے، اور جو اس دنیا کی تعمیرِ نو اور انسانیت کی نشأتِ ثانیہ کے لئے محکم اور واضح اصول و تعلیمات رکھتی ہے، اور جس کا ایمان دنیا کو اس وقت کی جاہلیت سے اسی طرح نکال سکتا ہے جس طرح اس نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے نکالا تھا۔

نیا ایمان

لیکن اس کارِ عظیم کے لئے عالمِ اسلام کو خود تیاری اور اپنے میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی اس کے لئے پہلی تیاری یہ ہے کہ عالم اسلام، اسلام پر نیا اور تازہ ایمان لائے عالم اسلام کو نئے دین، نئے پیغمبر، نئی شریعت اور نئی تعلیم کی قطعاً ضرورت نہیں، اسلام آفتاب کی طرح نہ کبھی پرانا تھا نہ اب پرانا ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت دائمی اور آخری نبوت ہے، آپ کا دین محفوظ ہے اور آپ کی تعلیمات زندہ لیکن عالمِ اسلام کو بلاشبہ نئے ایمان کی ضرورت ہے، نئے فتنوں، نئی طاقتوں، نئی ترغیبوں نئی دعوتوں کا مقابلہ کمزور ایمان، اور مجرّد رسوم وعادات سے نہیں کیا جا سکتا، کوئی بوسیدہ عمارت کسی نئے طوفان اور کسی نئے سیلاب کو برداشت نہیں کر سکتی، پھر داعی کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اپنی دعوت پر غیر متزلزل یقین ہو اس میں ایک ایسے انسان کا جوش ہو جو کسی نئے عقیدہ پر نیا ایمان لایا ہے، ایک ایسے انسان کا سرور اور سرخوشی ہو جس نے کوئی نیا خزانہ پالیا ہو یا نیا ملک دریافت کیا ہو، عالم اسلام اگر دنیائے انسانیت میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کرنا چاہتا ہے اور دنیا کی موجودہ مادّہ پرستی اور شک و اضطراب پر فتح حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو اپنے اندر نئی ایمانی روح، تازہ یقین اور نیا جوش و خروش پیدا کرنا ہوگا۔

معنوی تیاری

عالم اسلامی کو اس مقدس فریضہ کو ادا کرنے کے لئے معنوی تیاری اور اندرونی

تبدیلی کی بھی ضرورت ہوگی، ظاہر ہے کہ عالم اسلام خدا ناشناس یورپ کا مقابلہ تمدن وتہذیب کے کھوکھلے مظاہر مغربی زبانوں کی مہارت اور زندگی کے اس رنگ ڈھنگ کے اختیار کر لینے سے نہیں کر سکتا جس کو قوموں کی ترقی میں کوئی دخل نہیں، وہ اپنا پیغام اس رُوح اور معنوی طاقت کی مدد ہی سے پہونچا سکتا ہے جس میں یورپ روز بروز دیوالیہ ہوتا جا رہا ہے، عالم اسلام اپنے مدِ مقابل پر صرف اسی صورت میں غلبہ حاصل کر سکتا ہے کہ وہ اپنے حریف سے ایمان میں فائق ہو، زندگی کی محبت اس کے دل سے نکل چکی ہو، خواہشات نفسانی کے بندے سے آزاد ہو چکا ہو، اس کے افراد شہادت کے حریص ہوں، جنت کا شوق ان کے دل میں چٹکیاں لیتا ہو، دنیا کا فانی مال ومتاع ان کی نگاہ میں وقعت نہ رکھتا ہو، اللہ کے راستہ کی تکلیفیں اور مصیبتیں وہ ہنسی خوشی برداشت کرتے ہوں، درحقیقت ایک خدا ناشناس منکرِ آخرت کے مقابلہ میں مومن کا یہی امتیاز ہے، اور اسی بنا پر اس سے یہ توقع کی گئی ہے کہ اس میں برداشت کی طاقت زیادہ ہوگی، قرآن مجید میں ہے:-

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ۔ (النساء-۱۰۴)	اور مخالف قوم کے تعاقب میں ہمت نہ ہارو، اگر تمہیں دُکھ پہنچتا ہے تو ان کو بھی دُکھ پہنچتا ہے جیسے تم کو پہونچتا ہے اور تم اللہ تعالیٰ سے ایسی ایسی چیزوں کی امید رکھتے ہو جن کی وہ امید نہیں رکھتے۔

واقعہ یہ ہے کہ مومن کی طاقت اور اس کے فتح وغلبہ کا راز یہ ہے کہ اس کو آخرت کا یقین اور اللہ کے اجر وثواب کی امید ہوتی ہے، اگر عالم اسلامی کے سامنے بھی تمام تر وہی دنیاوی مقاصد اور مادی منافع ہیں، اور وہ بھی محض محسوسات وماديات کے طلسم میں

گرفتار ہے، تو یورپ کو اپنی مادی طاقت صدیوں کی تیاری اور وسیع ساز و سامان کی بنا پر غلبہ اور اقتدار کا زیادہ حق ہے۔

عالمِ اسلام پر ایک طویل دور ایسا گزرا ہے کہ اس کو معنوی طاقت کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں تھا، اور نہ اس کو اس کی حفاظت کی فکر تھی، نہ وہ اس کو غذا پہونچانے کی طرف متوجہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے سوتے خشک ہوتے چلے گئے، اور تیزی سے اس میں انحطاط واقع ہوا اسی عرصہ میں عالمِ اسلامی کو مختلف مقامات اور مختلف اوقات میں ایسے معرکے پیش آئے جن میں اس کو ایمان و یقین، صبر و تحمّل اور ثبات و استقامت کی ضرورت بشدّت محسوس ہوئی اور جو ان صفات کے بغیر جیتے نہیں جا سکتے تھے، جب اسلامی طاقتوں کو دھکا لگا اور انھوں نے اس معنوی طاقت کا سہارا لینا چاہا جس کی جگہ مسلمانوں کے دل تھے تو ان کو اچانک یہ معلوم ہوا کہ یہ طاقت عرصہ ہوا گم ہو چکی ہے اور دل کی انگیٹھیاں سرد ہو چکی ہیں، اس وقت عالمِ اسلامی کو یہ محسوس ہوا کہ اس نے اس روحانی طاقت کی ناقدری کر کے اور اس سے غفلت برت کر اپنے اوپر بڑا ظلم کیا ہے، اس وقت اُس نے اپنے ذخیرہ کا جائزہ لیا تو اس کو کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جو اس خلا کو پُر کر سکے اور اس نقصان کی تلافی کر سکے۔

اسی عرصہ میں عالم اسلامی کو ایسے معرکے بھی پیش آئے جن میں اسلام کی عزت و حرمت کا سوال تھا، اس کو خیال تھا کہ تمام عالم کے مسلمانوں میں قیامت برپا ہو جائے گی اور وہ اسلام کی طرف سے مدافعت، مقاماتِ مقدّسہ کی حفاظت اور دینی جوش و حمیت میں از خود رفتہ ہو جائیں گے، اور تمام اسلامی ممالک میں آگ سی لگ جائے گی، لیکن عالم اسلام پر ان واقعات کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا، زندگی کے کام بدستور ہوتے رہے، کہیں کہیں سے

کچھ آواز بلند ہوئی اور خاموش ہو گئی، اور پھر دنیا اپنے کام میں لگ گئی، اس وقت عالم اسلام کے مفکرین اور اہلِ نظر کو معلوم ہوا کہ دینی حمیت اور اسلامی احساس کمزور پڑ چکا ہے، اور ایمان کا شعلہ اگر پورے طور پر بجھا نہیں تو بہت دب گیا ہے اس وقت دوسروں کو بھی عالم اسلام کی یہ کمزوری معلوم ہوئی اور اندرونی انحطاط اور اضمحلال کا احساس ہوا، اور اس کا وہ رُعب جاتا رہا جو اس کی مجاہدانہ تاریخ پڑھ پڑھ کے دل و دماغ پر پڑتا ہے۔

آج عالم اسلامی کے قائدین و مفکرین اور اس کی جماعتوں اور حکومتوں کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کا تخم دوبارہ بونے کی کوشش کریں، جذبۂ دینی کو پھر متحرک کریں، اور پہلی اسلامی دعوت کے اُصول و طریق کار کے مطابق مسلمانوں کو ایمان کی دعوت دیں اور اللہ و رسول اور آخرت کے عقیدہ کی پوری طاقت کے ساتھ دوبارہ تبلیغ و تلقین کریں، اس کے لئے وہ سب طریقے استعمال کریں، جو اسلام کے ابتدائی داعیوں نے اختیار کئے تھے، نیز وہ تمام وسائل اور طاقتیں کام میں لائیں جو عصرِ جدید نے پیدا کر دی ہیں۔

قرآن مجید اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت اب بھی زندگی اور طاقت کا ایسا سرچشمہ ہے جس سے عالم اسلام کی خشک رگوں میں زندگی کا گرم اور تازہ خون پھر دوڑ سکتا ہے، ان کے مطالعہ اور اثر سے اس جاہلی دنیا کے خلاف بغاوت کا جذبہ اُبھرتا ہے اور ان کی تاثیر سے ایک اونگھتی سوتی قوم ایک پُرجوش بے چین اور سرگرم عمل قوم بن جاتی ہے، ان کے اثر سے (اگر ان کو اثر کرنے کا موقع دیا جائے) پھر ایک بار ایمان اور نفاق، یقین اور شک، وقتی فوائد اور مستحکم عقائد، موقع پرست ذہنیت

اور حق پرست ضمیر، عقل مصلحت بیں اور عشق مصلحت سوز کے درمیان پھر معرکۂ کارزار گرم ہوتا ہے، پھر جسمانی راحت اور قلب کے سکون، تن آسانی کی زندگی اور شہادت کی موت کے درمیان کش مکش پیدا ہوتی ہے، وہ مبارک کش مکش جو ہر پیغمبر نے اپنے اپنے وقت میں پیدا کی تھی، اور جس کے بغیر حق و باطل کا فیصلہ اور اس دنیا کی اصلاح و انقلاب کا کوئی کام نہیں ہو سکتا، اس وقت عالم اسلامی کے گوشہ گوشہ اور مسلمانوں کے ایک ایک گھر اور ایک ایک خاندان میں ایسے صاحبِ ایمان نوجوان پیدا ہوں گے جن کی تعریف قرآن مجید میں اس طرح کی گئی ہے :۔

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ۝ وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ۝ (الکہف: ۱۳-۱۴)	وہ لوگ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اور ترقی کر دی تھی اور ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیئے جب کہ وہ (دین میں) پختہ ہو کر کہنے لگے کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے ہم تو اس کو چھوڑ کر کسی معبود کی عبادت نہ کریں گے کیونکہ اس صورت میں ہم نے یقیناً بڑی ہی بیجا بات کہی۔

اس وقت پھر دنیا میں ایک بار بلال و عمار، خباب و خبیب، صہیب و مصعب بن عمیر، عثمان بن مظعون اور انس بن النضر کے جوشِ ایمانی اور ایثار و قربانی کے نمونے نگاہوں کے سامنے آئیں گے، جنت کی ہوائیں اور قرنِ اول کے ایمانی جھونکے دوبارہ چلنے لگے

اور ایک نیا عالم اسلام ظہور میں آئے گا جس سے موجودہ عالم اسلام کو کوئی نسبت نہیں۔

موجودہ عالم اسلام کی بیماری، پریشانی اور بے اطمینانی نہیں ہے، بلکہ حد سے بڑھا ہوا اطمینان و سکون، دنیا کی زندگی پر قناعت اور حالات سے مصالحت ہے، آج دنیا کا عالمگیر فساد اور انسانیت کا زوال اور ماحول کی خرابی اس کے اندر کوئی بے چینی نہیں پیدا کرتی، اس کو زندگی کے اس نقشہ میں کوئی چیز غلط اور بے محل نظر نہیں آتی اس کی نظر اپنے ذاتی مسائل اور مادی فوائد سے آگے نہیں بڑھتی، اس کی موجودہ افسردگی اور مُردہ دلی کا سبب صرف یہ ہے کہ اس کا پہلو خلش سے اور اس کا دل تپش سے خالی ہے ؎

طبیبِ عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا
ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی

اس لئے ضرورت ہے کہ یہ مبارک کش کش پھر پیدا کی جائے، اور اس اُمت کا سکون برہم کیا جائے اس کو اپنی ذات اور اپنے مسائل کی فکر کے بجائے (جو جاہلی قوموں کا شعار ہے) انسانیت کا درد و غم، ہدایت و رحمت کی فکر اور آخرت اور محاسبۂ الٰہی کا خطرہ پیدا ہو، اس اُمت کی خیر خواہی اس میں نہیں ہے کہ اس کے لئے سکون و اطمینان کی دعا کی جائے بلکہ اس میں ہے کہ اس کے لئے درد و اضطراب کی دعا کی جائے اور برملا کہا جائے ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

شعور کی تربیت

کسی قوم کے لئے سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ وہ صحیح شعور سے خالی ہو،

ایک ایسی قوم جو ہر طرح کی صلاحیتیں رکھتی ہو اور دینی و دنیاوی دولتوں سے مالا مال ہو لیکن اس کو نیک و بد کی تمیز نہ ہو، وہ اپنے دوست و دشمن کو نہ پہچانتی ہو، پچھلے تجربوں سے فائدہ اُٹھانے کی اس میں صلاحیت نہ ہو، اپنے رہنماؤں اور قائدین کا احتساب کرنے کی اور قومی مجرموں کو سزا دینے کی اس میں جرأت نہ ہو، وہ خود غرض رہنماؤں کی چرب زبانی و شیریں کلامی سے مسحور ہو جاتی ہو اور ہر مرتبہ نیا دھوکا کھانے کے لئے تیار رہتی ہو، وہ قوم اپنی تمام دینی ترقیات اور دنیاوی سرفرازیوں کے ساتھ قابلِ اعتماد نہیں، وہ پیشہ ور اور خود غرض رہنماؤں اور منافق قائدین کا کھلونا بن جاتی ہے، ان کو قوم کی سادہ لوحی اور بے شعوری کی بنا پر من مانی کارروائیاں کرنے کا موقع ملتا ہے، اور ان کو اس کا اطمینان ہوتا ہے کہ کبھی ان کا محاسبہ اور ان سے باز پرس نہیں کی جائے گی۔

مسلم ممالک کے متعلق اگر ہم یہ کہنے سے احتیاط کریں کہ وہ بیداری اور شعور سے بالکل محروم ہیں تو اس میں شبہ نہیں کہ ان کا شعور بہت کمزور ہے اور وہ بیداری کی ابتدائی منزل میں ہیں، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ خیر خواہ اور بدخواہ کے ساتھ ان کا معاملہ تقریباً یکساں ہے، بلکہ بعض اوقات بدخواہ اور غیر مخلص اشخاص مسلمانوں میں زیادہ ہردلعزیز اور معتمد بن جاتے ہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "مومن سانپ کے ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا" لیکن مسلمان ممالک کے باشندے ہزار ہزار بار ڈسے جانے کے لئے تیار رہتے ہیں، ان کا حافظہ نہایت کمزور ہے، وہ اپنے قائدین اور رہنماؤں کے ماضی کو اور ماضی قریب کے واقعات کو فوراً بھول جاتے ہیں، ان کا دینی اور شہری شعور کمزور اور سیاسی شعور تقریباً ناپید ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ غالب قوموں اور خود غرض رہنماؤں کا بازیچۂ اطفال بنے ہوئے ہیں، اور آسانی کے ساتھ ان کا رُخ ہر طرف موڑا جا سکتا ہے، حکومتیں ان کی مرضی کے خلاف فیصلے

کرتی رہتی ہیں، اور جس طرف چاہتی ہیں، ایک لاٹھی سے ہانک لے جاتی ہیں۔

مغربی قومیں اپنے روحانی اور اخلاقی افلاس اور ان تمام خرابیوں کے باوجود جن کی تشریح ہم نے اس کتاب میں کی ہے شہری اور سیاسی شعور کی مالک ہیں، وہ سیاسی بلوغ کو پہونچ چکی ہیں، وہ اپنے نفع و نقصان کو پہچانتی ہیں، وہ مُخلص و مُنافق، اہل و نا اہل، کے فرق کو جانتی ہیں، وہ اپنی قیادت ایسوں کے سُپرد نہیں کرتیں جو نا اہل ضعیف اور خائن ہیں، وہ جب اپنے معاملات کسی کے سپرد کرتی ہیں تو ڈرتے ہوئے اور احتیاط کے ساتھ اور جس مرحلہ پر بھی ان کی نا اہلی یا خیانت کا اظہار ہوتا ہے، اور وہ یہ دیکھتی ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری ادا کرچکے اور ان کا کام ختم ہوگیا تو ان کو وہ اپنے منصب سے سبکدوش کردیتی ہیں، اور ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آتی ہیں جو ان سے زیادہ اہلیت کے مالک اور موقع کے مناسب ہوتے ہیں، اس موقع پر کسی رہنما یا معتمد کی سابقہ خدمات، شاندار ماضی اور کسی معرکہ میں نمایاں کامیابی اس قومی فیصلہ میں حائل نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ وہ قومیں سیاسی پیشہ وروں اور نا اہل اور خائن رہنماؤں سے محفوظ ہیں، ان کے سیاسی رہنما اور ان کے نمائندے بھی محتاط اور امانت دار بننے پر مجبور ہیں، وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں، قوم کی سرزنش عوام کے عتاب و احتساب اور رائے عامہ کی قہرناکی سے وہ لرزہ براندام رہتے ہیں۔

عالم اسلام کی ایک بہت بڑی ضرورت اور اس کی ایک بڑی خدمت یہ ہے کہ امت کے مختلف طبقات اور عوام میں صحیح شعور پیدا کیا جائے اور جمہور کی عقلی مدنی اور سیاسی تربیت کی جائے، یاد رہے کہ تعلیم کی اشاعت اور تعلیم یافتہ اشخاص کی کثرت سے یہ لازم نہیں آتا کہ قوم میں شعور بھی موجود ہے اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم کے عموم اور علوم کی اشاعت سے شعور کے بیدار کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے لیکن شعور پیدا کرنے کے لئے بہرحال مستقل

جدوجہد کی ضرورت ہے، مسلمان رہنماؤں اور مسلمانوں میں اصلاحی کام کرنے والوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جس قوم میں غور کی کمی ہے، وہ قوم اعتماد کے لائق نہیں، خواہ اس کو اپنے قائدین پر کتنا ہی اعتماد ہو اور وہ ان کی پیروی اور اطاعت میں کیسی ہی چستی اور سرگرمی دکھائے اور ان کی دعوت پر کتنی ہی عظیم قربانیاں پیش کرے اس لئے کہ جب تک اس کا شعور تیار نہیں اور وہ بالغ نظر اور پختہ خیال نہیں ہوئی ہر آن اس کا خطرہ ہے کہ وہ کسی دوسری دعوت اور تحریک کا آلۂ کار بن جائے گی اور آن کی آن میں سالہا سال کی محنت پر پانی پھر جائے گا جس قوم کا شعور بیدار نہیں ہوا اور جس میں خود سوچنے اور اچھا بُرا سمجھنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی اُس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پَر میدان میں پڑا ہو اور مختلف سمت کی ہوائیں اس کو اِدھر سے اُدھر اڑاتی پھرتی ہوں۔

اسلام اگرچہ ایک آسمانی مذہب ہے اور اس کی بنیاد وحی و نبوت پر ہے لیکن اس نے بھی اپنے پیروؤں میں ایک خاص شعور پیدا کیا جو شعور کی تمام اقسام میں زیادہ مکمل زیادہ وسیع اور کہیں زیادہ گہرا ہے، اس نے اپنے ماننے والوں میں ایک خاص قسم کا طریقِ فکر پیدا کیا جو جاہلی طریقِ فکر سے بالکل مختلف ہے اس نے اپنے ماننے والوں کو ایک بیدار اور خوددار شعور عطا کیا جو اپنی وسعت اور قدرتی لچک کے باوجود ان افکار و نظریات کو انگیز نہیں کر سکتا، جو اس کے مسلّمات سے جوڑ نہ کھاتے ہوں اور نہ اُن عناصر و اجزا کو ہضم کرنے کے لئے تیار ہے جو اس کی روح اور اس کے اُصول سے تضاد رکھتے ہوں۔

اس اسلامی شعور کی ایک مثال یہ ہے کہ اسلام کی دعوت اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تربیت و صحبت سے صحابہ کرام کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ ظلم ایک قبیح شئے اور دینی و اخلاقی جرم ہے، جو کسی کے لئے جائز نہیں وہ اس پر ایمان

لا چکے تھے کہ مسلمان کو ہر شخص کے ساتھ انصاف کرنا چاہئے، خواہ وہ قریب ہو یا بعید دوست ہو یا دشمن، اپنا ہو یا بیگانہ، انھوں نے جاہلانہ حمیت اور قومی قبائلی اور خاندانی تعصبات سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی تھی اور سمجھ لیا تھا کہ اسلام میں اس اندھے تعصب کی کوئی جگہ نہیں مسلمان کے لئے لازم ہے کہ وہ حق کا ساتھ دے خواہ حق کسی طرف ہو، یہ ان کا عقیدہ بن گیا تھا، اور ان کے خمیر میں داخل ہو گیا تھا۔

ایک دن اچانک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان سے وہ سنتے ہیں کہ "اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو خواہ مظلوم" اگر ان کی تربیت میں ذرا بھی خامی اور ان کے ذہن میں کچھ بھی انتشار ہوتا تو وہ خاموشی کے ساتھ اس بات کو سن لیتے اور اس قول کو اس کے جاہلی مفہوم میں قبول کر لیتے جس کے مطابق ان کا نشو ونما ہوا تھا اور ساری عمر اسی پر عمل کرنے میں گزری تھی، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم (دین کی) کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے وہ سراسر وحی ہوتی ہے، ان سے بڑھ کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ادب کرنے والا اور آپ کی تمام باتوں کو بے چون وچرا تسلیم کرنے والا نہیں تھا، لیکن بایں ہمہ وہ خاموش نہ رہ سکے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ان کے عقیدہ اور اس فکر وفہم سے ٹکرایا جو آپ ہی کی تعلیمات وتربیت کا نتیجہ تھا، اس سے ان کے اسلامی شعور پر ایک ضرب لگی اور ان کے دماغ کی چولیں ہل گئیں وہ اپنی اس تکلیف کو چھپا نہ سکے اور انھوں نے استعجاب کے ساتھ پوچھا کہ ہم مظلوم کی تو مدد کریں لیکن ظالم کی کیسے مدد کریں؟ اس پر آنحضرت (صلعم) نے اپنے قول کی شرح فرمائی کہ ظالم بھائی کی مدد یہ ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا جائے اور اس کو ظلم سے باز رکھا جائے، یہ سنتے ہی گرہ کھل گئی اور ان کے اسلامی ذہن نے اس ارشاد کو اس طرح قبول کیا جیسے ایک جانی بوجھی

حقیقت ہوتی ہے یہ اسلامی شعور کی نزاکت اور اسلامی ذکاوتِ حس کی واضح مثال ہے۔

ایک دوسری مثال یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج بھیجی اور ایک صحابی کو اس کا امیر بنایا اور ان کو امیر کی اطاعت کی تاکید فرمائی، وہاں یہ واقعہ پیش آیا کہ امیر اس سفر میں کسی بات پر ناراض ہوگئے، جس کی وجہ سے انھوں نے آگ جلوائی اور اپنے رفیقوں کو اس میں داخل ہونے کا حکم فرمایا انھوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم نے تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا اتباع آگ سے نجات حاصل کرنے ہی کے لئے کیا تھا کیا اب اس میں داخل ہو جائیں؟ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس فعل کی تصویب کی اور فرمایا کہ اگر وہ آگ میں کود پڑتے تو کبھی نہ نکلتے، صحابہ کرام کا یہ انکار اسی بنا پر تھا کہ وہ اس اصول پر ایمان لا چکے تھے کہ خالق کی نافرمانی کے ساتھ کسی مخلوق کی فرمانبرداری صحیح نہیں[1]، اور یہ کہ اطاعت اسی وقت فرض ہے، جب نیک بات کا حکم دیا جائے۔

اسلامی شعور اور اسلامی تربیت کی وجہ سے صحابۂ کرام کسی غلط کام اور کسی ناانصافی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، خواہ اس کا صدور خلیفۂ وقت سے کیوں نہ ہو وہ اگر خلیفہ کی کوئی زیادتی دیکھتے تو بر سرِ منبر اس کو ٹوک دینے میں ان کو تامل نہ ہوتا، حضرت عمرؓ خطبہ کے لئے کھڑے ہوتے ہیں، ان کے جسم پر پورا جوڑا ہے، جوڑا دو کپڑوں پر مشتمل ہوتا ہے، اور فرماتے ہیں لوگو! سنئے نہیں مسلمان کہتے ہیں ہم نہیں سنتے، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کیوں؟ وہ کہتے ہیں کہ تم نے ہم کو تو ایک ایک کپڑا تقسیم کیا اور تم پورے جوڑے میں ملبوس ہو، وہ فرماتے ہیں، عجلت مت کرو پھر اپنے صاحبزادہ عبداللہ کو آواز دیتے ہیں پہلی آواز پر کوئی جواب نہیں ملتا پھر فرماتے ہیں کہ اے عمر کے بیٹے عبداللہ! عبداللہ ابن عمرؓ جواب دیتے ہیں، آپ فرماتے ہیں کہ میں نے جس کپڑے کی

---

[1] لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔ (حدیث شریف)

تہبند باندھ رکھی ہے، یہ تمہارا ہی کپڑا ہے؟ وہ اثبات میں جواب دیتے ہیں اس پر مسلمان کہتے ہیں۔ ہاں امیر المومنین اب فرمائیے ہم سب سنیں گے۔

اس اسلامی شعور اور اسلامی تربیت کا نتیجہ یہ تھا کہ بنی اُمیہ کو اپنا شاہی اقتدار قائم رکھنے میں بڑی زحمتیں پیش آئیں، اسلامی روح نے بارہا اس اقتدار کے خلاف سخت احتجاج کیا اور بارہا اس عرب شاہی کے خلاف علم جہاد بلند ہوا، اموی فرمانرواؤں کو اس وقت تک سکون و اطمینان حاصل نہیں ہوا جب تک وہ نسل ختم نہیں ہوگئی جس نے اسلامی اصول پر تربیت پائی تھی، اور جو خلافتِ اسلامی اور اسلام کے نظامِ حکومت اور طریقِ حکمرانی سے عشق رکھتی تھی، اور اس سے انحراف کو بدعت اور تحریف کا مرادف سمجھتی تھی۔

یہی نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کسی طرح کی اصلاح اور کوئی معاشرتی یا سیاسی انقلاب شعور کی بیداری اور ذہنوں کی تیاری کے بغیر وقوع میں نہیں آتا، اگرچہ انقلابِ فرانس کا تذکرہ اسلامی دعوت و انقلاب کے تذکرہ کے سلسلہ میں سوءِ ادب سے خالی نہیں، اور یہ ایک ناقص اور محدود قسم کا انقلاب تھا، جو جذباتی جوش اور بے اعتدالیوں سے پاک نہیں تھا، تاہم اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جب کسی معاشرہ یا ملک کا شعور بیدار ہو جاتا ہے، اور ذہنوں کا رُخ کسی خاص طرف ہو جاتا ہے تو اس سیلاب کا تھامنا بڑی سے بڑی چٹان کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے، انقلابِ فرانس کے رہنماؤں نے جن میں سے بہت سے لوگ بڑی اچھی ذہنی، علمی اور ادبی صلاحیتوں کے مالک تھے اور جن کے جلو میں ادیبوں، افسانہ نگاروں اور اہل قلم کا ایک لشکر تھا، انھوں نے ایک خاص مقصد کے لئے فرانسیسی عوام کے شعور کی تربیت کی، عوام کے دل میں ملک کے فرسودہ نظام کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا کیا، پرانی اخلاقی قدروں اور تصورات وروایات کے خلاف ایک عام بے اطمینانی اور بیزاری پیدا کردی، اور ماحول اور خارجی دنیا سے

پہلے دلوں کے اندر انھوں نے غم وغصہ اور نفرت وحقارت کی ایک آگ روشن کردی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت کا سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام لوگوں کے لئے ناقابل برداشت بن گیا، حریت، اخوت ومساوات کے کلمات محبوب اور مقدس بن گئے اور ہر فرانسیسی کا وظیفہ اور تکیہ کلام بن گیا، اس وقت یہ بغاوت ابھری جوش وغضب کا کوہ آتش فشاں پھٹا، اور پرانے معاشرہ کا قصر زمین پر آرہا، اگرچہ اس انقلاب کے رہنما اس کو انسانیت کے لئے زیادہ مفید نہ بنا سکے (اور شاید ان کے پیش نظر یہ تھا بھی نہیں) لیکن انھوں نے ملک میں انقلاب کردیا اور اس انقلاب کو کوئی طاقت روک نہ سکی، اس لئے کہ اس انقلاب کا چشمہ لوگوں کے دل ودماغ کے اندر سے ابلا تھا، اور اس کی پشت پر قوم کی رائے عامہ اور جمہور کی خواہش تھی اور شعور اس کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

آج جس چیز کو یورپ نے مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے اور ان کمزوریوں کے ساتھ جن کے ساتھ کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی وہ صرف زندہ ہی نہیں بلکہ برسرِ اقتدار ہے، وہ شہری زندگی کی ذمہ داریوں کا احساس اور سیاسی شعور ہے، ابھی تک انگریزوں اور امریکیوں میں ایسے لوگوں کی مثالیں شاذونادر ہیں جو قومی خیانت کا ارتکاب کرتے ہوں یا اپنے ملک کو سستے داموں فروخت کر ڈالتے ہوں، یا جو حکومت کے اسرار فاش کردیتے ہوں، یا خراب و ناکارہ اسلحہ اور ذخیرۂ جنگ کی خریداری کے مجرم ہوں، ایسی مثالیں مشرق میں اور یورپ میں بہت کمیاب اور تقریباً نایاب ہیں، یورپ کا اخلاقی بگاڑ انفرادی دائروں میں محدود ہے، اس کے ذمہ دار بیشک بڑے سے بڑا جھوٹ بول سکتے ہیں، قوموں کو دھوکا دے سکتے ہیں اور بڑی بڑی قوموں کو پامال کرسکتے ہیں، مگر یہ اپنے ذاتی فوائد اور اغراض کے لئے نہیں، بلکہ قومی وملکی مصالح کے لئے، یقیناً اسلام میں ان مجرمانہ افعال کی گنجائش نہیں اور بداخلاقی خواہ فرد کے ساتھ ہو یا جماعت کے ساتھ، خواہ انفرادی محرکات کی بنا پر یا اجتماعی محرکات وقومی محرکات کی بنا پر بداخلاقی ہی ہے، لیکن

مغربی جو کچھ کرتا ہے ایک شعور اور اپنے مخصوص فلسفۂ اخلاق کے تحت مشرق جو کرتا ہے بے شعوری اور شخصی اعراض و محرکات کے ماتحت۔

مسلمان ممالک کے قائدین اور اہلِ اقتدار سے کچھ بعید نہیں کہ وہ کبھی اپنے کسی حقیر فائدہ یا لذت و خواہش کے ماتحت اپنے ملک کو رہن رکھ دیں یا اس کا بیعنامہ کر دیں، یا اپنی قوم کو بھیڑ بکری کی طرح فروخت کر دیں یا اپنی قوم کو کسی ایسی جنگ میں جھونک دیں جو اس کی مرضی و مصلحت کے خلاف ہو، اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ قوم اس کے باوجود بھی ان کی قیادت کا جھنڈا لے کر چلتی ہے، وہ ان کی زندگی کے نعرے لگائے اور ان کی تعریف میں رطب اللسان رہے، یہ صورت حال اس کے سوا اور کس بات کی دلیل ہے کہ قوم کا ضمیر مردہ، اس کے قوائے فکریہ معطل، اور وہ شعور کی دولت سے محروم ہے۔

بہت سے مسلمان ملک ایسے ہیں، جہاں عوام کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے، جہاں عوام صرف محنت و مشقت کے لئے اور خواص صرف عیش و عشرت کے لئے ہیں، اللہ تعالیٰ کی کھلی کھلی نافرمانیاں ہوتی ہیں، اور انسانیت سوز افعال و جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے، شریعت کے احکام پامال کئے جاتے ہیں لیکن نہ عوام اور جمہور مسلمین میں اس سے غم و غصہ کی کوئی لہر پیدا ہوتی ہے، نہ کسی قلب کو اس سے اذیت پہونچتی ہے، یہ سب درحقیقت انسانی غیرت اور اسلامی خودداری کے فقدان کا نتیجہ ہے، اور نہایت خطرناک صورتِ حال ہے۔

کسی انقلاب اور کسی بغاوت کی کوئی قیمت نہیں (خواہ ظاہری طور پر وہ ملک و قوم کے لئے کتنی ہی مفید ہو) جب تک کہ اس کی بنیاد میں کوئی پختہ عقیدہ، فکر صحیح، اور تربیت یافتہ اور عاقلانہ شعور نہ ہو، جب تک کہ رائے عامہ پورے طور پر تیار نہ ہو، اس وقت تک کسی بادشاہ کی جلاوطنی، کوئی انقلاب حکومت اور وزارت کی کوئی تبدیلی کوئی اہمیت

نہیں رکھتی اور بالکل قابل اعتبار نہیں ہے اگر قوم میں ان افعال اور اس رویہ سے نفرت نہیں ہے تو ایک غلط شخص یا غلط جماعت کی جگہ پر دوسرا غلط شخص اور دوسری غلط جماعت آسکتی ہے، اور ہوسکتا ہے کہ قوم کو اس کا احساس بھی نہ ہونے پائے، اس لئے اصل قابلِ اعتبار چیز یہ ہے کہ قوم کا ضمیر اور شعور اتنا بیدار ہو جائے کہ وہ کسی غلط چیز اور مجرمانہ فعل کو کسی حالت میں اور کسی شخص کے لئے بھی برداشت نہ کرسکے۔

اس لئے عالم اسلام کی بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ اس میں صحیح شعور پیدا کیا جائے ایسا شعور جو نہ کسی ظلم و ناانصافی کو برداشت کرسکے، نہ دین و اخلاق سے انحراف کو، جو صحیح اور غلط، خلوص اور نفاق، دوست اور دشمن، مُصلح اور مُفسد کے درمیان آسانی سے تمیز کرسکے، مجرم اس کی ناراضگی اور عتاب سے بچ نہ سکیں اور مخلص اس کے اعتراف اور قدر شناسی سے محروم نہ رہیں، وہ اپنے تمدنی، سیاسی، اجتماعی اور دینی مسائل و معاملات میں ایک عاقل و بالغ انسان کی طرح غور کرسکنے، اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو جب تک یہ شعور نہ پیدا ہو، کسی اسلامی ملک و قوم کا جوشِ عمل، صلاحیتِ کار دینی جذبات اور مذہبی زندگی کے مظاہر و مناظر کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

خود غرضی اور نفس پرستی کی گنجائش نہیں

الف لیلے کی کتاب اس دور کی نمائندگی کرتی ہے جس میں زندگی صرف ایک فرد اور ایک شخص کے گرد گھومتی نظر آتی ہے جس کو خلیفہ یا بادشاہ کہتے تھے، یا چند افراد کے ایک مختصر مجموعہ کے ارد گرد جو وزراء اور شہزادے کہلاتے تھے، زمین اس خوش نصیب فرد کی ذاتی ملکیت تصور کی جاتی اور قوم غلاموں اور زرخریدوں کی ایک ٹولی ہوتی تھی اور یہ شخص ان کے

مال ومتاع جائداد واملاک اور عزت وآبرو کا مالک سمجھا جاتا اور پوری قوم دراصل اس ایک فرد کا سایہ تھی، پوری زندگی اپنی تاریخ، علوم، ادبیات، شعر وشاعری کے ساتھ اسی کے گرد چکر کاٹتی اور اسی کا طواف کرتی تھی، اگر کوئی شخص اس عہد پر نظر ڈالتا اور اس دور کے ادب ولٹریچر کا جائزہ لیتا تو وہ دیکھتا کہ وہ شخصیت اس زمانہ کی سوسائٹی پر اس طرح حکمراں اور مسلط ہے جس طرح ایک قوی ہیکل درخت اپنے نیچے اگنے والے چھوٹے چھوٹے پودوں اور گھاس پھوس پر اپنے بازو پھیلائے رہتا ہے اور ہوا اور سورج کی گرمی روکتا رہتا ہے، بالکل اسی طرح پوری قوم اس ایک فرد کی شخصیت میں جذب ہو جاتی، پھر نہ اس کی کوئی مستقل شخصیت تھی نہ ارادہ، نہ آزادی اور نہ احساس خودداری۔

یہ فرد وہ ہوتا جس کے لئے زندگی کا پہیہ گھومتا تھا، اسی کے لئے کسان ہل چلاتا اسی کے لئے تاجر محنت کرتا، اسی کے لئے کاریگر اور صنّاع اپنا جوہر دکھاتے، اسی کی خاطر مُصنّفین کتابیں لکھتے اور شاعر اپنی قوتِ گویائی کا مظاہرہ کرتے، اسی کے لئے لڑکے پیدا ہوتے، اور اسی راستہ میں لشکر حملہ کرتے، بلکہ اسی کی خاطر زمین اپنے خزانے اگلتی، اور سمندر اپنی نعمتیں پھینکتا، اور عوام جو درحقیقت اس سب دولت وثروت اور زرخیزی وشادابی کے باعث ہوتے اور ان سب کا دارومدار انھیں پر ہوتا، وہ غلاموں کی طرح دن کاٹتے، بادشاہ کے خوانِ نعمت سے جو کچھ بچ رہتا ہے وہ اسی پر خوش ہوتے، اور شاہی افراد سے کچھ مل جاتا تو اس پر شکر ادا کرتے اور اگر اس سے بھی محروم رہتے تو صبر وتوکل اختیار کرتے، ان کی انسانیت مرجاتی تو ان کو افسوس نہ ہوتا اور وہ چاپلوسی اور موقع پرستی کا راستہ اختیار کر لیتے۔

یہ وہ عہد تاریخ ہے جو مشرق میں خوب پھلا پھولا اور اس نے سوسائٹی پر اثرات

چھوڑے ادبیات، شاعری، تمدن واجتماع سب پر اثر انداز ہوا، عربی کتب خانہ پر اس کے گہرے اثرات پڑے انھیں اثرات کا ایک جیتا جاگتا مرقّع الف لیلے کی کتاب ہے، جو اس عہد کی تصویر کشی کرتی ہے جب بغداد کا کوئی خلیفہ یا دمشق اور قاہرہ کا کوئی بادشاہ سب کچھ ہوتا تھا، اس کی حیثیت افسانۂ زندگی کے ہیرو اور مرکزی نقطہ کی ہوتی تھی۔

یہ عہد جس کا نقشہ الف لیلے کے قصّوں اور کہانیوں میں کھینچا گیا ہے اور "اغانی" کی تاریخ وادب میں جس کی تصویر لی گئی ہے، وہ نہ اسلامی عہد تھا نہ عقل اور منطق کی کسوٹی پر پورا اترتا تھا اس کو اسلام بھی نا قابل قبول قرار دیتا ہے، اور عقل بھی اس کا انکار کرتی ہے، اسلام اس غیر فطری عہد کے زوال کا پیغام تھا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس عہد کا نام "جاہلیت" رکھا اس پر نفرین کی، اس کے علمبردار اور فرمانروا، کسریٰ وقیصر کے خاتمہ کی خبر دی۔

یہ عہد کسی زمانہ میں اور دنیا کے کسی حصّہ میں بھی زندگی کی صلاحیت اور باقی رہنے کا استحقاق نہیں رکھتا، یہ اسی وقت باقی رہ سکتا ہے، جب لوگ حالات سے بے بس اور مجبور ہو گئے ہوں یا بیداری اور شعور کی دولت سے محروم ہو چکے ہوں، اور ان کی زندگی دم توڑ چکی ہو۔

اس صورتِ حال کو عقل برداشت نہیں کر سکتی، کون شخص اس کو پسند کرے گا کہ چند افراد کو کھانے پینے کی زیادتی کی وجہ سے تخمہ ہو جائے اور دوسری طرف ہزاروں آدمی بھوک اور فاقہ کشی سے جان دے رہے ہوں، کس کو یہ اچھا لگے گا کہ ایک بادشاہ اس کے بیٹے مال ودولت کے ساتھ مجنونوں کی طرح کھیلیں اور لوگوں کو زندہ رہنے کے لئے ایک وقت کا کھانا اور ستر پوشی کے لئے ایک کپڑا نصیب نہ ہو، اس پر کون راضی

ہو سکتا ہے کہ ایک طبقہ جو اکثریت میں ہو اس کا کام تو صرف یہ ہو کہ پیداوار بڑھائے زمین سے غلہ پیدا کرے صبح سے شام تک بیل کی طرح جتا رہے اور ایک طبقہ جو انگلیوں پر گنا جاتا ہو اس کا کام یہ ہو کہ ان کی محنتوں اور عرق ریزیوں کا ثمرہ کھائے اور ان نعمتوں سے فائدہ اٹھائے اور یہ سب شکر و احسان مندی کے ایک کلمہ کے بغیر اور احساس و شعور سے بالکل خالی ہو کر، یہ کون گوارا کر سکتا ہے کہ اہل صنعت و حرفت، اہل عقل و خرد، ارباب کمال اور مختلف صلاحیتیں اور ذہنی طاقتیں رکھنے والے لوگ ہمیشہ تکلیف ہی اٹھاتے رہیں اور وہ لوگ عیش کریں اور رنگ رلیاں منائیں جن کو اسراف و فضول خرچی کے سوا کچھ نہیں آتا جو فسق و فجور میں ڈوبے رہنے اور شرابیں پینے کے علاوہ کوئی کام نہیں جانتے، یہ کس کی نگاہ دیکھ سکتی ہے کہ اہلیت رکھنے والے، ارباب دانش، امین و دیانت دار، عالی دماغ اور دقیق النظر لوگوں سے اچھوتوں کا سا برتاؤ کیا جائے، اور بادشاہ اور امراء و رؤساء کے اردگرد خبیس النفس دنی الطبع بے دماغ، اور ضمیر فروشوں کی ایک ٹولی ہو جن کی سب سے بڑی فکر حصول دولت اور نفسانی خواہشات کی تسکین ہو، جنھوں نے اس دنیا میں چاپلوسی اور خوشامد اور بے گناہوں کے خلاف سازش کے علاوہ کوئی فن نہ سیکھا ہو اور جن کی آنکھوں کا پانی مر چکا ہو اور ان کا شعور و احساس فنا ہو گیا ہو۔

یہ ایک غیر طبعی حالت ہے جس کو ایک دن بھی باقی نہ رہنا چاہئے نہ کہ برسوں تک! اگر تاریخ کے کسی دور میں یہ صورت حال پیدا ہوئی اور عرصہ دراز تک قائم رہی تو یہ قوم کی غفلت و لاپرواہی کا نتیجہ تھی، یا اس کی مرضی اور پسند کے خلاف زبردستی اس کے سر تھوپی گئی، اور اسلام کے ضعف اور جاہلیت کی قوت کی وجہ سے ایسا ہوا

لیکن جب اسلام کا آفتاب طلوع ہوا شعور بیدار ہوا اور قوم میں احتساب اور جائزہ کی شان پیدا ہوگئی تو یہ ساری عمارت فوراً منہدم ہوگئی۔

آج جو لوگ الف لیلیٰ کی دنیا میں رہتے ہیں وہ خواب کی دنیا میں رہتے ہیں، وہ ایسے گھر میں بسیرا ڈالے ہوئے ہیں، جو مکڑی کے جالے سے زیادہ کمزور ہے، وہ ایسے گھر میں زندگی گزار رہے ہیں جو ہر وقت خطرات سے گھرا ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس پر کب کدال پڑنے لگیں اور کب چھت ٹوٹ کر گر پڑے۔

الف لیلہ کا زمانہ گیا اور اس کی بساط الٹ چکی، عالم اسلام کو اپنے نفس کو دھوکہ نہیں دینا چاہیئے اور اپنے کو گاڑی کے اس پہیہ سے نہیں باندھنا چاہیئے جو ٹوٹ چکا ہے، خود غرضی اور نفس پرستی ایک چراغ سحری ہے جس کا تیل ختم ہو چکا ہے، اس کا فتیلہ جل کر خاک ہو گیا ہے، وہ بجھ جائے گا ہوا کا جھونکا آئے یا نہ آئے۔

اسلام میں اس طرح کی انانیت اور خود غرضی کی کوئی گنجائش نہیں، اس میں شخصی برتری یا خاندانی برتری اور خود غرضی کو بیر رکھنے کی بھی جگہ نہیں جو آج بعض مشرقی قوموں اور اسلامی ملکوں میں پائی جاتی ہے اس میں اس وسیع اور منظم خود غرضی کی بھی کوئی جگہ نہیں جو آج یورپ امریکہ اور روس میں نظر آتی ہے، یورپ میں اس کی شکل ایک پارٹی اور جماعت کے اقتدار و تسلّط کی ہے، اور امریکہ میں سرمایہ داروں کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے، روس میں وہ اس چھوٹے سے گروہ کی شکل میں سامنے آتی ہے، جو کمیونزم پر ایمان لا چکا ہے، وہ اکثریت پر زبردستی سے حاوی ہے اور مزدوروں اور قیدیوں کے ساتھ اس سفاکی اور سنگدلی اور بے دردی کے ساتھ سلوک کرتا ہے جس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

یہ انانیت اور خود غرضی اپنی تمام صورتوں شکلوں کے ساتھ ختم ہو کر رہے گی، زخم خوردہ انسانیت

اس سے سخت انتقام لے گی، دنیا کی، دنیا کا مستقبل اب صرف عدل پسند، رحم دل، متوازن اسلام کے ساتھ وابستہ ہے، چاہے "خود غرضی" کو تھوڑی سی اور مہلت مل جائے، چاہے اس کی لگام ذرا ڈھیلی ہو جائے اور چاہے اس کو اپنی سرکشی، گمراہی، طغیانی میں گزارنے کے لئے کچھ دن اور مل جائیں۔

خود غرضی اور انانیت شخصی ہو یا خاندانی، جماعتی ہو یا طبقاتی، قوم کی زندگی کے لئے ایک غیر طبعی چیز ہے جس سے اس کو پہلی فرصت میں چھٹکارا حاصل کرنا ہے، نہ اسلام میں اس کی کوئی جگہ ہے، نہ اس بیدار سوسائٹی میں جو بلوغ اور سنِ رُشد کو پہونچ گئی، مسلمانوں کے لئے اور عربوں کے لئے اور ان کے رہنماؤں اور حکمرانوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اس سے آزاد ہو جائیں اور اس سے اپنا تعلق منقطع کرلیں قبل اس کے کہ وہ اپنے ساتھ ان کو بھی لے ڈوبے۔

مشرق میں بھی اب اس کوتاہ نظری کا چل چلاؤ ہے، اور اس کا وقتِ سفر قریب ہے، اس کے عروج و اقبال کے تارے غروب ہونا شروع ہو گئے ہیں، یہ زید اور عمرو و بکر کا مسئلہ نہیں، یہ ایک عہد کا مسئلہ ہے جو ختم ہو رہا ہے، ایک مدرسۂ فکر اور مکتبِ خیال کا معاملہ ہے، جس کا دمِ واپسیں ہے، جو ابھی تک اس کے سہارے جی رہے ہیں، ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ سفینہ اب ڈوبنے والا ہے۔

صنعتی اور جنگی تیاری

عالمِ اسلامی کا کام یہاں ختم نہیں ہو جاتا، اگر اس کو اسلام کے پیغام کی اشاعت کی خواہش ہے، اور وہ دنیا کی قیادت و رہنمائی کا فرض انجام دینا چاہتا ہے تو اس کو اس کے لئے ممتاز قوت اور تربیت، صنعت و علوم، تجارت اور فنِ حرب میں مکمل تیاری کی ضرورت

ہوگی اس کو زندگی کے ہر شعبہ اور اپنی ہر ضرورت میں مغرب سے مستغنی اور بے نیاز ہونا پڑے گا، وہ اس سطح پر ہو کر اپنے لئے پہننے اور کھانے کا سامان کر سکے، اپنے لئے ہتھیار تیار کر سکے اپنی زندگی کے معاملات کا انتظام اس کے ہاتھ میں ہو، اپنی زمین کے خزانے وہ خود برآمد کر سکے اور اس سے فائدہ اٹھا سکے اپنی حکومتوں کو اپنی دولت اور اپنے آدمیوں کے ذریعہ چلائے اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سمندروں میں اس کے بحری بیڑے اور جہاز شور کر رہے ہوں وہ دشمن کا مقابلہ اپنے یہاں کے جنگی جہازوں توپوں اور ہتھیاروں سے کرے اس کی برآمد اس کی درآمد سے زیادہ ہو اور اس کو مغربی ممالک سے قرض لینے کی ضرورت پیش نہ آئے اس کو اس کے کسی جھنڈے کے نیچے نہ آنا پڑے اور وہ کسی کیمپ میں شامل ہونے پر مجبور نہ ہو۔

جب تک عالم اسلامی علم و سیاست صنعت و تجارت میں مغرب کا محتاج رہے گا، مغرب اس کا خون چوستا رہے گا، اسی کی زمین کا آبِ حیات نکلے گا اس کا سامانِ تجارت اور مصنوعات ہر روز اس کی منڈیوں، بازاروں اور جیبوں پر چھاپہ مارا کریں گی اور اس کی ہر چیز پر ہاتھ صاف کرتی رہیں گی، جب تک عالم اسلامی مغرب سے قرض لیتا رہے گا اور اپنی حکومت کا انتظام کرنے اہم اور کلیدی عہدوں کو پُر کرنے اپنی فوج کو ٹریننگ دینے کے لئے مغرب کے آدمیوں کا رہینِ منت رہے گا، وہاں کا سامانِ تجارت و صنعت منگائے گا، اور اس کو اپنا اتالیق اور استاد مُربی اور سرپرست حاکم اور سردار سمجھے گا اس کے حکم اور اس کی رائے کے بغیر کوئی کام نہیں کرے گا، اس وقت تک وہ مغرب سے مقابلہ کرنا تو درکنار اس سے آنکھیں بھی نہیں ملا سکتا۔

یہ علمی اور صنعتی زندگی کا وہ شعبہ تھا جس کے بارہ میں عالم اسلامی نے عہد ماضی میں کوتاہی سے کام لیا اور جس کی تعزیر میں اس کو طویل اور ذلیل زندگی کا مزہ چکھنا پڑا اور اس پر مغربی قیادت اور سرداری مسلط کی گئی جس نے دنیا میں تباہی و غارت گری

قتل وخوں ریزی اور خود کشی برپا کی اب اگر اس موقع پر بھی عالم اسلامی نے علمی وصنعتی تیاری اور اپنی زندگی کے معاملات میں آزادی کے بارہ میں غفلت برتی اور اس مرتبہ بھی اس سے یہ چوک ہوگئی تو دنیا کی تقدیر میں بدنصیبی اور شقاوت لکھ دی جائے گی اور انسانیت کے ابتلا کی مدت اور طویل ہوجائے گی۔

نئی علمی تنظیم

عالم اسلامی کے لئے ضروری ہے کہ علم کی اس طرح تنظیم جدید کرے جو اس کی روح اور اس کے پیغام سے مطابقت رکھتی ہو، عالم اسلامی نے قدیم دنیا پر اپنی علمی سیادت کا سکہ جما دیا تھا اور دنیا کی عقلیت وثقافت (کلچر) کے رگ وریشہ میں سرایت کر گیا تھا اس نے دنیا کے ادب اور فلسفہ کے جگر میں نشیمن بنایا تھا، صدیوں متمدن دنیا اس کی عقل سے سوچتی رہی اسی کے قلم سے لکھتی رہی اور اسی کی زبان میں تصنیف وتالیف کرتی رہی، چنانچہ ایران ترکستان، افغانستان اور ہندوستان کے مصنفین اور اہل علم اگر کوئی اہم کتاب لکھنا چاہتے تھے تو عربی ہی میں لکھتے تھے، اور بعض لوگ اصل کتاب عربی میں لکھتے اور اس کی تلخیص فارسی میں کرتے جیسا کہ امام غزالیؒ نے "کیمیائے سعادت" میں کیا اگرچہ یہ علمی تحریک جو عہد عباسی کے آغاز میں شروع ہوئی تھی یونان اور عجم سے متاثر تھی، اور اسلامی اسپرٹ اور اسلامی فکر کی بنیاد پر قائم نہیں تھی اور اس میں علمی ودینی حیثیت سے متعدد خامیاں اور کمزوریاں تھیں، لیکن اپنی قوت اور تازگی کی وجہ سے وہ پوری دنیا پر آندھی پانی کی طرح چھا گئی اور قدیم علمی نظام اس کے سامنے ٹھٹھر کر رہ گئے۔

پھر یورپ کی ترقی اور عروج کا زمانہ آیا اس نے اس قدیم نظام کو اپنے تجربات

اور علمی تنقید سے تقویم پارینہ بنادیا اور اس کی جگہ تعلیم و تدریس کا نیا نظام تیار کیا، جو اس کی روح، عقلیت اور نفسیات کا کامیاب نمونہ تھا، جو طالب علم اس علمی ماحول سے فارغ ہو کر نکلتا اس کی رگ رگ میں یہ اسپرٹ کام کرتی ہوتی' دنیا نے دوسری بار اس تعلیمی نظام کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور عالم اسلامی کو بھی قدرتی طور پر اس کے سامنے سر جھکانا پڑا جو عرصہ سے علمی انحطاط اور فکری جمود کا بیمار تھا، اور احساس کمتری کی بنا پر اپنی نجات صرف یورپ کی تقلید میں منحصر سمجھتا تھا، اس نے اس تعلیمی نظام کو اس کی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود قبول کر لیا اور وہی نظام آج عالم اسلامی کے گوشہ گوشہ پر حاوی ہے۔

اس نظام کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی نفسیات اور جدید نفسیات میں ایک کش مکش برپا ہو گئی اسلامی اخلاق اور مغربی طرز اخلاق میں رسہ کشی شروع ہوئی' اشیاء اور اس کی قدر و قیمت کی جدید میزان اور قدیم میزان میں ایک جنگ شروع ہو گئی' اس نظام کا ایک ثمرہ یہ نکلا کہ تعلیم یافتہ اور مہذب طبقہ میں شک اور نفاق، بے صبری' زندگی سے عشق اور بوالہوسی، نقد کی ادھار پر ترجیح کی ذہنیت پیدا ہو گئی اور اس طرح کے دوسرے عیوب پیدا ہو گئے جو مغربی تہذیب کا لازمہ ہیں۔

اگر عالم اسلامی کی خواہش ہے کہ نئے سرے سے وہ اپنی زندگی شروع کرے اور غیروں کی غلامی سے آزاد ہو' اگر وہ عالم گیر قیادت حاصل کرنا چاہتا ہے تو صرف تعلیمی خود مختاری ہی نہیں بلکہ علمی لیڈر شپ بھی بہت ضروری ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں یہ مسئلہ بہت گہرے غور و فکر کا محتاج ہے اس کے لئے ضرورت ہے کہ وسیع پیمانہ پر تصنیف و تالیف اور علوم کی تدوین جدید کا کام شروع کیا جائے' اس کام کے سربراہ کار عصری علوم سے اتنی واقفیت اور گہری بصیرت رکھتے ہوں جو تحقیق و تنقید کے درجہ تک پہونچی ہو'

اوراس کے ساتھ اسلام کے اصلی سرچشموں سے پورے طور پر سیراب اور اسلامی رُوح سے ان کا قلب ونظر معمور ہو' یہ وہ مہم ہے جس کی تکمیل کسی جماعت یا انجمن کے لئے مشکل ہوگی' یہ اسلامی حکومتوں کا کام ہے' اس مقصد کے لئے اس کو منظم جماعتیں اور مکمل ادارے قائم کرنے ہوں گے اور ایسے ماہرین فن کا انتخاب کرنا ہوگا جو ہر فن میں دست گاہ رکھتے ہوں' وہ ایسا نصاب تعلیم تیار کریں جو ایک طرف کتاب سنت کے محکمات اور دین کے ناقابل تبدیل حقائق پر مشتمل ہو اور دوسری طرف مفید عصری علوم اور تجزیہ وتحلیل پر حاوی ہو وہ مسلمان نوجوانوں کے لئے علوم عصریہ کی ازسرِ نو تدوین کریں جو اسلام کے اُصولوں اور اسلام کی رُوح کی بنیاد پر ہو' اس میں ہر ایسی چیز ہو جو نوخیز طبقہ کے لئے ضروری ہو اور جس سے وہ اپنی زندگی کی تنظیم کر سکے اور اپنی سالمیت کی حفاظت کر سکے وہ مغرب سے مستغنی ہو اور مادی ودماغی جنگ میں اس کے مقابلہ میں آسکے' اپنی زمین کے خزانوں سے فائدہ اٹھائے اور اپنے ملک کی دولتوں کو استعمال میں لائے' اسلامی ملکوں کی مالیات کی نئی تنظیم کرے اور اس کو اسلامی تعلیمات کے ماتحت اس طرح چلائے کہ طرز حکومت اور مالیاتی امور کی تنظیم میں یورپ پر اسلامی نظام کی برتری صاف ظاہر ہو جائے اور وہ اقتصادی مشکلات حل ہو جائیں جن کے حل کرنے کے معاملہ میں یورپ سپر ڈال چکا ہے' اور اپنی بے بسی کا مُعترف ہے۔

اس روحانی' صنعتی اور فوجی تیاری اور تعلیمی آزادی کے ساتھ عالم اسلامی عُروج حاصل کر سکتا ہے' اپنا پیغام پہنچا سکتا ہے' اور دنیا کو اس تباہی سے نجات دلا سکتا ہے جو اس کے سر پر منڈلا رہی ہے' قیادت ہنسی کھیل نہیں' نہایت سنجیدہ معاملہ ہے اور منظم جدوجہد مکمل تیاری عظیم الشان قربانی اور سخت جانفشانی کی محتاج ہے۔

عالم عربی کی قیادت

عالم عربی کی اہمیت

دنیا کے سیاسی نقشہ میں عالم عربی بہت اہمیت رکھتا ہے' وہ ان قوموں کا گہوارہ ہے جنھوں نے انسانی تاریخ میں سب سے اہم پارٹ ادا کیا اس کے سینہ میں دولت وطاقت کے عظیم الشان خزانے محفوظ ہیں' اس کے پاس پٹرول ہے جو آج جنگی اور صنعتی جسم کے لئے خون کا درجہ رکھتا ہے اور یورپ و امریکہ اور مشرق بعید کے درمیان رابطہ کا کام کرتا ہے۔

وہ عالم اسلامی کا دھڑکتا ہوا دل ہے جس کی طرف روحانی اور دینی طور پر پورے عالم اسلامی کا رخ ہے جو ہر وقت اس کا دم بھرتا ہے' اور اس کی محبت و وفاداری میں سرشار رہتا ہے۔

اس کی اہمیت اس لئے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس کا امکان ہے کہ خدانخواستہ اس کو تیسری جنگ کا میدان بننا پڑے' وہاں طاقتور بازو ہیں' سوچنے سمجھنے والی عقلیں ہیں اور جنگجو جسم ہیں' وہاں بڑی بڑی تجارتی منڈیاں ہیں اور قابل کاشت زمینیں ہیں۔

مصر وہیں واقع ہے جو اپنی پیداوار' آمدنی' زرخیزی و شادابی' دولت و ترقی' تہذیب و تمدن میں خاص درجہ رکھتا ہے جس کی گود میں دریائے نیل رواں دواں ہے' یہاں فلسطین ہے اور اس کے ہمسایہ ممالک ہیں' جو اپنی آب و ہوا کی لطافت' حسن و خوبصورتی اور فوجی اہمیت میں ممتاز ہیں۔

اس کے پاس "عراق" کا ملک ہے جو اپنی بہادری، سخت جانی شجاعت عزم اور پٹرول کے ذخیروں کی وجہ سے مشہور ہے۔

یہاں جزیرۂ عرب ہے جو اپنے روحانی مرکز، دینی اثر میں سب سے منفرد ہے جس کے حج کے سالانہ اجتماع کی نظیر دنیا میں نہیں، جہاں تیل کے چشمے سب سے زیادہ تیل پیدا کرتے ہیں۔

یہ سب چیزیں ہیں جنھوں نے عالم عربی کو اہل مغرب کی نظر کا مرکز، ان کی خواہشات کی آماجگاہ، اور قیادت و لیڈرشپ کے لئے مقابلہ کا میدان بنا دیا اور جس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ ان ملکوں میں عربی قومیت اور وطن پرستی کا شدید احساس پیدا ہو گیا ہے۔

محمد رسول اللہ عالم عربی کی روح ہیں

ایک مسلمان، عالم عربی کو جس نظر سے دیکھتا ہے، اس میں اور ایک یورپین کی نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے، بلکہ خود ایک وطن پرست عرب، عالم عربی کو جس نگاہ سے دیکھتا ہے، وہ ایک مسلمان کی نگاہ سے بالکل مختلف ہے۔

مسلمان عالم عربی کو اس حیثیت سے دیکھتا ہے کہ وہ اسلام کا گہوارہ ہے، انسانیت کی پناہ گاہ ہے، عالمی قیادت کا مرکز ہے، روشنی کا مینار ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم عالم عربی کی جان، اس کے عزت و افتخار کا عنوان، اور اس کا سنگ بنیاد ہیں، اگر اس سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جدا کر دیا جائے تو اپنے تمام قوت کے ذخیروں اور دولت کے چشموں کے باوجود اس کی حیثیت ایک بے جان لاشہ اور ایک نقش بے رنگ سے زیادہ نہ ہو گی محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات ہے جن کی وجہ سے عالم عربی عالم وجود میں آیا، اس سے پہلے یہ دنیا منقسم اور منتشر اکائیوں

باہم دست وگریباں قبیلوں، غلام قوموں اور بے مصرف صلاحیتوں کا دوسرا نام تھی، اس پر جہل و گمراہی کے بادل چھائے ہوئے تھے، عرب رومی شہنشاہی سے جنگ مول لینے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے، اس کا تصور کرنا بھی ان کے لئے مشکل تھا، شام جو بعد میں عالم عربی کا بہت اہم حصہ قرار پایا ایک رومی نو آبادی تھی، جو مطلق العنان حکومت اور سخت ترین ڈکٹیٹرشپ کے رحم وکرم پر تھی، اس نے ابھی تک آزادی و انصاف کا مفہوم ہی نہیں سمجھا تھا۔

عراق کیانی حکومت کی اغراض و خواہشات کا شکار تھا، نئے نئے محاصل اور بھاری ٹیکسوں کی وجہ سے اس کی کمر جھک گئی تھی، رومی مصر کے ساتھ ایک گائے کا سا برتاؤ کرتے تھے، جس کو دوہنے اور فائدہ اٹھانے میں وہ کمی نہ کرتے لیکن چارہ دیتے وقت حق تلفی اور بخل سے کام لیتے، پھر وہاں سیاسی استبداد کے ساتھ مذہبی استبداد کا سلسلہ بھی جاری تھا، دفعتاً اس متفرق منتشر مظلوم دنیا پر اسلام کی باد بہاری کا ایک جھونکا چلا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اس وقت یہ عربی دنیا ہلاکت کے قریب تک پہونچ گئی تھی، آپ نے اس کی دستگیری فرمائی، اس کی نبضیں ڈوب رہی تھیں آپ نے اس کو زندگی بخشی، نئی روشنی عطا کی، کتاب و حکمت کی تعلیم دی تزکیہ کا سبق پڑھایا، آپ کی بعثت کے بعد اس دنیا کی نوعیت بدل گئی، اب وہ اسلام کی سفیر تھی، امن و سلامتی کی پیامبر تھی، تہذیب و تمدن کی علمبردار تھی، قوموں کے لئے رحمت کا پیغام تھی، اب ہم شام کا بھی نام لے سکتے ہیں، عراق کا بھی ذکر کر سکتے ہیں، ہم مصر پر بھی فخر کر سکتے ہیں، اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت نہ ہوتی تو آج نہ شام کا کہیں پتہ ہوتا نہ عراق کا کہیں ذکر ملتا نہ مصر کا وجود ہوتا اور عالم عربی،

عالم عربی ہی نہ ہوتا، اور یہیں تک نہیں دنیا بھی تمدن و شائستگی، علم و فن، تہذیب و ترقی کی اس سطح پر نہ ہوتی، اب اگر عرب قوموں اور حکومتوں میں کوئی دین اسلام سے مستغنی ہونا چاہتا ہے اور اپنا رخ مغرب کی طرف پھیرتا ہے یا عرب کے عہد قدیم کی طرف حریصانہ نظر ڈالتا ہے یا اپنے نظامِ زندگی اور سیاست و حکومت میں مغربی دستور اور مغربی قوانین کی پیروی کرتا ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنا قائد، امام، رہبر اور اُسوہ و معیار نہیں سمجھتا تو وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عطا کی ہوئی نعمت کو فوراً واپس کردے اور اپنے پہلے دورِ جاہلیت کی طرف واپس چلا جائے، جہاں رومیوں اور ایرانیوں کا سکّہ چلتا تھا، جہاں ظلم و استبداد کا بازار گرم تھا، جہاں سامراج کی فرمانروائی تھی، جہاں جہل و گمراہی تھی، جہاں غفلت اور بیکاری تھی، جہاں دنیا سے الگ تھلگ گمنامی کے گوشہ میں ایک مجہول زندگی گزاری جارہی تھی، اس لئے کہ یہ شان دار اور روشن تاریخ، یہ تابناک تہذیب، یہ بازار ادب، یہ عرب سلطنتیں اور حکومتیں صرف محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی مبارک بعثت کا فیض اور آپ کی آمد کا نتیجہ ہے۔

ایمان عالم عربی کی طاقت ہے

اسلام عالم عربی کی قومیت ہے، محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کے امام اور قائد ہیں، ایمان اس کی قوت کا خزانہ ہے جس کے بھروسہ پر اس نے دوسری قوموں کا مقابلہ کیا اور فتحیاب ہوا اس کی طاقت کا راز اور اس کا کارگر ہتھیار جو کل تھا وہی آج ہے جس کے ساتھ وہ دشمنوں سے جنگ کرسکتا ہے، اپنی ہستی کی حفاظت کرسکتا ہے، اور دوسروں تک اپنا پیغام پہونچا سکتا ہے۔

عالمِ عربی کو اگر کمیونزم یا یہودیت سے جنگ کرنا ہے یا کسی دوسرے دشمن کا مقابلہ کرنا ہے تو اس دولت کے بل بوتے پر جنگ نہیں کرسکتا جو برطانیہ اس کو عطا کرتا ہے یا امریکہ اس کو خیرات دیتا ہے، یا پٹرول کی قیمت کے طور پر اس کو حاصل ہوتی ہے، وہ اپنے دشمن کا مقابلہ صرف اس ایمان، معنوی قوت، اس روح اور اسپرٹ کے ساتھ کرسکتا ہے جس اسپرٹ کے ساتھ کبھی اس نے بیک وقت رومی و ایرانی حکومتوں کو جنگ کی دعوت دی تھی، اور فتح حاصل کی تھی، وہ اس دل کے ساتھ جنگ نہیں کرسکتا جس کو زندگی سے عشق اور موت سے نفرت ہو، اس جسم سے مقابلہ نہیں کرسکتا جو عیش و عشرت کا دلدادہ ہو، اس عقل کے ساتھ مقابلہ نہیں کرسکتا جس کو شک و شبہ کا گھن لگ چکا ہو، اور افکار و خواہشات باہم دست و گریباں ہوں، اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ ضعیف الایمان اور متشکک قلب اور میدان میں ساتھ چھوڑ دینے والی قوت کے ساتھ میدان جنگ کبھی نہیں جیتا جاسکتا، عرب کے قائدین اور عرب لیگ کے ذمہ داروں کے لئے سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ عربی فوج، کسانوں، تاجروں اور جمہور کے ہر طبقہ میں ایمان کی تخم ریزی کریں، ان میں جہاد کا جذبہ، جنت کا شوق اور ظاہری آرائشوں کی تحقیر و اہانت کا احساس پیدا کریں، ان کو خواہشات نفس اور زندگی کی مرغوبات پر قابو حاصل کرنے، خدا کے راستہ میں مصائب اور تکلیفیں برداشت کرنے مسکراتے چہروں کے ساتھ موت کے استقبال اور اس پر پروانوں کی طرح گرنے کا سبق دیں۔

شہسواری اور فوجی زندگی کی اہمیت

یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ عربی اقوام نے اپنی بہت سی فوجی خصوصیات کو ضائع کردیا، خاص طور پر شہسواری ان کی زندگی سے بالکل خارج ہوگئی، جو ایک

بہت بڑا نقصان اور میدان جنگ میں ہزیمت اور کمزوری کا بہت اہم سبب ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان قوموں کی فوجی اسپرٹ جوان کا طغرائے امتیاز تھی ختم ہوگئی، جسم کمزور ہوگئے، لوگ ناز و نعیم میں زندگی گزارنے لگے، موٹروں نے گھوڑوں کی جگہ لے لی اور قریب ہے کہ عربی گھوڑے جن کی دنیا میں دھوم ہے جزیرۂ عرب سے نیست و نابود ہو جائیں لوگوں نے کشتی، شہسواری، جنگی مشقوں اور دوسری جسمانی ورزشوں کو فراموش کر دیا اوران کھیلوں کو اختیار کیا جن کا کوئی فائدہ نہیں، اس لئے تعلیم و تربیت کے رہنماؤں کے لئے ضروری ہے کہ عرب نوجوانوں میں شہسواری، فوجی زندگی، سادگی، استقلال، عزیمت اور مصائب پر صبر و استقامت کی اہلیت پیدا کریں۔

امیر المومنین عمر بن الخطابؓ عجمی ممالک میں اپنے عرب عمّال کو لکھتے ہیں:۔

ایّاکم والتنعّم وزیّ العجم	تن آسانی و راحت طلبی کی زندگی
وعلیکم بالشمس فانھا	اور عجمی لباسوں سے ہمیشہ دور دور
حمام العرب وتمعددوا	رہنا دھوپ میں بیٹھنے اور چلنے کی
واخشوشنوا واخلولقوا	عادت برقرار رکھنا کہ وہ عربوں
واعطوا الرکب اسنّتھا	کا حمام ہے جفاکشی، سادہ زندگی،
وانزوا نزواً وارموا	صبر و تحمل، موٹے جھوٹے پہننے کے
الاغراض۔[1]	عادی رہو، گھوڑے پر جست لگا کر
	بے تکلف بیٹھنے کی مشق رہنی چاہیے
	نشانے درست ہوں۔

---

[1] بغوی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

ارموا بنی اسماعیل	اے اہل عرب تیر اندازی کی مشق
فان اباکم کان	رکھو اس لئے کہ تمہارے جدا مجد
رامیا۔[1]	(حضرت) اسماعیل تیر انداز تھے۔

ایک جگہ ارشاد ہے:۔

الا ان القوۃ الرمی	یاد رکھو (جس قوت کے تیار رکھنے کی
الا ان القوۃ الرمی۔[2]	قرآن مجید میں تاکید ہے) وہ تیر اندازی
	ہے، وہ تیر اندازی ہے۔

تعلیم و تربیت کے ذمہ داروں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ہر ایسی چیز کا مقابلہ کریں جو مردانگی و شجاعت کی روح کو کمزور کر رہی ہو اور عجز و تخنث پیدا کرتی ہو، عریاں صحافت نگاری فحش اور ملحد ادب کی روک تھام کریں، جو نوجوانوں میں نفاق، بے حیائی، فسق و فجور اور شہوت پرستی کی تبلیغ کر رہا ہو، ان پیشہ وروں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فوجی کیمپ میں نہ داخل ہونے دیں، جو نسل اسلامی کے قلب و اخلاق میں فساد برپا کرنا چاہتے اور فسق و معصیت اور فحش پسندی کو چند حقیر پیسوں کے لئے خوبصورت اور مزین بنا کر پیش کرتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کسی قوم میں مردانگی اور غیرت انسانی کو زوال ہوا، عورتوں نے اپنی نسائیت اور فطرتِ مادری کے خلاف بغاوت کی اور آزادی و بے حجابی کی راہ اختیار کی، ہر چیز میں مردوں کی مسابقت کی کوشش کی، خانگی زندگی سے نفرت و غفلت بڑھی اور ضبط تولید کی رغبت پیدا ہوئی، اس کا ستارۂ اقبال غروب ہوا اور رفتہ رفتہ اس کے نشانات بھی

---

[1] بخاری [2] مسلم

مٹ گئے، یونانی، رومی، اور ایرانی اقوام کا انجام یہی ہوا اور یورپ بھی آج اسی راہ پر گامزن ہے، جو اس انجام تک لے جاتی ہے عالم عربی کو ڈرنا چاہئے کہ کہیں اس کا انجام بھی ایسا نہ ہو۔

طبقاتی تفاوت اور اسراف کا مقابلہ

عربوں کو مغربی تہذیب کے اثر سے اور بہت سے دوسرے اسباب کی بنا پر عیش و عشرت، غیر ضروری لوازمِ زندگی کے شدید اہتمام، اسراف لذت و خواہش اور فخر و آرائش کے لئے فضول خرچی کی عادت پڑ چکی ہے، اس عیش و تنعم اور بیدردی کے ساتھ خرچ کے پہلو بہ پہلو فقر و فاقہ اور عریانی بھی موجود ہے جب ایک شخص بڑے بڑے عرب شہروں پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں اور سر شرم سے جھک جاتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ ایک طرف وہ آدمی ہے جس کو اپنی ضرورت سے زائد، غذا، لباس کا مصرف نظر نہیں آتا، دوسری طرف اس کی نگاہ ایسے بدوی پر پڑتی ہے جس کو ایک روز کا کھانا اور ستر پوشی کے لئے کپڑا بھی نصیب نہیں، جب عرب کے امراء و اصحابِ ثروت ہوا سے باتیں کرنے والی موٹروں پر سرگرم سفر ہوتے ہیں، اسی وقت چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے بچوں اور بچیوں کی ایک فوج سامنے آتی ہے جن کا لباس تار تار ہوتا ہے، جو ایک پیسہ کے لئے ان کی موٹروں کے ساتھ دوڑنے لگتی ہے۔

جب تک عرب ملکوں میں فلک بوس محلوں، بہترین کاروں کے ساتھ ساتھ حقیر جھونپڑیاں اور تنگ و تاریک مکانات نظر آئیں گے، جب تک تخمہ و فاقہ ایک شہر میں شباب پر ہوگا اس وقت تک کیمونزم کے لئے دروازے کھلے ہوئے ہیں، ہنگامے، جھگڑے ہونا لازمی ہیں، کوئی پروپگنڈا اور طاقت اس کو روک نہیں سکتی، وہاں اگر اسلامی نظام اپنے جمال و اعتدال کے ساتھ قائم نہیں ہوگا تو تعزیرِ خداوندی کے طور پر اور ردِ عمل کے طریقہ پر اس کی جگہ

ایک ظالم وجابر نظام کا قائم ہونا ضروری ہے۔

تجارت اور مالی نظام میں خود مختاری

عالمِ اسلامی کی طرح عالم عربی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تجارت، مالیات، صنعت وحرفت اور تعلیم میں پورے طور پر آزاد اور خود کفیل ہو، وہاں کے رہنے والے انھیں چیزوں کا استعمال کریں جو ان کی زمین کی پیداوار اور ان کی صنعت ومحنت کا نتیجہ ہوں زندگی کے ہر شعبہ میں وہ مغرب سے مستغنی ہوں اپنی تمام ضروریات، مصنوعات، غذا، لباس، ہتھیار، مشینیں آلاتِ حرب کسی چیز میں وہ غیر کے دست نگر اور مغرب کے پروردۂ رحمت اور نمک خوار نہ ہوں۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ عالم عربی اگر بعض ناگزیر حالات کی بنا پر مغرب سے جنگ کرنا چاہے تو وہ اس لئے جنگ نہیں کرسکتا کہ وہ اس کا مقروض اور اس کی امداد کا محتاج ہے، جس قلم سے وہ مغرب کے ساتھ معاہدہ پر دستخط کرتا ہے، وہ قلم بھی مغرب ہی کا بنا ہوا ہے اگر وہ مقابلہ کرتا ہے تو میدان جنگ میں اسی گولی کو استعمال کرتا ہے جو مغرب کے کارخانہ کی تیار شدہ ہے، عالم عربی کے لئے یہ ایک بڑی ٹریجڈی ہے کہ وہ اپنے دولت کے ذخیروں اور قوت کے سرچشموں سے خود فائدہ نہ اٹھا سکے، زندگی کا خون اس کو فائدہ پہونچانے کے بجائے اسی کی رگوں سے دوسروں کے جسم میں پہونچتا ہو، اس کی فوجوں کی ٹریننگ مغرب کے ایجنٹ اور فوجی افسران کے ہاتھ میں ہو اور حکومت کے دوسرے شعبے بھی انھیں کے سپرد ہوں، عالم عربی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی ضروریات کا خود کفیل ہو، تجارت ومالیات کی تنظیم، درآمد برآمد، قومی صنعت، فوج کی ٹریننگ اور مشینوں، اور آلات حرب کی تیاری پر اس کا مکمل قبضہ ہو، ایسے اشخاص کی تربیت کی جائے

جو حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں اور سرکاری فرائض پوری واقفیت فنی مہارت دیانت اور خیر خواہی کے ساتھ انجام دیں۔

انسانیت کی سعادت کے لئے عربوں کی ذاتی قربانی

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس وقت ہوئی جبکہ انسانیت کی شقاوت و بدبختی انتہائی حد کو پہونچ چکی تھی، اس وقت انسانیت کی اصلاح کا مسئلہ ان افراد کی دسترس سے باہر تھا جن کی زندگی ناز و نعمت میں بسر ہو رہی تھی اور جو محنت و مشقت کے برداشت کرنے اور مالی و جانی نقصانات کو جھیلنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، اور جن کے لئے ہمہ وقت عیش و نشاط کا سامان موجود تھا، اس وقت انسانیت کو ایسے افراد درکار تھے جو انسانیت کی خدمت میں اپنے مستقبل کو قربان کر سکتے تھے، اور منافع سے دست بردار ہو کر اپنے جان و مال عیش و آرام اور اپنے تمام دنیاوی مفاد کو خطرات و مشکلات کے مقابلہ میں پیش کر سکتے تھے، ان کو اپنے پیشہ و تجارت کی کساد بازاری اور کسی طرح کے مالی نقصان و خطرات کی پروانہ تھی، جن کو اپنے آبا و اجداد اپنے دوستوں اور قرابت مندوں کی قائم کی ہوئی اُمیدوں پر پانی پھیر دینے میں تامل نہ تھا، صالح علیہ السلام کی قوم نے جو کچھ ان سے کہا تھا وہی ان تعلق والوں کی زبان پر بھی جاری ہو جاتا۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ (ہود۔۶۲) — اے صالح! تم سے تو ہماری بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔

جب تک دنیا میں ایسے مجاہد تیار نہ ہوں اس وقت تک انسانیت کا بقا و استحکام اور کسی اہم دعوت کا کامیاب ہونا ناممکن ہے، یہ کردار رکھنے والے گنتی کے چند افراد جو دنیا کی

اصطلاح میں محروم اور کوتاہ قسمت سمجھے جاتے ہیں انھیں کی بلند ہمتی اور جذبۂ قربانی پر انسانیت کی فلاح و کامرانی اور عیش و شادمانی کا دارومدار ہے وہ چند افراد جو اپنی جان کو مصائب میں ڈال کر ہزاروں بندگانِ خدا کے ابدی مصائب سے بچنے کا سبب بنتے ہیں، اور دنیا کے ایک بڑے گروہ کو شر سے خیر کی طرف لاتے ہیں، اگر چند افراد کی محرومی و ہلاکت ایک پوری ملّت کے لئے خوشحالی اور سرفرازی کا باعث ہو اور اگر کچھ مال و زر اور تجارت و حرفت کے نقصان اور گھاٹے سے بے شمار اور لاتعداد انسانوں کے لئے دینی و دنیوی فلاح کا دروازہ کھلتا ہو تو یہ سودا ہر طرح سستا ہے۔

جب اللہ تبارک و تعالٰے نے حضرت نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو وہ یہ جانتا تھا کہ روم و فارس اور دنیا کی متمدن قومیں جن کے ہاتھ میں اس وقت عالم کی باگ ڈور ہے ہرگز اپنے عیش و نشاط کو نہیں چھوڑ سکتیں، وہ اپنی ناز پروردہ زندگی کو خطرہ میں نہیں ڈال سکتیں، وہ بے یار و مددگار انسانیت کی خدمت، دعوت و جہاد کے لئے مصائب و آلام کے برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتیں، ان کے اندر اتنی استطاعت ہرگز نہیں کہ اپنی پُر تکلف زندگی اور زیب و زینت کا ایک معمولی سا جز بھی قربان کریں، ان میں ایسے لوگ بالکل مفقود تھے جو اپنی خواہشات پر قابو رکھتے ہوں، اپنی حرص و طمع کو روک سکیں، اور جو تمدن کے لوازم اور فیشن کی پابندی سے بے نیاز ہو کر واجبی گزران پر اکتفا کر سکیں، اس لئے اللہ تعالٰے نے اسلام کے پیغام اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لئے ایسی قوم کا انتخاب فرمایا جو دعوت و جہاد کے بوجھ کو اٹھا سکتی تھی اور ایثار و قربانی کے جذبہ سے بھرپور تھی، یہ وہی عربی قوم تھی جو طاقتور، سادہ منش اور جفاکش تھی، جس پر مصنوعی تمدن کا کوئی وار کارگر نہ ہوا، اور دنیا کی رنگینیوں کا کوئی جادو

نہ چل سکا یہی لوگ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں جو دل کے غنی علم سے بھرپور اور تکلفات سے کوسوں دُور تھے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اس عظیم الشان دعوت کو لے کر اٹھے اور آپ نے جدّوجہد و جانفشانی کا حق پوری طرح ادا کر دیا، اس دعوت کو ہر اس چیز پر ترجیح دی جو آپ کے لئے رکاوٹ کا سبب بن سکتی تھی، آپ خواہشات سے بالکل کنارہ کش تھے، دنیا کی دلفریبیوں کا آپ پر کوئی جادو نہ چل سکا یہی وہ چیز تھی جو دنیا کے لئے اُسوۂ حسنہ اور رہنما بنی ــ جب قریش کے وفد نے آپ سے اس سلسلہ میں گفتگو کی اور آپ کے لئے وہ تمام چیزیں پیش کیں جو ایک نوجوان کے دل کو فریفتہ اور نفسانیت رکھنے والے انسان کو خوش کر سکتی تھیں، مثلاً حکومت و ریاست، عیش و عشرت، دولت و ثروت تو آپ نے ان تمام چیزوں کو بے تامّل ٹھکرا دیا، اسی طرح جب آپ کے چچا نے گفتگو کی اور چاہا کہ آپ کو اس دعوت کے پھیلانے اور اس میں حصّہ لینے سے روک دیں تو آپ نے صاف صاف فرما دیا کہ اے چچا خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور میرے بائیں ہاتھ میں چاند لا کر رکھ دیں جب بھی میں اس کام سے باز نہیں آسکتا اور اس وقت تک کوشش کرتا رہوں گا جب تک کہ اللہ تعالےٰ اس دعوت کو غالب نہ کر دے یا میں خود اس سلسلہ میں کام نہ آجاؤں، یہی جدّوجہد اور قربانی دنیا کی نفع اندوز ذہنیت سے بے تعلقی اور پُرمسرّت زندگی کے مقابلہ میں تکلیف و مشقت کی زندگی کی ترجیح اہل دعوت کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک نمونہ اور اُسوہ بن گیا، آپ نے اس سلسلہ میں اپنے اوپر عیش و آرام راحت و آسائش کے دروازے بند کر لئے اور خود اپنے ہی اوپر نہیں بلکہ اپنے پورے خاندان، اہلبیت اور تمام عزیزوں کو بھی عیش و عشرت کے مواقع سے مُستفید ہونے کا موقعہ نہیں دیا،

وہی لوگ جو آپ سے زیادہ قریب و عزیز تھے زندگی کے عیش و راحت میں انھیں کا حصہ سب سے کم تھا، اور جہاد و قربانی میں وہ سب سے آگے رکھے گئے تھے جب آپ کسی چیز کی حرمت کا ارادہ کرتے تو اس کی ابتدا اپنے قبیلہ اور اپنے ہی لوگوں سے کرتے اور جب کسی حق کی باری آتی یا کوئی نفع پہونچانا ہوتا تو دور کے لوگوں سے شروع کرتے اور لسا اوقات آپ کے قرابت دار اور قبیلہ والے اس سے محروم ہی رہ جاتے' آپ نے جب سودی کاروبار ختم کرنے کا ارادہ فرمایا تو سب سے پہلے اپنے چچا عباس بن عبد المطلب کے کاروبار کو مٹایا اور ان کے تمام سودی منافع کو ختم کردیا، اسی طرح جاہلیت کے انتقامات و مطالبات کو باطل کرنے اٹھے تو ربیعہ بن حارث ابن عبد المطلب کے خون کو پہلے باطل کیا، اور جب آپ نے زکوٰۃ کا قانون جاری فرمایا (جو درحقیقت ایک بہت بڑی مالی منفعت ہے' اور تا قیامت باقی رہنے والی چیز ہے) تو آپ نے اپنے قبیلہ بنی ہاشم کے لئے اس کو قیامت کے لئے حرام کردیا، فتح مکہ کے دن جب علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے آپ سے بنی ہاشم کے لئے سقایتِ زمزم کے ساتھ ساتھ خانہ کعبہ کی کلید برادری کا مطالبہ کیا تو آپ نے شدت سے انکار فرما دیا اور عثمان بن طلحہؓ کو بلا کر خانۂ کعبہ کی کنجی ان کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ اے عثمان! دیکھو یہ تمہاری کنجی ہے تم اس کو لے لو آج احسان اور وفا کا دن ہے' اور اب یہ تمہارے خاندان میں ہمیشہ رہے گی کوئی اس کو تم سے نہیں لے سکتا، اِلّا یہ کہ کوئی ظالم اس کی جرأت کرے' آپ نے ازواج مطہرات کو زہد و قناعت اور روکھی پھیکی زندگی گزارنے کی ترغیب دی اور صاف صاف فرمایا کہ اگر تم فقر و فاقہ کی زندگی گزارنے کے لئے آمادہ ہو تو میری رفاقت اختیار کر سکتی ہو ورنہ ناز و نعمت و راحت کے ساتھ تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتیں اور اس وقت آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھ کر سنایا:۔

يَا يُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ	اے نبی آپ اپنی بیویوں سے فرما دیجئے
اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا	کہ تم اگر دنیوی زندگی اور اس کی بہار
وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ	چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ متاع دیدوں
وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝	اور تم کو خوبی کے ساتھ رخصت کردوں
وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ	اور اگر تم اللہ کو چاہتی ہو اور اس کے رسول
وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ	کو اور عالم آخرت کو تو تم میں سے نیک
اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ	کرداروں کے لئے اللہ تعالیٰ نے
اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (الاحزاب ۲۸-۲۹)	اجر عظیم مہیا کر رکھا ہے۔

لیکن اس انتخاب میں آپ کے گھر والوں نے اللہ اور رسول ہی کو اختیار کیا، اسی طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جب سنا کہ آپ کے پاس کچھ غلام وخادم آئے ہیں اور جبکہ ان کے ہاتھوں میں چکی چلانے سے گھٹے پڑ گئے تھے آپ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس پہونچیں کہ یا رسول اللہ مجھے بھی ایک خادم عنایت فرما دیجئے تاکہ میں کچھ آرام حاصل کر سکوں تو آپ نے ان کو تسبیح وتحمید کی وصیت فرمائی اور کہا کہ تمہارے لئے یہ چیز خادم سے کہیں زیادہ بہتر ہے، یہی معاملہ آپ کا اپنے تمام قریبی رشتہ داروں اور عزیزوں کے ساتھ تھا اور جو جتنا ہی قریب ہوتا جاتا اسی قدر اس کی ذمہ داری بڑھتی جاتی۔

مکہ کے لوگ جب ایمان لائے تو ان کی اقتصادی زندگی کا نظام درہم برہم ہو گیا ان کی تجارت کساد بازاری کا شکار ہو گئی اور بعض اپنے راس المال سے بھی محروم ہو گئے تھے کہ جس کو انھوں نے اپنی زندگی میں جمع کیا تھا، ان میں ایسے بھی ایمان لانے والے تھے، جو راحت وآرام کے سامان اور آرائش وزینت کے اسباب بھی ختم کر چکے تھے، حالانکہ

پہلے ان کی امتیازی شان یہی تھی کہ وہ زینت و آرائش کے دلدادہ تھے، اسی طرح اس دعوت کے پھیلانے اور اس راہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے سلسلہ میں بہتوں کی تجارت برباد ہو گئی اور کتنے اپنے آبائی دولت کے حصوں سے محروم ہو گئے۔

اسی طرح جب آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی اور انصار نے آپ کا ساتھ دیا تو اس کا اثر ان کے کھیتوں، ان کے باغات پر پڑا، مگر بایں ہمہ جب انھوں نے اپنا کچھ تھوڑا سا وقت ان کی نگہداشت کے لئے چاہا تو اس کی اجازت نہیں ملی اور اللہ تعالےٰ کی جانب سے ان کو متنبہ کیا گیا، ارشاد ہوا:۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا	اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے
بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرۃ ۱۹۵)	آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

یہی حال عرب اور ان تمام لوگوں کا ہوا جو اس دعوت سے متاثر اور اس پر عمل پیرا ہوئے چنانچہ جہاد کی مشقت اور جان و مال کے خسارہ میں ان کا اتنا بڑا حصہ تھا جو دنیا کی کسی قوم کے حصہ میں نہیں آیا، اللہ تعالےٰ ان سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ	آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے
وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِیْرَتُكُمْ	بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں
وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا	اور تمہارا کنبہ، اور وہ مال جو تم نے کمائے
وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا	ہیں، اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا
وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ	تم کو اندیشہ ہو، اور وہ گھر جس کو تم پسند
اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	کرتے ہو تم کو اللہ اور اس کے رسول سے اور
وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا	اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے

حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝ (سورۃ التوبہ ـ ۲۴)

اہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ اپنا حکم بھیجدے اور اللہ تعالےٰ بے حکمی کرنیوالوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہونچاتا۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

مَا کَانَ لِاَهْلِ الْمَدِیْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ یَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا یَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ (التوبہ ـ ۱۲۰)

مدینہ کے باشندوں کو اور ان اعرابیوں کو جو اس کے اطراف میں بستے ہیں لائق نہ تھا کہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دیں اور پیچھے رہ جائیں اور نہ یہ بات لائق تھی کہ اس کی جان کی پرواہ نہ کر کے محض اپنی جانوں کی فکر میں پڑ جائیں۔

اس لئے کہ انسانی سعادت کی عمارت انھیں لوگوں کی قربانیوں کے ستونوں پر قائم ہونے والی تھی اور حالات کی تبدیلی میں صرف اسی بات کا انتظار تھا کہ یہ مہاجرین و انصار اپنے کو مٹا کر انسانیت کی سرسبزی اور قوموں کی ہدایت و فلاح کا فیصلہ حاصل کر لیں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ (البقرہ ـ ۱۵۵)

ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کچھ نہ کچھ خوف بھوک مالوں جانوں اور پھلوں کی کمی اور نقصان کے ساتھ۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝

کیا لوگ اتنا کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش

(العنکبوت ۔ ۲) نہ کی جائے گی۔

اگر عرب اس سرفرازی کو قبول کرنے سے ہچکچاتے اور انسانیت کی اس عظیم خدمت میں تردد سے کام لیتے تو بدبختی اور عالم کے فساد کی مدت اور بڑھ جاتی اور جاہلیت کی تاریکی بدستور دنیا پر چھائی رہتی، اس لئے اللہ تعالٰے نے فرمایا:۔

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ (الانفال ۷۳) اگر تم ایسا نہ کروگے تو زمین میں بڑا فتنہ پیدا ہوگا اور بڑی ہی خرابی پھیلے گی۔

چھٹی صدی عیسوی میں دنیا ایک دوراہہ پر کھڑی تھی، اس وقت دو ہی راستے تھے، یا تو عرب کے لوگ اپنے جان و مال، آل اولاد اور تمام محبوب چیزوں کو خطرہ میں ڈال کر آگے بڑھ جاتے اور دنیا کی ترغیبات سے کنارہ کش ہوکر اجتماعی مصلحت کی راہ میں اپنا سارا سرمایہ قربان کر دیتے جب دنیا کو سعادت نصیب ہوتی اور انسانیت کی قسمت بدلتی جنت کا شوق ابھرتا اور ایمان کی ہوائیں چلتیں، یا پھر وہ اپنی خواہشات و مرغوبات اور اپنی انفرادی لذت و عیش کو انسانیت کی سعادت و فلاح پر ترجیح دیتے تو ایسی صورت میں دنیا گمراہی و بدبختی کے دلدل میں پھنسی رہ جاتی اور غفلت و مدہوشی کے عالم میں پڑی رہتی، لیکن اللہ تعالٰے کو انسانیت کی بھلائی منظور تھی اس لئے عربوں میں اس نے ولولہ پیدا کیا، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے اندر ایمان و ایثار کی روح پھونک دی اور ان کو آخرت اور اس کے بے پایاں ثواب کی ترغیب دی تو انھوں نے اپنے آپ کو انسانیت پر قربان کرنے کے لئے پیش کر دیا اور اللہ کے ثواب، نوعِ انسانی کی سعادت کی امید میں انھوں نے دنیا کے تمام عیش و آرام سے آنکھیں بند کر کے اپنے جان و مال کو اللہ کے راستے میں جھونک دیا اور ان تمام چیزوں کو تج دیا جن پر لوگ حریصانہ نظریں اٹھاتے ہیں، انھوں نے پورے خلوص اور صداقت کے ساتھ

راہِ خدا میں جانیں دیں اور محنتیں کیں تو اللہ نے ان کو دنیا اور آخرت کے بہتر اجر سے نوازا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (اور اللہ محسنین سے محبت رکھتا ہے۔)

آج دنیا ہٹ ہٹا کر پھر اسی نقطہ پر پہونچ گئی ہے جس پر وہ چھٹی صدی مسیحی میں تھی، یہ عالم پھر اسی دوراہہ پر نظر آرہا ہے جس دوراہہ پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تھا، آج اس کی ضرورت ہے کہ عرب قوم (جس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے تعلق خاص ہے) میدان میں نکل آئے اور پھر دنیا کی قسمت بدلنے کے لئے جان کی بازی لگائے اور اپنی تمام آسائش و ثروت دنیا کی نعمتوں، ترقی و خوشحالی کے امکانات اور اپنے سامانِ راحت کو خطرہ میں ڈال دے، تاکہ دنیا اس مصیبت سے نجات پائے، جس میں وہ مبتلا ہے، اور زمین کا نقشہ بدل جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ عرب بدستور اپنے حقیر اغراض اور ذاتی سربلندی و ترقی، عہدہ و منصب، تنخواہوں کی بیشی، آمدنی کے اضافہ اور کاروبار کی ترقی کی فکر میں رہیں، اور سامانِ عیش اور اسبابِ راحت کی فراہمی میں مشغول رہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا اسی زہریلے تالاب میں غوطہ زن رہے گی جس میں وہ صدیوں سے ہلاک ہو رہی ہے، اگر اچھے اچھے ذہین عرب نوجوان بڑے بڑے شہروں میں خواہشات کے غلام بن کر بیٹھے رہیں، اور اگر ان کی زندگی کا محور صرف مادہ اور معدہ ہے، اس کے علاوہ ان کی کوئی اور فکر نہیں ہے، اور ان کی تمام جد و جہد صرف اپنی ذاتی زندگی اور اپنی مرفہ الحالی کے گرد چکر لگا رہی ہے تو ایسی صورتِ حال میں انسانی سعادت کا تصور بھی مشکل ہے، بعض جاہلی قوموں کے نوجوان ان سے زیادہ حوصلہ مند تھے، اور ان کا ذہن ان سے کہیں زیادہ بلند تھا جب کہ انھوں نے اپنے پسندیدہ مقاصد کی راہ میں اپنی تمام راحت و آرام اور اپنے مستقبل تک کو قربان کر دیا،

شاعر امرأ القیس ان سے کہیں زیادہ باہمت تھا کہتا ہے:۔

فلو ... لادنی معشة　　کفانی ولم اطلب قلیل من المال

ولکنما اسعی لمجد ...　　وقد یدرك المجد المؤثل امثالی

(اگر میں کسی ادنیٰ درجہ کی زندگی کے لئے کوشش کرتا ہوتا تو مجھے تھوڑا سا مال بھی کافی ہوتا اور اس کے لئے ایسی جدوجہد کی ضرورت نہ ہوتی۔

لیکن میں تو ایسی عظمت کا طالب ہوں جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور مجھ جیسے آدمی بھی ایسی عظمت کو حاصل کر لیتے ہیں۔)

دنیا کی سعادت و کامرانی کی منزل تک پہونچنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان نوجوان اپنی قربانیوں سے ایک پل تعمیر کریں، اس پل پر سے گزر کر دنیا بہتر زندگی کی منزل تک پہونچ سکتی ہے، زمین کھاد کی محتاج ہوتی ہے لیکن انسانیت کی زمین کی کھاد جس سے اسلام کی کھیتی برگ و بار لاتی ہے، وہ وہی انفرادی خواہش و ہوس ہے جس کو مسلم نوجوان اسلام کا بول بالا کرنے اور اللہ کی زمین میں امن و سلامتی پھیلانے کے لئے قربان کریں آج انسانیت کی اُفتادہ زمین کھاد مانگتی ہے، یہ کھاد راحت و آرام کے مواقع، انفرادی ترقی کے امکانات اور عیش کے اسباب ہیں جن کو مسلمان بالخصوص عرب اقوام قربان کر دینے کا ارادہ کر لیں، چند انسانی جانوں کی جدوجہد اور ان کی قربانیوں سے اگر انسانی گلہ آگ کی راہ سے نکل کر جنت کی راہ پر لگ جاتا ہے تو یہ بڑا سستا سودا ہے، اس لئے کہ جو نعمت حاصل ہوگی وہ بہت ہی جنسِ گراں مایہ ہے اور اس کے لئے جو کچھ قربان کرنا پڑے وہ اس کے مقابلہ میں بہت ہی معمولی اور ارزاں ہے ؎

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

عالم اسلامی کی توقع عالم عربی سے

عالمِ عربی اپنی خصوصیات، محلِ وقوع، اور اپنی سیاسی اہمیت کی بنا پر اسلام کی دعوت کی ذمہ داری اٹھانے کا حقدار ہے، وہ یہ کر سکتا ہے کہ عالم اسلامی کی قیادت کا بیڑہ اٹھائے اور مکمل تیاری کے بعد یورپ سے آنکھیں ملا سکے، اور اپنے ایمان، دعوت کی طاقت، اور خدا کی نصرت سے اس پر غالب آجائے اور دنیا کو شر سے خیر کی طرف، تباہی و بربادی سے امن و سلامتی کی طرف لے آئے یا جس طرح مسلمانوں کے قاصد نے یزدگرد کی مجلس میں کہا تھا:۔

"انسانوں کی پرستش سے نکال کر خدائے واحد کی پرستش میں، دنیا کی تنگی سے دین کی کشادگی میں اور مذاہب کی ناانصافی سے نکال کر اسلام کی عدل گستری میں داخل کرے!"

عالمِ انسانی عالم اسلامی کی طرف اپنے نجات دہندہ کی حیثیت سے دیکھ رہا ہے، اور عالم اسلامی عالم عربی کی طرف اپنے لیڈر اور رہبر کی حیثیت سے نظریں اٹھائے ہوئے ہے، کیا عالمِ اسلامی عالمِ انسانی کی توقع کو پورا کر سکتا ہے، اور کیا عالمِ عربی عالمِ اسلامی کے سوال کا جواب دے سکتا ہے؟ عرصہ سے مظلوم انسانیت اور برباد شدہ دنیا اقبال کے پُردرد الفاظ میں مسلمانوں سے فریاد کر رہی ہے اس کو اب بھی یقین ہے کہ جن مخلص ہاتھوں نے کعبہ کی تعمیر کی تھی وہی دنیا کی تعمیرِ نو کا فرض انجام دے سکتے ہیں ؎

ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی — دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی

اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی — صہبائے یقیں درکش و از دیرِ گماں خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

از خوابِ گراں خیز

فریاد ز افرنگ و دل آویزیِ افرنگ　　فریاد ز شیرینی و پرویزیِ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیِ افرنگ　　معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ جہاں خیز!
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز



INDEX

INSANI DUNIYA PAR MUSALMANAUN KE UROOJ-O-ZAWAL KA ASAR

اشاریہ

"اِنسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر"

گیارہواں ایڈیشن

۱۴۱۳ھ — ۱۹۹۲ء

مُرتّبہ
محمد غیاث الدین ندوی

اشخاص

قبائل وخاندان اور طبقات

کتابیات

مقامات

متفرقات

ادارے تحریکیں اور کتب خانے

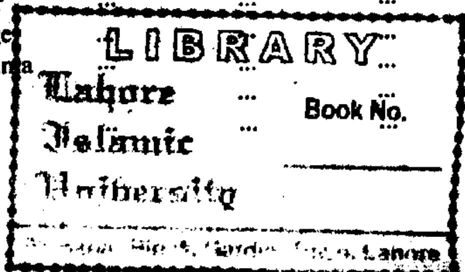
مذاہب ونظریات

سماج، تہذیب و تمدن اور معاشرہ

سلطنتیں اور ادوارِ حکومت

اہم تاریخی واقعات، حوادث اور جنگیں

دیگر متفرقات


LIBRARY
Lahore
Islamic
University
Book No.

4 ndex
(انڈیکس)

INDEX

"INSANI DUNYA PAR MUSALMANON KE UROOJ-O-ZAWAL KA ASAR"